پاکستان میں نظامِ تعلیم

کی زبوں حالی

پروفیسر (ر) ڈاکٹر محمد آفتاب خان

2022ء
تنظیم اساتذہ پاکستان
پاکستان ایگری کلچرل سائنٹسٹس فورم

جملہ حقوق ناشر محفوظ ہیں

کتاب کا نام	پاکستان میں نظامِ تعلیم کی زبوں حالی
مصنف	پروفیسر (ر) ڈاکٹر محمد آفتاب خان
ناشر	تنظیم اساتذہ پاکستان
	پاکستان ایگریکلچرل سائنٹسٹس فورم
طبع اوّل	جنوری ۲۰۲۲ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	-/450 روپے

انتساب

نژادِنو کے نام............جنہیں نام
نہاد تعلیمی نظام اپنے مقصدِ زندگی
سے روشناس نہ کرا سکا!

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ!
(علامہ اقبالؒ)

فہرست مضامین

آغازِ سخن	7
اظہارِ تشکر	14
پیش لفظ پروفیسر ڈاکٹر میاں محمد اکرم	17
حصہ اوّل	
باب اول: پاکستان میں تعلیم کی عمومی حالت/ ایک طائرانہ جائزہ	21
باب دوم: پرائمری سکول تعلیم	25
باب سوئم: سیکنڈری، ہائیر سیکنڈری تعلیم	35
باب چہارم: کالج/ یونیورسٹی ایجوکیشن	58
باب پنجم: ہائیر ایجوکیشن کمیشن	87
حصہ دوئم	
باب ششم: پاکستان میں نظام تعلیم: تاریخی پس منظر	110
باب ہفتم: نظام تعلیم ___ دورنگی کے اثرات	131
باب ہشتم: پاکستان میں نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ نو	148
باب نہم: وطنِ عزیز میں نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل: چند تصورات اور خاکے	164
باب دہم: نظامِ تعلیم کی تشکیلِ نو: چند تجاویز و آراء	181
انقلابی نظامِ تعلیم کا مختصر خاکہ	197
باب یازدہم: یکساں نظامِ تعلیم: ایک نعرہ یا حقیقت؟	211

ضمیمہ جات 237

ضمیمہ الف: نصابِ تعلیم 238

ڈاکٹر سعید احمد ملک۔ نوائے وقت نومبر ۲۰۰۸ء

ضمیمہ ب: تلخ نوائی ___ محمد اظہار الحق 240

نوائے وقت ۱۳ نومبر ۲۰۰۸ء

ضمیمہ ج: ہماری تعلیمی پالیسی۔ سلیم منصور خالد 241

نوائے وقت سنڈے میگزین مورخہ ۱۱ مارچ ۲۰۰۷ء

ضمیمہ د: مخلوط تعلیم ___ ڈاکٹر محمد آفتاب خان 248

اقتباس کتاب ''جنس اور جنسی تعلیم، اسلامی تناظر میں''

ضمیمہ ر: بچوں کی اخلاقی تربیت، کلام اقبال کی روشنی میں 253

ڈاکٹر محمد آفتاب خان و ڈاکٹر اسماء آفتاب

بشکریہ ماہنامہ دعوۃ۔ اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد

حوالہ جات:

حوالہ جات (اردو) 275

حوالہ جات (انگریزی) 280

آغازِ سخن

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے!

معلوم نہیں غالب علیہ الرحمہ نے اپنے زمانے میں یہ شعر کن حالات و واقعات سے متاثر ہو کر کہا تھا لیکن ایک باپ، دادا، نانا اور سب سے مستزاد ایک ایسے فرد کے جس نے اپنی عمر عزیز تعلیم و تعلم کی سیاحی میں گذاری، اس کے سامنے جو ''تماشہ'' تعلیم کے شعبے کے ساتھ ہو رہا ہے، وہ بازیچۂ اطفال نہیں کہ اسے ٹھنڈے پیٹ برداشت کر لیا جائے بلکہ یہ تو ''قتل اطفال'' ہے جسے دیکھ کر اکبر آلہ آبادی مرحوم بے اختیار پکار اٹھے تھے کہ

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

یہ تو مقامِ شکر ہے کہ مرحوم کو بچوں کے اس قتل کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ گبھرو جوان ہو کر سرسید کالج میں پہنچ گئے تھے۔ آج تو صورت حال یہ ہے کہ کیا ایک عامی، کیا ایک مڈل کلاس کا فرد یا متمول ترین طبقے کے افراد، ان میں سے کسی کا بھی بس نہیں چلتا کہ وہ اپنے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد ہی ''انگریزی گھٹی'' پلا دیں کہ ان کا بچہ پری سکول/ پریپ میں ہی شکسپیئر کے ڈرامے اور ملٹن کی شاعری فرفر پڑھنا شروع کر دے!

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے!

گزشتہ ستر سالوں میں تعلیمی نظام کو جس قدر بگاڑنے، مسخ کرنے اور دین و مروت سے بیگانہ کرنے کی منظم کوششیں ہوئی ہیں، ان کے پیشِ نظر آج صورتحال کچھ یوں نظر آ رہی ہے کہ جس کہہ و مہہ کا بس چلتا ہے، وہ ایک سکول، کالج حتیٰ کہ یونیورسٹی کسی کرائے کے

مکان/کوٹھی میں کھول کر بیٹھ جاتا ہے اور دھڑا دھڑ لوگوں کو لوٹنے لگ جاتا ہے اور یوں چند سالوں میں کروڑوں روپے بنا کر بستر بوریا لپیٹ کر چنپت ہو جاتا ہے یا اس ایک ''دکان'' سے مزید ''درجنوں دکانیں'' کھول لیتا ہے۔۔۔۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جو لوگ قتل اطفال کے شغل کو جاری رکھنے کی اجازت دیتے ہیں (سرکاری ادارے/ ہائیر ایجوکیشن کمیشن وغیرہ) وہ ایسے لوگوں سے نہیں پوچھتے کہ تمہارے پاس تعلیمی امور کے کھلاڑی بننے کے لئے، سوائے پیسے یا سیاسی طاقت کے، مطلوبہ معیار کی سہولتیں اور مواد ہے بھی یا نہیں؟۔۔۔۔ یار لوگ بڑے بڑے ڈاکٹروں، پروفیسروں، انجینئرز وغیرہ کو کچھ ''ماہانہ نذرانہ'' دے کر، اپنے اداروں کے اشتہارات، تعارفی لٹریچر میں ان کا نام بطور فیکلٹی لکھ دیتے ہیں جسے پڑھ کر والدین اور بچے دھوکہ کھا جاتے ہیں جب کہ سکول، کالج/ یونیورسٹی میں کام کرنے والے صرف ایک شاطر مالک یا اس کے چند چیلے چانٹے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر نام نہاد پرائیویٹ پروفیشنل کالجوں میں چند ہی افراد ہوتے ہیں جو سرجری، میڈیسن یا قانون وغیرہ سے متعلقہ مضامین کے ''ہرفن مولا'' ہوتے ہیں۔ ایسے ادارے، کسی نامی گرامی یونیورسٹی کے ساتھ اجرائے ڈگری کے لئے الحاق کر لیتے ہیں۔۔۔۔ ایسی حالت میں ان یونیورسٹیوں کو لاکھوں کے روپے کے فنڈز مل جاتے ہیں اور اس قسم کے اداروں کو اپنے طلبہ/ طالبات کو کاغذ کا پروانہ بانٹنے کے عوض لاکھوں روپے سالانہ بٹورنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔۔۔۔ جبکہ عوام الناس اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں اسقدر حساس ہو گئے ہیں کہ اندھا دھند رقم خرچ کرتے رہتے ہیں تاہم ان کے بچے (طلبہ/ طالبات) چند گھنٹوں کے لئے کالے/سفید کوٹ میں ملبوس، سٹیتھوسکوپ گلے میں ڈالے، ٹک شاپ یا ادھر ادھر بیٹھ کر خوش گپیوں میں وقت گزار لیتے ہیں۔۔۔۔ عمر کا یہ ایک ایسا دور ہوتا ہے جب سنجیدگی کے ساتھ وہ یہ سوچنا گوارا بھی نہیں کرتے کہ اپنے ماں باپ کے گاڑھے پسینے کی کمائی کے عوض وہ اپنے فن یا پیشے میں کس قدر مہارت یا علم حاصل کر رہے ہیں کیونکہ انھیں ایک کاغذ کی ڈگری کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔ مدت تعلیم ختم ہونے پر ایک جم غفیر ایسے پیشہ ور افراد کا ان اداروں سے ہر سال نکلتا ہے جو گاؤں/ دیہاتوں/قصبوں میں جا کر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔۔۔۔ حکومتی سطح

پر اہل سیاست اور سرکاری اداروں نے ان کی کھپت کیلئے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کیا ہوتا (کہ اس قسم کے کاموں کے لئے ہر دو ادارے اسے اپنا دردِ سر سمجھتے ہی نہیں کہ اس کی پلاننگ کریں)۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اب وہ خود اور والدین کسی سیاسی شخصیت/ جماعت سے رابطہ کر کے لاکھوں روپے رشوت دے کر کسی نہ کسی طریق پر چھوٹی بڑی سرکاری نوکری حاصل کر لیتے ہیں اور پھر یہ ''نوجوان'' اپنے ارمان پورا کرنے اور مزید اس رقم (Investment) کو پورا کرنے کے لئے رشوت کا دھندا شروع کر دیتے ہیں ___ اس طریق پر ہر سال ''ہزاروں ان پڑھ ڈگری ہولڈرز'' لوگوں کا ایک ریلہ ہے جو وطن عزیز میں بیکار رہ کر مختلف سماجی، تعلیمی، معاشی، سیاسی، انتظامی مسائل کا سبب بنتا ہے۔ گزشتہ ۴۰ / ۵۰ سالوں میں ''سفید کوٹ'' ''کالے کوٹ'' ''ایم ایس سی/ پی ایچ ڈی'' گونگے بہرے لوگوں کی یہ وہ حالت زار ہے جس سے کوئی بھی صاحب دل انکار نہیں کر سکتا! ___ ایسے تمام لوگوں کو نام نہاد سیاسی پارٹیوں کے سرکردہ افراد کی اشیر باد حاصل ہوتی ہے اور یوں اس طبقے کے لوگ اپنی پارٹیوں کے لئے برسرِ اقتدار پارٹی سے اقتدار چھیننے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں ___ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر کسی حیرت کا اظہار کیا جائے۔ حال ہی میں وکلا بمقابلہ ڈاکٹر کا میدانِ کارزار لاہور میں اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اور یہ کھیل کسی نہ کسی شکل میں ملک کے طول وعرض میں جاری رکھنا ایک دستور بن گیا ہے!

یہ ہیں وہ گھمبیر حالات اور مسائل جو ریٹائرمنٹ کے بیس سال بعد زیرِ نظر کتاب کے لکھنے کا محرک بنے۔ موجودہ نظام تعلیم کے فیض یافتگان (بیوروکریسی، سیاستدان، عدلیہ اور فوجی صدور/ ڈکٹیٹرز اور مفتیان) کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے کہ اربوں کھربوں روپے پیسے سے ملک و ملت کو مقروض و مفلوج کرنے والے سیاسی لوگ، بیوروکریسی اور عدلیہ میں ان کے گماشتے دندناتے پھر رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ ایک ہی کشتی میں سوار چند لوگ اس کے پیندے میں سوراخ کرنے میں مصروف ہیں تو اس کشتی میں سوار تمام لوگوں کا کیا حشر ہوگا؟

حالیہ دنوں میں وطن عزیز کے ایک بہت ہی موقر دینی، علمی اور تحقیقی رسالے ◆ میں

◆ ماہنامہ ''عالمی ترجمان القرآن'' مئی ۲۰۲۱ء

یکے بعد دیگرے ایسے مضامین شائع ہوئے ہیں جن کے مطالعے نے دل کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔اس قسم کے چندواقعات ذیل میں درج کیے جارہے ہیں۔

(۱)ایک مضمون ''سپریم کورٹ کے ذریعے مسلم کشی'' از ڈاکٹر شہزاداقبال شام ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے جو ۲۰۱۴ء میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب تصدق حسین جیلانی نے پشاور میں کسی این جی او(NGO) کی درخواست پر دیا تھا____ اس فیصلے پر جناب ڈاکٹر شہزاداقبال شام نے جوخیال افروز تبصرہ اور تنقید کی ہے، وہ ازخود پڑھنے کی چیز ہے تاہم ان کے چند جملے نقل کرنے بہت ضروری ہیں کہ اب تو عالم یہ ہو گیا ہے کہ بقول اکبرآلہ آبادی مرحوم ؎

وہ بت کافر لئے خنجر یہ کرتا ہے سوال
میرے اس دورِ ترقی میں مسلماں کون ہے؟

ڈاکٹر شہزاداقبال صاحب نے، امریکہ اور ناٹو کی سرپرستی میں دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شہید ہونے والے ۸۰ ہزار مسلمانوں کے مارے جانے،مساجدو مدارس کی تباہی اور بچوں و غازیوں کی تڑپتی لاشوں کے مقابلے میں ستمبر ۲۰۱۳ء میں ایک چرچ پر حملے درج بالا عدالتی فیصلے کے بارے میں لکھا کہ ''ایک تسلسل کے ساتھ کیا کیا فیصلے کیے گئے جن کا پاکستانی قوم کو احساس تک نہیں ہونے دیا گیا''____ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کیسی بارودی سرنگیں بچھ رہی ہیں اور اس جمہوری ملک میں ۹۶ فی صد آبادی کو معلوم ہی نہیں کہ آنے والی نسلوں کے ساتھ کیا ہونے جارہا ہے؟''

ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان ''متعدد لطائف'' کا بھی ذکر کیا جو اس اعلیٰ ترین عدالتی فیصلے میں ہوئے____ موصوف نے سینیٹ،قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے معزز ارکان اور دانشوروں سے دردمندانہ اپیل کی کہ ''براہ کرم ان بارودی سرنگوں پر نظر رکھا کریں''

(۲) ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن کے اسی شمارے میں ایک دوسرے دانشور جناب انصار عباسی صاحب نے بھی سپریم کورٹ کے اس فیصلے پر نہایت ایمان افروز تبصرہ لکھا ہے۔انہوں نے پہلی تا پانچویں جماعت کی کتب میں شامل دینی معلومات پر مبنی مواد(حمد و

نعت اور دنیا کے تین بڑے مذاہب کے پیغمبروں کے حالاتِ زندگی کو) صرف اسلامیات کی کتابوں میں مسلمان طلبہ کے لئے ہی شامل نصاب کرنے پر تنقید کی۔ اس پر ان کا تبصرہ اور نقد و جرح بہت جاندار ہے تاہم سوال یہ ہے کہ کیا سپریم کورٹ کے جج صاحبان کو یہ حقیقت بتانے کی ضرورت بھی اب پیش آئے گی کہ جناب ان سکولوں میں ''مسلمان'' بچے ہی پڑھتے ہیں۔ آٹے میں نمک سے بھی کم تعداد میں اقلیتی بچوں کے لئے اس قدر بڑی قربانی دینے کی بات نہیں بلکہ یہ ایک ایسی جسارت ہے جس پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے کی اہم ترین ضرورت ہے!

(۳) اسی تسلسل میں ڈاکٹر حسین احمد پراچہ صاحب کا بھی ایک مضمون ''قومی نصاب پر سیکولر حملہ اور سپریم کورٹ'' کے موضوع پر اسی ماہنامہ میں شائع ہوا ہے ___ موصوف کو تعلیم و تعلم کے ساتھ جو تعلق خاطر خاندانی طور پر حاصل ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ انہوں نے بھی اپنی حیرت کا اظہار بدیں الفاظ کیا ہے کہ ''ہمارے ہاں بھی بہت عجیب معاملہ ہے۔ یہاں کوئی شخص بھی محض اپنے ذاتی ذوق کی تسکین کے لئے طے شدہ آئینی اور قومی امور پر نکتۂ اعتراض اٹھا دیتا ہے اور عدالت جا پہنچتا ہے''! ___ ڈاکٹر پراچہ نے بہت خوب کہا کہ

''حقیقت حال یہ ہے کہ یہ مسئلہ غیر مسلم اقلیت کا ہے ہی نہیں، بلکہ مٹھی بھر سیکولر حضرات اور مراعات یافتہ اقلیت کا ہے جو اپنے بچوں کو قومی نصاب نہیں بلکہ غیر ملکی نصاب پڑھانا چاہتے ہیں تاکہ گزشتہ عشروں کی طرح ان کے بچوں کی امتیازی شان اور پہچان الگ رہے''!

ایک تسلسل کے ساتھ طے شدہ امور کو مختلف افراد اور اداروں کی جانب سے اٹھایا جانا اور اس پر ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ جیسے اعلیٰ ترین اداروں کا نہ صرف یہ کہ انھیں سننے کے لیے منظور کرنا بلکہ اس دستور کے خلاف، (جس کے تحت انہوں نے اس موقر عہدے کا حلف اٹھایا تھا اور جس کے لئے ملک و ملت کو اربوں روپے سالانہ خرچ کرنے پڑ رہے ہیں) فیصلہ دینا ایک ایسا طرفہ تماشہ ہے جن پر امت مسلمہ کے ذہین اور صاحبان علم و فضل کا بیک زبان اور بیک وقت صدائے احتجاج بلند کرنا گویا اس امر کی محکم دلیل ہے کہ **''اس دور کے**

عادل'' سے کوئی بھول ہوئی ہے!___ اور یہ بھول ایک عام فرد کی نہیں بلکہ اس کے ذمہ دارانہ خود وہ صاحبانِ عدل و انصاف ہیں جن کی نظروں کے سامنے ان کے (اور ان جیسے دوسرے عادل و منصف جج صاحبان) کے فیصلوں کو جل دے کر اربوں/ کھربوں کا غاصب شخص ملک سے باہر چلا جاتا ہے اور وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کا مصداق بنے رہتے ہیں___ یہ سلسلہ آخر کب تک چلے گا؟

ے دنیا ہے تری منتظر اے روزِ مکافات!

اس تناظر میں وطن عزیز میں نظام تعلیم کی ''طرحِ نو'' کا کھیل کھیلا جا رہا ہے، ہم نے ایک بزرگ شہری کی حیثیت سے ان حالات کا ایک معروضی جائزہ لیا ہے۔ دیکھئے قرآن کریم کی آیت ہم سے کیا سوال کر رہی ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں ہو۔''

ہے کوئی رجل رشید جو اس سوال پر غور کرے؟

اس کتاب کے مندرجات میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ نظامِ تعلیم کا ڈھانچہ اور اس کی تفصیلات سیکرٹریٹ میں بیٹھے کلرک صاحبان (بشمول بیوروکریٹس) کے بس کا روگ نہیں۔ یہ کام صرف وہ لوگ ہی سرانجام دے سکتے ہیں جن کی اپنی تمام عمر اس دشت کی سیاحی میں گزری ہے___ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ کام صرف انھی کو سونپا جائے اور ان کی ''سربراہی'' میں سرکاری ملازمین (کلرک تا سیکرٹری حتیٰ کہ چیف سیکرٹری تک) ان سفارشات کو من و عن لاگو کرنے کے ذمہ دار ہوں، اور اس کام کی سرانجام دہی میں کسی بھی سرکاری ملازم کی غفلت، کوتاہی یا ذاتی خیالات کو دخل اندازی کرنے کی جرأت نہ ہو۔ دوسری جانب تمام ملک میں متدین اور تعلیمی شعبے سے متعلق (جن کی ایک معتد بہ تعداد کے خیالات اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں) کا یہ بھی یہ فرض ہے کہ وہ وطن عزیز کو الحادی

تعلیم کے ستر سالہ اثراتِ بد سے بچانے کے لئے اکٹھے بیٹھ کر ایک متفقہ لائحہ عمل پیش کریں۔ رائے عامہ کو بیدار کریں اور میڈیا کے تمام تر ذرائع سے اس قدر بہ تکرار وضاحت کی جائے کہ بالآخر حکومت وقت کو اسے نافذ کرنا پڑے ___ اس ضمن میں ہر قسم کے ذاتی خیالات، فقہی یا گروہی مفاد کو پیش نظر نہ رکھا جائے۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
(علامہ اقبالؒ)

اظہار تشکر

یہ کتاب تعلیم اور تحقیق کے شعبوں میں کام کرنے والی دو تنظیموں کی مشترکہ اشاعت ہے۔ تنظیم اساتذہ پاکستان عرصہ پچاس سال سے تعلیم کے میدان میں کام کر رہی ہے۔ اس تنظیم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پرائمری سطح سے لے کر یونیورسٹی سطح تک کے تمام اساتذہ کرام، بلا کسی تخصیص اور تفریق ڈگری، عہدہ، یکساں طور پر ممبر ہیں اور طے شدہ پروگرام اور مدت کے بعد الیکشن کے ذریعے عہدیداروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ نیز اس کی ممبر شپ پاکستان کے تمام صوبوں کے نہ صرف شہروں بلکہ قصبوں، دیہات کے تعلیمی اداروں تک پھیلی ہوئی ہے۔ نیز یہ وہ واحد تنظیم ہے جو ایک طویل عرصہ سے ایک علمی، ادبی اور تعلیمی ماہنامہ ''افکار معلم'' کے نام سے شائع کر رہی ہے۔ نیز اس تنظیم نے متعدد موضوعات پر مختلف کتب بھی شائع کی ہیں۔

اسی طرح پاکستان ایگریکلچرل سائنٹسٹس فورم (پاس فورم) ایک دوسری تنظیم ہے جو عرصہ نصف صدی سے زرعی شعبے کے تعلیمی اور تحقیق اداروں کے اصحابِ علم وفضل پر مشتمل تنظیم ہے۔ پاکستان میں گندم کی زیادہ پیداوار کی ملکی قسم (SA-42) کے موجد ڈاکٹر سردار محمد قریشی تھے۔ انھیں اس وجہ سے پاکستان کا بورلاگ (میکسیکو کے ایک سائنس دان کا نام جس نے گندم کی اقسام کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کا کام کیا اور نوبل پرائز ملا) کہتے ہیں، وہ بھی پاس فورم کے ارکان میں شامل تھے۔

اس تنظیم کے تحت عرصہ اکتیس سال (1990ء) سے ایک تحقیقی مجلہ جرنل آف اینمل اینڈ پلانٹ سائنسز (JAPS) کے نام سے شائع ہو رہا ہے جس میں نہ صرف پاکستان کے زرعی سائنس دانوں اور اساتذہ کے تحقیقی مقالہ جات شائع ہوتے ہیں بلکہ بیرونی ممالک (عرب، افریقہ اور یورپ) کے بھی زرعی سائنس دان/محققین اپنے مقالہ جات شائع

ہونے کے لئے بھیج رہے ہیں۔اس جرنل کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ سال میں اس کی چھ اشاعتیں (یعنی ہر دو ماہ بعد ایک تسلسل سے شائع ہو رہی ہیں)۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن کی جانب سے اسے اعلیٰ ترین کیٹگری میں شامل ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے جو شاید پاکستان میں ایک یا دو جرنل کو ہی حاصل ہے۔نیز بین الاقوامی سطح پر بھی اس جرنل کو پذیرائی حاصل ہے جس کی وجہ سے اس کی مختلف تحقیقی رسالوں میں (Abstraction) بھی ہوتی ہے! جو اس کے اعلیٰ معیار کا ایک بہت ہی واضح ثبوت ہے۔

اس رسالے کی ۳۰ سالہ تقریبات بھی اسی سال منعقد ہوئی ہیں۔اس موقعہ پر فیصلہ کیا گیا کہ وطن عزیز میں زرعی تعلیم اداروں (کالجز/ یونیورسٹیوں) کے طلبہ کے لئے پاکستانی مواد اور حالات کے تحت کتب شائع کی جاتیں۔اس کتاب میں ہم نے پاکستان کے تعلیمی نظام کی زبوں حالی کے بارے میں جو کچھ دیکھا اور مشاہدہ کیا اسے بیان کر دیا ہے۔

شنیدم آنچہ از پاکانِ امت
ترا بہ شوخئ رندانہ گفتم

مقصود کسی فرد/ ادارے کی دل آزاری نہیں بلکہ اصلاحِ احوال ہے___ آج ملت اسلامیہ پاکستان جن نامساعد حالات سے گزر رہی ہے، اگر تعلیم یافتہ طبقے نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات کی پیروی نہ کی تو خدانخواستہ اس مملکت خداداد کا وجود ہی خطرے میں نہ پڑ جائے۔

ذاتی طور پر میں ہر دو تنظیموں کی قیادت کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس موضوع پر کتاب کی اشاعت کے لئے تعاون واشتراک کیا۔خدا کرے کہ یہ حرفِ چند، امت مسلمہ کے لئے نافع ثابت ہوں

نہ ہو تو مید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مرد مومن ہے، خدا کے راز دانوں میں

کتاب کی تیاری میں متعدد اہل علم کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔جس کے لیے ہم ان سب حضرات نیز پبلشرز کے شکر گزار ہیں۔کتاب کا سرورق آفاق نامی تنظیم کے

کارکنان اوران کے صاحب علم ناظم اعلیٰ جناب شاہد وارثی کی شفقت اور علم دوستی کا مظہر ہے۔ نیز پروف ریڈنگ میں نصیر اعوان صاحب اور ہماری دو بہنوں نے جو خدمت سرانجام دی ہے۔ اس کے لیے ہم ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اشعار کی تصحیح کا کام ہمارے بہت ہی مہربان اور علم دوست تین احباب نے سرانجام دیا جس میں سرفہرست جناب عبدالستار نعیم (ڈین رفاہ یونیورسٹی فیصل آباد کیمپس) انجینئر عنایت علی لاہور اور ادریس کھوکھر ایڈووکیٹ نارووال ہیں۔ جن کے لیے جذباتِ تشکر اور رب العزت سے دین و دنیا کی بھلائیوں کی دعا۔ کتاب کا پیش لفظ جناب پروفسر ڈاکٹر میاں محمد اکرم صاحب (ڈائریکٹر ادارہ تعلیم و تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان) نے لکھا ہے جو ازخود ایک گراں قدر مقالے سے کم نہیں اللہ تعالیٰ جزائے خیر سے نوازیں۔

راولپنڈی　　　　　پروفیسر (ر) ڈاکٹر محمد آفتاب خان

جنوری ۲۰۲۲ء

پیش لفظ

پاکستان کا قیام اسلامیان ہند کے لیے اللہ کی طرف سے ایک نعمت غیر مترقبہ کی صورت میں عمل میں آیا۔قرارداد پاکستان کے اعلان کے چند سال بعد یہ ملک معرض وجود میں آ گیا۔اس مملکت خداداد کے قیام کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے بھر پور جدوجہد کی۔بے شمار جانی و مالی اور عصمتوں کی قربانیاں دی گئیں۔قیام پاکستان کے بعد ایک طرف تو سرکاری وغیر سرکاری طور پر لوگوں کی قربانی کی داستانیں ہیں اور دوسری طرف اثاثوں کی لوٹ مار اور وسائل پر قبضہ کرنے کے قصے۔

اگر نوزائیدہ ملک میں تعلیم کی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی شرح خواندگی صرف گیارہ فی صد تھی۔جو ۱۹۵۱ء میں ہونے والی مردم شماری کے مطابق چودہ فیصد ہوگئی۔اس کا مطلب ہے کہ شرح خواندگی میں سالانہ تقریباً ایک فی صد اضافہ ریکارڈ ہوا۔اگر یہی شرح برقرار رہتی تو ۴۷ سالوں میں پاکستان کی شرح خواندگی ۸۸ فی صد ہو جانی چاہیے تھی۔لیکن ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق یہ شرح صرف ۴۳.۹۲ فی صد تک پہنچ پائی۔یعنی ۵۱ سالوں میں صرف ۳۳ فیصد اضافہ ہوا۔اب سال ۲۰۲۱ء میں ہماری شرح خواندگی صرف ساٹھ فی صد تک پہنچ پائی ہے۔یعنی ۲۴ سالوں میں صرف سولہ فی صد اضافہ (پاکستان کا معاشی جائزہ ۲۱-۲۰۲۰ء) ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کے تقریباً اڑھائی کروڑ بچے اب بھی ایسے ہیں جنھوں نے سکول کا منہ تک نہیں دیکھا۔

شعبہ تعلیم کیلئے ہماری سنجیدگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تعلیم پر اخراجات کے حوالے سے اقوام متحدہ کے تجویز کردہ خام قومی پیداوار (GDP) کے ۴ فی صد کے مقابلہ میں ہم ابھی تک ۲.۳ فی صد سے آگے نہیں بڑھ سکے۔بلکہ ۲۰-۲۰۱۹ء میں تو تعلیم پر خرچ ۲۹.۶ فی صد کم ہو کر ۱.۵ فی صد رہ گیا۔(Dawn News11/6/21)۔

پاکستان میں تعلیم پر مجموعی اخراجات ۸۶۸ ارب روپے سے کم ہوکر ۶۱۱ ارب رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ کورونا یا کووڈ۔۱۹ کہی جاسکتی ہے۔لیکن یہ کیفیت تعلیم کے بارے میں ہمارے مجموعی رویہ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

جہاں تک معیار تعلیم (کوالٹی ایجوکیشن) کا تعلق ہے وہ روز بروز گرتا جارہا ہے۔ ہمارے طالب علم ۱۱۰۰ / ۱۱۰۰ نمبر تو لے رہے ہیں لیکن ان سے اگر کوئی سوال پوچھ لیا جائے تو اکثریت اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ ٹیوشن سسٹم ،رٹہ بازی ،نقل اور نمبر لگوانے کی دوڑ جاری ہے۔ یوں معیار تعلیم دن بدن پست ہوتا جارہا ہے۔ثانوی سطح اور اس کے بعد کی کلاسوں سے نکلے ہوئے طالب علم جامعات کی سطح پر کوئی قابل قدر کارکردگی دکھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

ریسرچ کے میدان میں ہم انتہائی پستی کا شکار ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ ہمارے تحقیقی مقالوں کا معیار بہت ہی پست ہے۔اس تحقیق سے ہماری صنعتوں اور زراعت کے شعبوں کی رہنمائی ہونی چاہیے تھی،لیکن اس کا فقدان نظر آتا ہے۔

تعلیم کا ایک مقصد جہاں علم اور معلومات کی اگلی نسل تک منتقلی ہے۔اسی تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں اور طالب علموں کی دینی رہنمائی اور اخلاقی تربیت بھی ہے۔لیکن ہمارے نظام تعلیم میں سب سے پہلے تربیت کا عنصر رخصت ہونا شروع ہوا۔نسل نو کی اسلامی خطوط سے تربیت (ان کو اللہ کی زمین پر اللہ کا بندہ اور خلیفہ بن کر زندگی گذارنے کا سلیقہ سکھانا) ماضی میں ہمارے نظام کا حصہ رہا۔اس کے نتیجے میں تعلیم جہاں انسان کو ہنر منداور تعلیم یافتہ بناتی تھی ، وہیں نسل نو کو اپنی معاشرتی روایات اور تہذیبی وتمدنی ذمہ داریوں سے بھی بہرہ مند کرتی تھی۔لیکن اب تو تعلیم صرف نمبر لینے کا نام رہ گئی ہے اور یہی مقابلہ کا میدان ہے،ہم نے بچوں کے اذہان میں صرف ایک بات ڈالی ہے اور وہ یہ کہ آپ نے پوزیشن لینی ہے ،ہمارا اخلاق، ہمارا کردار، ہمارا اپنے رب اور رسول ﷺ سے تعلق یہ سب باتیں ہوا ہوتی گئیں۔اسلامی نظام تعلیم آہستہ آہستہ قصہ پارینہ ہوتا جارہا ہے۔ ہماری تعلیمی پالیسیوں کی تشکیل اغیار کے ہاتھوں میں ہے۔ان لوگوں کو نہ تو ہمارے دینی تقاضوں کا علم ہے اور نہ ہی

ہمارے معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی معاملات کا ادراک ہے۔ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جو پالیسیاں اور تجاویز ہمارے نظام تعلیم کے حوالے سے مرتب کریں گے، وہ ہمارے لیے فائدہ مند کیسے ہوسکتی ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر محمد آفتاب خان ایک لمبی مدت تک جامعہ زرعیہ فیصل آباد میں تشنگان علم و ہنر کے اذہان کی آبیاری کرتے رہے ہیں۔ وہ ایک دردمند انسان ہیں جو کہ اپنے دل میں قوم، ملک اور ملت کا درد رکھتے ہیں اور امت کے مسائل کا حل بھی چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس فکر اور پریشانی کو قرطاس کی زینت بنایا ہے اور ''پاکستان کے نظام تعلیم کی زبوں حالی'' کے عنوان سے کتاب کو منصۂ شہود پر لائے ہیں۔اس کتاب میں انھوں نے پاکستان میں پرائمری، ثانوی اور کالج وجامعہ کی سطح کی تعلیم کا عمومی جائزہ لیا ہے۔

پاکستان کے نظام تعلیم میں پائی جانے والی دورنگی کا تجزیہ کرتے ہوئے پاکستان کے نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کے حوالے سے نظری بحثوں کے علاوہ اس کے عملی پہلوؤں کو بھی خاکوں کی صورت میں اجاگر کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یکساں نظام تعلیم کے تصور اور عملی نفاذ کے حوالے سے بھی اپنی تجاویز کو رقم طراز کیا ہے۔اگر ارباب حل وعقد اس کا مطالعہ کریں اور پیش کی گئی تجاویز پر عمل کریں تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہم پاکستان کے نظام تعلیم کی بہتری کے لیے کچھ اقدامات کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔اس کے نتیجے میں ہم وطن عزیز کو نئی سربلندیوں اور اخلاقی ترفع اور دینی تقاضوں کے مطابق آگے بڑھانے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر میاں محمد اکرم
سابق صدر تنظیم اساتذہ پاکستان
ڈائریکٹر جنرل ادارہ تعلیمی وتحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان

حصہ اوّل

پاکستان میں نظامِ تعلیم کی زبوں حالی

باب اوّل

پاکستان میں تعلیم کی عمومی حالت: ایک طائرانہ جائزہ

اقوام عالم کی تعمیر وترقی میں تعلیم اور تحقیق کا جو کردار ہے، وہ محتاج بیاں نہیں۔گزشتہ صدی میں جن اقوام نے ترقی کی منازل تیزی کے ساتھ طے کی ہیں، ان میں چین، جاپان اور جرمنی کے علاوہ سنگاپور اور ملائیشیا سرفہرست ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی تباکاریوں سے جس طریق پر جاپان اور جرمنی دو چار ہوئے تاہم انھوں نے جس تیزی کے ساتھ ان تباہ کاریوں کا مداوا کیا، ان کی داد نہ دینا انصاف کا تقاضا نہیں۔آج کا جاپان، امریکہ جیسی سپر پاور کے لیے آٹو موبائل اور دیگر اس قسم کی صنعتوں کے معاملے میں، دردسر بنا ہوا ہے۔اسی طرح جرمنی نے بھی جنگ عظیم کے بعد قلیل ترین مدت میں اپنی معیشت کو سنبھال لیا، وہ تعلیم کے اعلیٰ انتظام کی وجہ سے ہی ممکن ہوا۔قریباً یہی حال سنگاپور اور ملائیشیا کا ہے جنھوں نے گزشتہ ۴، ۵ دہائیوں میں جو ترقی کی ہے اور جس طریق پر وہاں کی سیاسی قیادت نے اپنے غریب اور مفلوک الحال عوام کی قسمت کو بدل کر رکھ دیا، وہ سب کچھ تعلیمی اور تحقیقی میدان میں ترقی کی بنا پر واقعہ ہوا۔

اب ذرا وطن عزیز کی حالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے۔ ۱۹۴۷ء میں دنیا کے جغرافیہ پر ایک نیا ملک منصۂ شہود پر آیا۔اس کی بنیادوں میں لاکھوں انسانوں کا خون شامل ہوا۔ کروڑوں لوگوں نے ہجرت کی، وہ نہ صرف اپنے آباء واجداد کی نشانیوں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئے بلکہ کھربوں روپے کی جائداد اور مال ودولت کا نقصان بھی اٹھایا۔لیکن آہستہ آہستہ وطن عزیز کے قیام کے تھوڑے عرصے بعد ہی بحالی اور ترقی کے زینے پر قدم

رکھ دیئے۔ ہماری مایہ ناز ایئر لائین کے ماہرین نے متعدد مسلم ممالک کی ائیر لائنوں کے پائلٹوں کو تربیت دی اوران ممالک کے ہوائی سفر کے نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے میں مدد دی کہ آج وہ ائیر لائنیں دنیا کی اعلیٰ ترین شمار کی جاتی ہیں۔ تاہم آج اپنی ایئر لائن کا یہ حال ہے کہ اربوں روپے کے خسارے سے دوچار ہے!

یہی حال تعلیمی نظام کا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء تک، دنیا کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں طلبہ (لڑکے اور لڑکیاں) پاکستان کی مختلف جامعات میں حصولِ تعلیم کے لیے آتے رہے۔ اور یہاں سے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوکر اپنے ملکوں میں اعلیٰ مناصب پر خدمات سر انجام دیتے رہے اور پاکستان کے سفیر کا بھی کردار ادا کرتے رہے۔ ایک وقت تھا کہ مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی لائلپور (حال فیصل آباد) میں ہزاروں غیر ملکی طلبہ/ طالبات حصول علم کے لیے آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہاں انھیں تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ ارزاں اخراجات میں (مناسب تعلیم اور دیگر سہولیات) کی بنا پر تعلیم کا حصول بھی آسان تھا___ یہ وہ دور تھا جبکہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں ایسے ایسے نابغۂ روزگار وائس چانسلر اور اساتذہ ہوتے تھے جن کی مثال اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ رفتہ رفتہ ''نام نہاد امریکن ماہرین تعلیم'' اور ''غلامانہ ذہنیت کی بیوروکریسی'' اور ان کے ''نالائق شاگرد سیاست دانوں'' نے اصلاحات نافذ کرنا شروع کیں۔ بیرونِ ملک سے آنے والے طلبہ کے لیے تعلیمی اخراجات (فیس وغیرہ) اس قدر زیادہ کر دیے گئے کہ انھوں نے اتنے اخراجات کے ساتھ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں جانا پسند کیا___ یاد رہے کہ یہ صورت حال صرف زرعی یونیورسٹی فیصل آباد (راقم نے عمر عزیز کے چونتیس (۳۴) سال اس یونیورسٹی میں گزارے (۹،۱۰ سال بطور طالب علم اور ربع صدی بطور فیکلٹی)! تک ہی محدود نہ تھی بلکہ پاکستان کی دوسری یونیورسٹیوں (پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی وغیرہ) میں بھی ایسا ہی ہوا کہ رفتہ رفتہ طلبہ کی تعداد کم ہوتی چلی گئی اور وطن عزیز ان تمام ممالک (بالخصوص اسلامی ممالک) سے دور ہوتا چلا گیا جس سے نہ صرف خیر سگالی کے جذبات ہی ماند پڑ گئے بلکہ ملک زرمبادلہ سے بھی محروم ہوگیا! اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ امریکن اور یورپین یونیورسٹیوں کو پڑھانے کے

لئے کثیر تعداد میں طلبہ مل گئے جنھوں نے ان طلبہ کی یوں برین واشنگ کی کہ آج وہ ممالک اغیار کے قدر شناس ہیں اور ملت اسلامیہ کا تصور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے ــــــ ہماری بیوروکریسی اور ''ان پڑھ سیاست دان'' اس امر کا اندازہ ہی نہ لگا سکے کہ امریکن گورا ہمارے ساتھ کیا داؤ کھیل گیا!

اس ضمن میں ایک اور پہلو جس کی جانب موجودہ حکومت اور تعلیمی شعبہ سے تعلق رکھنے والے حضرات کی توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ اس تمام دور میں (جو قریباً نصف صدی پر محیط ہے) ان یونیورسٹیوں میں وائس چانسلر اور پروفیسرز جس علمی مرتبے کے ہوتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ڈاکٹر اشتیاق حسین (کراچی یونیوسٹی) میاں افضل حسین (پنجاب یونیورسٹی) اور ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی (مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی لائلپور) نیز ڈاکٹر عمر حیات ملک (پشاور یونیورسٹی) جیسے نابغۂ روزگار اور باکردار اشخاص اس منصب پر لگائے جاتے تھے۔ مزید برآں انھیں تعینات کرنے والے لوگ بھی بطور گورنر/ چانسلر سردار عبدالرب نشتر اور اس کردار کے لوگ ہوا کرتے تھے ــــ موجودہ زمانے میں نسلِ نو کے لیے یہ امر ایک انکشاف سے کم نہ ہوگا کہ ڈاکٹر عمر حیات ملک، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور نے سنڈیکٹ، سینٹ یا سلیکشن کمیٹی کے لیے ایک تجویز چانسلر صوبہ (گورنر) سردار عبدالرب نشتر (مرحوم) کو بھیجی۔ چانسلر صاحب نے اس میں ایک ممبر کی جگہ کسی دوسرے شخص کو ڈال دیا۔ ڈاکٹر عمر حیات صاحب نے اس دن اپنے ایک پروفیسر (ڈاکٹر محمد باقر) جو شعبہ فارسی کے ہیڈ تھے، سے کہا کہ آج شام آپ مجھے اپنی کار پر گورنر ہاؤس لے کر جائیں گے۔ گورنر ہاؤس پہنچ کو انھوں نے اپنا استعفیٰ گورنر صاحب کو پیش کر دیا۔ انھوں نے ملک صاحب سے استفسار کیا کہ کیا یہ میرا استحقاق نہیں کہ آپ کی تجویز میں کوئی ردوبدل کر سکوں؟ ملک صاحب نے بصد احترام جواب دیا کہ ایسا ہی ہے جناب لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ امر میری ذات پر آپ کی جانب سے عدم اعتماد کا عندیہ بھی ہے اور میں اس حالت میں بطور وائس چانسلر خدمت سرانجام دینے سے قاصر ہوں! آج کے کوئی گورنر ہوتے تو انھیں قید کر دیتے لیکن مزید حیرت انگیز یہ امر کہ ملک صاحب جب

اپنے گھر واپس آئے تو معلوم ہوا کہ وزیر اعظم ہاؤس کراچی سے ٹیلی فون پر تاکید کی گئی ہے کہ جب ملک صاحب واپس آئیں تو رابطہ کریں۔ ملک صاحب نے رابطہ کیا تو لیاقت علی خان (وزیر اعظم پاکستان) نے کہا کہ مجھے سردار عبدالرب نشتر نے تمام ماجرا بتا دیا ہے۔ تاہم ہم آپ جیسے شخص کو ضائع نہیں کرنا چاہتے آپ فوری طور پر کراچی آ کر کسی ملک میں سفارت کاری کی اسناد حاصل کریں۔

یہاں اس امر کی جانب اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ استعفیٰ دینے کے لیے گورنر ہاؤس تک جانے کے لیے انھوں نے سرکاری گاڑی کا استعمال بھی مناسب نہ جانا اور ایک دوست کی گاڑی استعمال کی ـــــ ماضی قریب میں حکمرانوں کے شاہانہ طرزِ عمل کی موجودگی میں کیا ایسی مثال اب ڈھونڈے سے بھی مل سکتی ہے؟ ـــــ ادھر ماضی قریب میں کھرا اور اسی قماش کے بدکردار لوگ چانسلر اور وائس چانسلر بنے ـــــ جس کی انتہا یہ کہ ایک بدنام زمانہ وزیر داخلہ کو کراچی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری دلائی گئی۔ کاش کوئی شخص بھی اس کے خلاف آواز اٹھاتا تو کراچی یونیورسٹی کی اعلیٰ وارفع روایات کی یوں برسرِ عام دھجیاں نہ بکھرتیں!

اس کتاب میں ہم نے تعلیمی نظام کے بارے میں چند ایسے بنیادی امور پر قلم اٹھایا ہے جو بطور ایک یونیورسٹی ٹیچر اور ایک باپ/ دادا/ نانا کے پچاس سالہ مشاہدات پر مبنی ہیں۔ ملک وملت اسلامیہ کے لئے جن مخلصانہ جذبات سے یہ چند سطور قلم بند کی گئی ہیں، ضروری ہے کہ ان پر اسی جذبۂ ملی کے ساتھ غور کیا جائے

آج ہم اپنی پریشانئ خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھئے کیا کہتے ہیں؟

بابِ دوم:

پرائمری سکول تعلیم

گزشتہ صفحات میں درج چند ابتدائی معروضات کے بعد اب ہم تعلیمی نظام کی جانب آتے ہیں اور اس کا آغاز پرائمری اسکول کی تعلیم سے کرتے ہیں کہ خشتِ اوّل تو یہاں پر ہی رکھی جاتی ہے اور اگر اس میں کوئی ٹیڑھ واقع ہو جائے تو پھر عمارت کی بلند ترین چوٹی بھی ٹیڑھی ہی رہتی ہے!

قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۸۰ء یا اس کے چند سال بعد تک، پرائمری سکول میں تعلیم کا نظام ان بچوں پر مشتمل ہوتا تھا جن کی عمر ۵ سال ہوتی تھی۔ بستے کا حجم ایک قاعدہ اردو/عربی (نورانی/بغدادی) اور لکڑی کی تختی ہوتی تھی جس میں بعد میں چوتھی جماعت تک پہنچنے پر حساب، اردو، تاریخ/جغرافیہ کی کتب کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ بچے صبح کا آغاز صباحی خطاب (Morning Assembly) سے کرتے تھے جس میں بالعموم علامہ اقبالؒ کی نظم ''بچوں کی دعا'' پڑھی جاتی تھی۔ پرائمری سکول سے لے کر ہائی سکول تک، بچے اس نظم کو کورس کی شکل میں ۱۰۔۱۲ سال تک روزانہ دہراتے تھے۔ جس سے ان کے ذہن میں متعدد اخلاقی صفات کا ایک ایسا انمٹ نقش مرتسم ہو جاتا تھا کہ آنے والی کالج، یونیورسٹی حتیٰ کہ عملی زندگی میں بھی ان کی راہ نمائی کرتا تھا۔ یاد رہے کہ اس نظم میں علم کی طلب، وطن سے محبت، غریبوں اور کمزوروں، ضعیفوں کی مدد، برائی سے بچنے اور نیک راہ پر چلنے کی دعا کے متعدد دیگر پہلو اس قدر ہمہ گیر مضمرات کے حامل ہیں کہ سکولوں کے صباحی خطاب سے اس نظم کو ختم کرنے نیز دیگر نظموں، کلام اقبال اور دیگر مشاہیر کی اعلیٰ ترین تحریروں کو درسی کتب سے نکال دینے کا نتیجہ آج ہم اس اخلاقی، علمی و فکری اور عملی انتشار اور جنسی انارکی کے طوفان (Tsunami) کی صورت میں دیکھ رہے ہیں جس نے وطن عزیز کو اپنی لپیٹ میں

جکڑ لیا ہے اور جس کی انتہائی ظالمانہ اور گھناؤنی ترین شکل دسمبر ۲۰۱۴ء میں پشاور میں سکول کا وہ خون آشام اور دلدوز حادثہ ہے جو ملت اسلامیہ کی تاریخ میں شقاوتِ قلبی کی انتہا بن گیا۔

یاد رہے کہ علم کا رشتہ جب اخلاقیات سے کٹ جاتا ہے تو پھر ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بم گرانا بھی ظلم نہیں رہتا۔ حکیم محمد سعید مرحوم نے اپنے مقالے (۲۰۱۵) میں امام غزالیؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ''علم کا رشتہ جب عملی تربیت سے منقطع ہو جاتا ہے تو علم وبال جان بن جاتا ہے اور جب عمل، علم سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو اس کی حیثیت ضلالت اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں رہتی۔''

صباحی خطاب کی اہمیت وضرورت کے بارے میں ذکر اس ملک کے ایک مایہ ناز ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد (۲۰۱۳) نے اپنے مقالے میں کیا (بیشتر اصحاب کو شاید علم نہ ہو کہ وطن عزیز میں موجودہ تعلیمی اداروں کے بیشتر سینئر اساتذہ (پروفیسر، ڈین، ڈائریکٹر) پروفیسر موصوف کے تلامذہ ہیں)۔ ابراہیم خالد صاحب نے اسمبلی کے صباحی خطاب کے بارے میں لکھا کہ ''میں اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ ایک ایسی زبردست تعلیمی سرگرمی ہے جسے سکولوں میں رائج کرنا بہت ضروری ہے۔''

پرائمری تا میٹرک میں سکولوں سے صباحی خطاب کی روایت کو بدلنے اور اس کی جگہ مختلف سکولوں نے اپنے طور پر جو بھی طریق کار اختیار کیا، اس کے فوائد اور نقصانات کا اس امر سے عملاً اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی سطح کے علاوہ، معاشرے میں عمومی طور پر لڑائی دنگے، دہشت گردی اور چوری چکاری کا جو عام چلن ہو گیا ہے وہ دراصل اس قسم کی اخلاقی سرگرمیوں کو تعلیمی نظام سے نکال دینے یا دیگر طریقے اختیار کرنے کا شاخسانہ ہے!

پرائمری سکول میں تعلیم کے سلسلے میں ہم نے پرائمری (اول، دوم، سوم، چہارم) جماعت تک کتب اور بستے کے حجم اور وزن کی جانب اشارہ کیا ہے۔ موجودہ دور میں اس عمر کے بچوں کو کبھی سکول جاتے وقت یا بعد از دوپہر (بالخصوص گرمی کے موسم میں) چھٹی کے

موقع پر دیکھنے سے ایک حساس دل رکھنے والا شخص، تعلیمی پالیسی بنانے والے بیوروکریٹ اور سیاست دانوں کی عقل پر ماتم کرنے اور اپنا سر پیٹ لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں پاتا۔ ان ''نام نہاد بڑوں'' کے بچوں کے بستے اٹھانے کے لیے سرکاری ڈرائیور/ دفتری موجود ہوتے ہیں جبکہ عوام الناس کے بچے جس وقت سکولوں سے باہر نکلتے ہیں، کاش ان بیوروکریٹس اور سیاسی لیڈران کی بیگمات اگر ان کا نظارہ کرسکتیں تو شاید انھیں سمجھ میں آتا کہ ان کے بچوں کے مقابلے میں کسی غریب کا بچہ کس دشواری اور مشکل حالات سے گذر رہا ہے۔ **نیز پانچویں بلکہ پریپ کلاس سے لازمی انگریزی تعلیم ایک ایسے عذاب کا کوڑا ہے جو ان معصوم بچوں (جن کی مائیں اکثر و بیشتر اردو بھی پڑھنا نہیں جانتیں) کے لیے تاعمر سوہانِ روح بنا رہتا ہے۔** (اس ضمن میں مزید گفتگو آئندہ صفحات میں کی گئی ہے۔)

متعدد تعلیمی نظاموں کا اجرا:

وطن عزیز کے تعلیمی نظام میں خرابی کی ایک بہت بڑی وجہ درجن سے زائد تعلیمی نظاموں کا اجراء ہے جو گزشتہ تین، چار دہائیوں میں وطن عزیز کے طول وعرض میں کھمبی (Mushroom) کی طرح معرض وجود میں آئے۔ ان مختلف النوع سکولوں کی وجہ سے پاکستانی مسلم معاشرے میں ایک ایسی نسل کا ظہور واقع ہوگیا ہے جو ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان کے درمیان فکر ونظر اور عمل کی ہم آہنگی اور یکسانیت کا بھی فقدان ہے۔ مختلف سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ میں بالعموم حصولِ تعلیم سے کوئی حقیقی دلچسپی نہیں۔ ماں باپ اس امر پر مطمئن ہیں کہ ان کا بچہ انگریزی زبان کے چند الفاظ، فقرات توڑ موڑ کر بول سکتا ہے۔ جہاں تک انگریزی زبان میں مہارت اور عبور حاصل کرنے کا تعلق ہے تو گزشتہ ۲، ۳ صدیوں سے بالعموم اور گزشتہ ۵۰ سالوں، جب سے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے تو پوچھا جاسکتا ہے کہ اس ملک میں کتنے بچے ایسے ہیں جو انگریزی زبان میں اپنا مافی الضمیر (بولنے، لکھنے کی صورت میں) بآسانی ادا کرسکتے ہیں؟ جہاں تک دیہات، قصبوں اور شہروں میں پڑھنے والے بچوں کا تعلق ہے تو ان کا تو کیا حال، ان کے

اساتذہ بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ وہ بچوں میں ایک بھی مضمون کا ذوق وشوق پیدا کر سکیں کجا انگریزی زبان کی 'نازک بیانی'؟ پرائیویٹ سکولوں میں اساتذہ نہایت قلیل معاوضے (اوسطاً ۱۰ ہزار ماہانہ) پر کام کرنے پر مجبور ہیں کہ شومئ قسمت سے ان کے پاس بی اے یا ایم اے کی ڈگری ہے کہ وہ عام قسم کا کام، دکانداری وغیرہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح تعلیمی معیار بہت بری طرح سے متاثر ہو رہا ہے۔

دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کا حال ان سے بھی گیا گزرا ہے۔ مفت تعلیم کی بنا پر وہاں طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے لیکن دینی تعلیم کا یہ حال ہے کہ ایک بچہ ۸، ۱۰ سال بعد بھی قرآنی تعلیمات کی روح سے آشنا نہیں ہو پاتا۔ رہا حدیث اور سیرت رسول ﷺ کا تعلق تو ان کے نصاب میں جو کچھ انھیں پڑھایا جاتا ہے، نہ صرف ان طلبا بلکہ ان کے اساتذہ کی اخلاقی حالت بھی ایسی نہیں ہوتی جس کا دور دور تک تعلق اور شائبہ سیرت رسولؐ اور اسوۂ حسنہ سے ملتا ہو۔ وہاں سے فارغ التحصیل نام نہاد مولوی، فقیر، پیر، گلیوں، محلوں، جلوسوں اور جلسوں میں برسر عام گالم گلوچ دیتے ہیں اور ان کے مقلدین جس انداز میں لوگوں کی جان، مال اور زندگی کے لیے وبالِ جان بنتے ہیں، اس کا مظاہرہ گزشتہ چند سالوں کے واقعات سے بآسانی کیا جا سکتا ہے تاہم نسلِ نو اس کی وجہ سے اسلام سے برگشتہ ہو رہی ہے!

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی!

اخلاقی حالت:

مغربی تعلیم وتہذیب کے زیر اثر جو نسل گزشتہ ۵۰، ۶۰ سالوں میں بالخصوص زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر نکلی ہے اور جس کے ہاتھوں گزشتہ چند دھائیوں سے زمام کار رہے، اس کا حال بقول ڈاکٹر عطاء الرحمن (۲۰۱۵) یہ ہے کہ صرف وزیراعظم یوسف گیلانی کے دور میں ۸۵۰۰۔ ارب روپے کی کرپشن ہوئی اور ملک کے ایک دوسرے وزیراعظم، سابق صدر اور وزرائے اعلیٰ کے علاوہ بیوروکریسی کے اعلیٰ ترین افراد اور کم وبیش تمام سیاسی

شخصیات ہی کے نہیں بلکہ ''قلفی والوں اور مٹھائی بیچنے والے ریڑھی بانوں کے بنک اکاؤنٹ میں بھی کروڑوں، اربوں روپے کے سیکنڈل روزانہ دریافت ہو رہے ہیں۔ تاہم ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ کسی ایک کو بھی بڑھ کر اپنی غلطی کو ماننے یا ناجائز دولت واپس کرنے کا عندیہ دینے کی توفیق نہیں مل رہی اور عوام الناس ہیں کہ وہ بھی کرپٹ عناصر کی پشت پناہی میں بہت حد تک ہم نوا ___ انھیں اس امر کا احساس ہی نہیں کہ ان کی تمام تر معاشی، تعلیمی اور اخلاقی زبوں حالی کا ذمہ دار ''بدمعاشوں کا یہ ٹولہ'' ہے جس نے گزشتہ ۶۰، ۷۰ سالوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کئے رکھا۔◆

مرید سادہ تو رو رو کے ہوگیا تائب
خدا کرے کہ ملے ''شیخ'' کو بھی یہ توفیق!

مغربی تعلیم سے فارغ التحصیل افراد (اعلیٰ و ادنیٰ سرکاری ملازمین، سیاست دان، دانشور وغیرہ) کے بارے میں سید مودودیؒ (۱۹۸۲) کا یہ تبصرہ تو موجودہ حالات میں گویا ایک الہامی نوعیت کا محسوس ہوتا ہے جو انھوں نے اپنی ایک تقریر (۱۹۵۲) میں کیا تھا **''ان کو معزز سے معزز پوزیشن میں ہو کر بھی کسی ذلیل سے ذلیل بد دیانتی اور بدکرداری کے ارتکاب میں دریغ نہیں ہوتا۔ ان میں بدترین قسم کے رشوت خور، خویش پرور، سفارش کرنے اور سننے والے، بلیک مارکیٹ کرنے والے اور کرانے والے، ناجائز درآمد برآمد کرنے اور کرانے والے، انصاف اور قانون اور ضابطے کا خون کرنے والے، فرائض سے جی چرانے اور لوگوں کے حقوق پر چھری چلانے والے اور اپنے ذرا سے مفاد پر اپنی پوری قوم کے مفاد اور فلاح کو قربان کرنے والے، ایک نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہر شعبۂ زندگی میں ہر جگہ آپ کو کام کرتے نظر آئیں گے!''**

ان الفاظ میں جن جن کرداروں کی تصویر کھینچی گئی ہے، کیا اس کے بعد اب ضرورت رہ گئی ہے کہ ان کے ''اسمائے گرامی'' بھی لیے جائیں اور کیا یہ تمام کردار آج کے معاشرے

◆ مزید نہایت ہولناک تفصیلات کے لئے دیکھئے ڈاکٹر حق حقی کی کتاب ''کوڑھ کی کاشت'' (1999) کا مطالعہ ضروری ہے۔

کی جانی پہچانی ''شخصیات'' نہیں ہیں کہ انھیں پہچاننے میں کسی شخص کو کوئی دقت یا پریشانی لاحق ہو؟

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟

اب ہم چند عمومی اور مختصر گزارشات ذریعۂ تعلیم اور بھرمار کتب کی کوالٹی کے بارے میں کریں گے جس نے تعلیمی نظام کو تباہ و برباد کرنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

ذریعہ تعلیم:

کسی بھی تعلیمی نظام میں ذریعہ تعلیم کو وہ حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں روح کو حاصل ہوتی ہے کہ جس کے پرواز کر جانے سے جسد خاکی باقی رہ جاتا ہے جسے پیوند خاک ہی ہونا ہوتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک (قطع نظر ترقی یافتہ، ترقی پزیر یا مفلوک الحال) کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں بچوں کے لیے ذریعہ تعلیم ان کی مادری زبان کو نہ بنایا گیا ہو۔ تاہم یہ ''شرف'' ہمارے ملک کی اشرافیہ (نام نہاد اعلیٰ تعلیم یافتہ سرکاری افسران اور کم پڑھے لکھے سیاست دانوں) کو ہی حاصل ہے کہ انھوں نے بچوں کو پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک انگریزی زبان کو لازم قرار دیا ہے۔ یورپ کے درجنوں ممالک ہیں (سوائے برطانیہ) کسی جگہ بھی انگریزی ذریعہ تعلیم نہیں ــــــ کیا چین اور جاپان میں علمی اور تحقیقی امور، کسی دور میں بھی انگریزی زبان کی منت پذیر رہی ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ گزشتہ ۳ صدیوں میں برصغیر میں انگریزی پڑھائے جانے کے باوجود کوئی شیکسپیئر یا ہملٹن پیدا نہیں ہو سکا؟ اگرچہ اس تمام دور میں اردو زبان کے شعر و ادب، سیاست، معاشرت، تاریخ و سوانح، تفسیر و احادیث اور ادب کی مختلف اصناف کے سینکڑوں نابغہ روزگار پیدا ہوئے کہ اس کی مثال ملت اسلامیہ کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکے (اس موضوع پر ہمارے اہل علم اور جامعات کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے طلبہ، طالبات سے ان تمام اعاظم رجال پر تحقیقی مقالہ جات لکھوائیں)۔

انگریزی زبان کی تحصیل پر غیر ضروری اہمیت دینے کا مہلک ترین اثر یہ ہوا کہ نوجوان

نسل عربی، فارسی بلکہ اب تو اردو سے بھی نابلد ہو کر رہ گئی ـــــ آج کا بچہ، اپنے بعید ترین مشاہیر سے ہی نہیں بلکہ قریب ترین ہستیوں (قائداعظم، اقبال، اکبر الہ آبادی، حالی، غالب اور مودودی) سے بھی لاعلم کر دیا گیا۔ بچوں کو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، بغاوت (Mutiny) کے حوالے سے تو یاد ہے لیکن اس میں انگریز کی غلامی سے آزادی کے حصول کا ذکر دور دور تک نہیں پایا جاتا۔ اور یوں ان کا رشتہ اپنی مادری زبان (اردو) میں موجود اس سرمایہ عظیم (قرآن وتفسیر، حدیث اور سیرت رسول) بلکہ تاریخ وادب سے بھی کٹ گیا۔ بقول ڈاکٹر محمود غازی (۲۰۰۹، ۱۹۹۹) پاکستان بننے کے بعد، نوجوان نسل جس قدر اسلام سے دور ہوئی اور اسلامی تعلیمات وروایات پر جس دیدہ دلیری کے ساتھ تنقید بلکہ تردید ونفی کرنا شروع کیا، دور غلامی میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا۔ گزشتہ ۴، ۵ دہائیوں میں ''نام نہاد اپنوں'' (ماہرین تعلیم، ادیب، افسانہ نگار، ناوّل نگار اور تاریخ کے جغادری ماہرین) کی کج فہمی اور امریکی، مغربی غلامی کے نتیجے میں یہ بے راہ روی اور مادر پدر آزادی اب ایک ایسے اژدہے کی شکل اختیار کر چکی ہے جس کی زہرناکی کا شکار یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم نوجوان مسلم (لڑکے، لڑکیاں) ہو رہی ہیں۔ (اسماء آفتاب ۲۰۱۸)

اردو بطور ذریعہ تعلیم: ایک منفرد نکتۂ نظر

اردو بطور قومی زبان کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں یہ گزارشات اس امر کے منہ بولتے ثبوت کی حیثیت رکھتی ہیں کہ گزشتہ ۷۰ سالوں میں ہم نے اردو کو نظر انداز کیا ہے۔ تاہم، ہم اس ملک کے انگریزی دلدادہ والدین، اساتذۂ کرام اور بالخصوص تعلیمی ماہرین کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں جو ہماری نظر میں اس کا وہ پہلو ہے جو اکثر وبیشتر نظروں سے اوجھل رکھا گیا ہے اور والدین نیز بچوں نے اپنی لاعلمی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے اس جانب توجہ نہیں کی۔

میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے بعد کالج نیز یونیورسٹیوں (بشمول پروفیشنل یونیورسٹیوں/ کالجز) میں داخلے کے لیے بچوں کی جو دوڑ لگی ہوئی ہے اور گزشتہ ادوار میں سیاستدانوں اور بیوروکریسی کی مجرمانہ غفلت اور بے ایمانی کے نتیجے میں ہر ڈویژن میں سیکنڈری ایجوکیشن

بورڈ بن جانے کی صورت میں یہ صورت حال بھی دیکھنے میں آئی کہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج اور اسی قسم کے دیگر نامی گرامی اداروں میں وطن عزیز کے پسماندہ علاقوں سے ۹۵ فی صد سے زائد نمبر حاصل کرنے والوں کو داخلہ مل گیا۔ تاہم جب تعلیم کا آغاز ہوا تو پتہ چلا کہ ایسے طلبہ کی ایک کثیر تعداد تو اس تعلیم کو سمجھنے ہی سے قاصر ہے جو اعلیٰ میڈیکل کالجوں میں دی جاتی تھی ___ تحقیق پر مزید پول کھلا کہ اس قسم کے علاقوں (ڈیرہ غازی خان/ ڈیرہ اسمٰعیل خان اور سندھ و بلوچستان) کے پسماندہ ڈویژن کے سیاستدانوں کے احکامات کے تحت بچوں کو ۹۵ فی صد سے زائد نمبر دے کر پاس کیا گیا ___ اس پر انٹری ٹیسٹ کے نام سے ایک اور ہفت خواں امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا ___ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر محنتی طلبہ اور طالبات جنہوں نے اپنے مضامین میں اعلیٰ نمبر حاصل کیے ہوتے تھے وہ اس قسم کے کمپیوٹر کے ذریعے امتحانات میں عمدہ کارکردگی نہ دکھا سکے۔ یہی حال بیرونی ممالک میں جانے والے امتحانات کا ہوتا ہے کہ لوگ باگ ان پسماندہ علاقوں میں جا کر امتحان دیتے ہیں اور ''بوٹی'' یا نذرانہ دے کر نقل کرتے ہیں اور بعد میں چین یا کسی دوسرے ملک سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ''خرید'' کر ملک پر سوار ہو جاتے ہیں!

اس مسئلے پر جب مزید تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ ایسے طلبہ میں اکثر تعداد ان بچوں کی ہوتی ہے جو (فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی اور حساب میں ۹۵ فی صد سے زائد نمبر حاصل کر لیتے ہیں لیکن اردو، اسلامک سٹڈیز اور پاکستان سٹڈیز میں (جو سوائے اردو نہ صرف فیڈرل/ دیگر بورڈز میں انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں) ایسے طلبہ کے ۷۰ فی صد نمبر بھی نہیں آتے۔ اب ظاہر ہے کہ پانچ مضامین میں ۹۵ فی صد نمبر اور دوسرے تین مضامین میں ۷۰ فی صد (اکثر اس سے بھی کم) نمبر لینے پر ملا جلا کر یہ فی صد صرف ۷۰ / ۷۵ فی صد رہ جاتی ہے اور یوں بہت سے ذہین بچے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جانے سے رہ جاتے ہیں ___ اب اگر ان بچوں نے اردو میں ذریعہ تعلیم کی بناء پر یہ تین مضامین بھی اردو میں پڑھے اور امتحانات دیا ہوتا اور ان کے نمبر بھی ان تین مضامین میں ۹۰ فی صد سے زائد آئے ہوتے تو ظاہر ہے کہ یہ بچے کسی سے پیچھے نہ رہ سکتے تھے!

راقم الحروف کو اس کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ اس کے نواسے/ پوتے راولپنڈی کے ایک بہت نامی گرامی سکول میں پڑھتے ہیں۔ ایک نواسے کا دوست تعلیمی حالت میں اس سے بہتر تھا جس کا اندازہ نہ صرف راقم الحروف نے ان بچوں کے ساتھ ایک ملاقات میں لگایا بلکہ بعد میں میرے نواسے نے خود بھی اسی بات سے اتفاق کیا۔ لیکن اے لیول کے امتحان میں اس بچے کو آخری امتحان میں ان ۲ / ۳ مضامین (اردو، اسلامک سٹڈیز وغیرہ) میں B گریڈ مل گیا اور یوں وہ سکول سے گولڈ میڈل حاصل نہ کر سکا جب کہ میرے نواسے نے ان تین مضامین میں بھی ۹۰ فی صد سے زائد نمبر حاصل کیے تھے اور یوں اسے گولڈ میڈل مل گیا، وہ بچہ شرم اور ندامت کی وجہ سے سکول کی سالانہ تقریب میں بھی نہ آسکا!

یہاں ہم والدین، بچوں اور اساتذہ سے نہایت دردمندانہ اپیل کریں گے کہ اس پہلو پر توجہ دے کر بچوں کو نہ صرف اعلیٰ نمبروں سے امتحان پاس کرنے میں مدد دیں تاکہ بچے ایک اچھا اور مفید شہری بننے میں ان مضامین کی افادیت سے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ اور یوں وہ بچے جو ڈاکٹر انجینئر یا سائنس دان بن رہے ہیں، ایک اچھے اور فرض شناس پروفیشنل بن سکیں یا نہیں تاہم انھیں اچھا مسلمان پاکستانی شہری ضرور بننا چاہیے!

ان بتان عصر حاضر کے بارے میں جو لبرل تعلیمی نظام اور دینی مدارس کے اداروں میں زیر تعلیم ہیں یا فارغ التحصیل ہو کر مختلف تعلیمی اداروں میں کلیدی حیثیت میں نوجوان نسل کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں، علامہ اقبالؒ نے آج سے قریباً ایک صدی قبل جو تبصرہ اور پیش گوئی کی تھی، وہ صاحبان دل کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہونا چاہئے تھا لیکن اس دور افراتفری اور فکری زولیدگی میں خوب اور ناخوب کا کسی کو بھی خیال نہیں کہ اس زمانے کی ہوا ہر چیز کو خام رکھتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کسی بھی تعلیمی نظام کی نمایاں ترین بنیادی خصوصیات (Fundamental traits) کا یوں ذکر کیا ہے۔

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ!

ان چار صفاتِ عالیہ، جو دراصل ایک تعلیمی نظام کو پیدا کرنی چاہیے، کی روشنی میں جب

ہم اپنی ''نام نہاد تعلیم یافتہ'' نوجوان نسل کو دیکھتے ہیں تو مایوسی کے گہرے اندھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ان میں زندگی کی رمق دمک، محبت (فاتح عالم) کا فقدان، معاملہ فہمی (تاریخ پر نگاہ) اور مستقبل کے لائحہ عمل (مقصد زندگی) کے بارے میں کوئی دھندلا سا تصور بھی نہیں پایا جاتا!

غلامانہ تعلیمی نظام کے موضوع پر تنقید کا تو شمار ہی ممکن نہیں جو علامہ اقبالؒ کے علاوہ دیگر اعاظم رجال امت نے گزشتہ ایک صدی میں ان دونوں تعلیمی نظاموں پر کی ہے۔اس تمام کا ایک مختصر جائزہ پشاور یونیورسٹی میں ایک مقالہ میں کیا گیا ہے۔(محمد آفتاب خاں اور اسماء آفتاب ۲۰۱۷)

حالیہ دور میں ڈاکٹر اسماء آفتاب نے اپنی پی ایچ ڈی مقالے (۲۰۱۸) میں ان چند مشہور ادیبوں کی تحریروں کا ایک مبسوط تنقیدی جائزہ لیا ہے جنھوں نے گزشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان کے نظریاتی تصور اور اس کے اسلامی تشخص کے بارے میں ہرزہ سرائی کی ہے۔اس ضمن میں انھوں نے سعادت حسن منٹو، سارہ سلہری اور حنیف خان کی تحریروں کا محاکمہ کیا ہے جن میں ان تمام مصنفین نے پاکستان اور اسلام کے خلاف اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔آج ضرورت اس امر کی ہے کہ وطنِ عزیز کے وہ تمام پڑھے لکھے لیکن ایماندار اور محب وطن لوگ اپنے اپنے مضامین خصوصی پر کتب و مقالہ جات نوجوان نسل کی اس طور سے تربیت کریں کہ وہ ایک محب وطن شہری بن سکیں۔

لیا جائے گا تجھ سے کام، دنیا کی امامت کا!

باب سوئم

سیکنڈری، ہائرسیکنڈری سکول کی تعلیم

ایک خبر

ابھی یہ کتاب اشاعت کے لیے نہیں گئی تھی کہ لاہور بورڈ کے نتائج کا اعلان ہوا۔ اس سے ضوفرسا خبر ملی کہ اس سال بورڈ میں 700 طلبہ/ طالبات نے 1100 میں سے 1100 نمبر حاصل کیے جبکہ متعدد طلبہ نے 1110 نمبر بھی حاصل کیے۔

قیاس کن زگلستانِ من، بہار مرا

گزشتہ صفحات میں پرائمری تا دہم تک کے تعلیمی نظام کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کی مشہور ترین نظم ''بچوں کی دعا'' کے حوالے سے چند مختصر گزارشات پیش کی گئی ہیں۔ اب ہم چند معروضات ہائی سکول اور ہائیر سیکنڈری سکول کی تعلیمی حالت کے بارے میں مختصراً بیان کریں گے۔ موضوع زیر بحث کی مناسبت سے ضرورت تو اس امر کی ہے کہ کوئی ماہر تعلیم بالخصوص اردو لٹریچر سے تعلق رکھنے والے صاحب علم، اس موضوع پر سیر حاصل بحث کریں اور بتائیں کہ کس طرح ماضی میں شامل نصاب کلام اقبال اور دیگر صاحبانِ علم کی تحریریں، نسلِ نو کے اخلاق اور کیریکٹر پر اثر انداز ہوتی تھیں اور پختہ عقائد سے تہی دامنی کیوں کر موجودہ تعلیمی و اخلاقی زبوں حالی کا سبب بنی ہے۔

حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں
ہوگیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر!

علامہ اقبال نے ۱۹۰۵ء کے بعد متعدد نظمیں، ان طلبا کے لیے لکھیں جن میں اہم ترین ''بلالؓ''، شکوہ، طارق کی دعا، و دیگر نظمیں ہیں۔ (ضمیمہ ر)۔ عمر کے اس عرصے تک ایک بچہ ۱۵ سال کا ہو جاتا ہے جسے بلوغت کی عمر (Age of puberty) کہتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ اس عمر کے بچوں کو ان تمام تر اہم جسمانی، ذہنی اور نفسیاتی تبدیلیوں کا بہت زیادہ علم نہیں ہوتا تھا تاہم آج کی دنیا میں جہاں انٹرنیٹ، موبائل اور ٹی وی اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک بچہ اس عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے ہی ایک ایسی جنسی، نفسیاتی ہیجان کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی جسمانی تبدیلیوں کے بارے میں آگاہ کیا جانا ضروری ہے۔ (محمد آفتاب خان ۲۰۱۵ء ناصح الوان ۱۹۸۱) کیوں کہ والدین اپنے طور پر ان تمام تر فطری تبدیلیوں کے بارے میں راہ نمائی دینے سے قاصر ہوتے ہیں (اپنی کم علمی یا دیگر معاشرتی وجوہات کی بنا پر)۔ تاہم سکولوں، کالجوں بلکہ گھروں میں بچے متعدد ذرائع ابلاغ (انٹرنیٹ، ٹی وی وغیرہ) کے ذریعے اس قسم کی غلط معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس حقیقت کا ادراک آپ ہر ہفتہ، مختلف اخبارات کے جمعہ، اتوار میگزین میں مختلف حکماء اور دواخانوں کے ان بے شمار اشتہارات سے لگا سکتے ہیں جو علاج معالجے کے نام پر گمراہی پھیلانے کا ایک اہم سبب ہیں۔ پھر جب یہ بچے گلی محلوں میں موبائل فون اور انٹرنیٹ کے ذریعے ''پیغام رسانی'' (Mesages) یا گفتگو (Chat) کرتے ہیں تو بے شمار معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں جس کے نتیجے میں لڑکے، لڑکیاں گھروں سے بھاگ کر ہوٹلوں میں چند راتیں گزارتے ہیں۔ گزشتہ چند سالوں میں اخبارات، ٹیلی ویژن کے ذریعے اس قسم کے ایک نہیں درجنوں واقعات منظر عام پر آ چکے ہیں۔ حالیہ دور میں قصور میں ہونے والے حادثہ فاجعہ پر مجرم کی سزا اور اسی قسم کے دیگر مقدمات اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ مسلم معاشرہ جنسی انارکی اور بے راہ روی کے طوفان میں گھرا ہوا ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی منبر ومحراب اور حکومتی اداروں بالخصوص تعلیم گاہوں کی جانب سے کسی عملی اقدام کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ (غلام اکبر خان ۲۰۱۱، انصار عباسی ۲۰۱۲، عبدالقیوم لفٹیننٹ جنرل (ر) ۲۰۱۲)۔ ◆ ہائی سکول اور انٹرمیڈیٹ کالجوں میں تعلیم کی صورت حال بہت دگرگوں ہے۔ پرائیویٹ سکولوں میں انتہائی گراں فیسیں، کتب، کاپیاں اور اس پر مستزاد متعدد اقسام کے ٹیوشن سنٹرز اور اکیڈمی وغیرہ کے

◆ مزید معلومات کے لیے دیکھئے کتاب جنسی تعلیم: والدین کو درپیش مسائل اور ان کا حل (۲۰۱۶)

ذریعے جس طریق پر عوام الناس سے رقم بٹور کران کے بچوں پر تعلیم کے دروازے بند کیے جارہے ہیں وہ کسی ایسی مملکت کے شایان شان نہیں جن کے حکمران اپنے بچوں کی تعلیم نہ صرف پاکستان میں غیر ملکی اداروں میں کراتے ہیں بلکہ امریکہ اور یورپ کی درسگاہوں میں انھیں بھیج کر مستقبل بعید میں حکمرانی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ (ڈاکٹر محمود غازی ۲۰۰۰)

جہاں تک معیار تعلیم کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں چند حقائق کی جانب گزشتہ صفحات میں اجمالاً ذکر کیا جا چکا ہے۔ انسانی زندگی میں تعلیمی دور کا یہ حصہ نہایت حساس اور تادیر زندگی پر اچھے یا برے مضمرات کا سبب ہوتا ہے۔ اخلاقی تعلیمات جو اس دور میں بچوں کو آئندہ زندگی میں ایک مفید شہری اور مسلمان بنانے میں مددگار ہوسکتی ہیں وہ سرکاری سکولوں میں اردو زبان میں معاشرتی علوم، اسلامک سٹڈیز اور اردو بطور ایک لازمی مضمون کے پڑھانے سے کسی حد تک مفید ثابت ہوسکتی تھی لیکن اولیول، اے لیول، انگلش میڈیم سکولوں میں یہ تمام علوم (ماسوا اردو بطور زبان) کے انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں جو اس قدر مشکل ہوتے ہیں کہ بچہ انھیں رٹنے میں ہی اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیتا ہے، سوچنے، سمجھنے اور پھر سنجیدگی کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا اِلٰہ اِلّا اللہ

اردو زبان سے لاتعلقی کی ایک مزید مثال

اردو زبان سے لاتعلقی کا ایک اور نادر طریقہ جو اولیول، اے لیول اور انگریزی میڈیم سکولوں میں ''استعمال'' کیا جاتا ہے کہ اردو کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا یعنی لازمی اور اختیاری۔ لازمی حصہ (بطور زبان) مشاہیر اور ان کے علمی و ادبی، کارناموں سے متعلق ہے جس میں اخلاقی تعلیمات کا ایک وسیع سمندر ہے جبکہ اختیاری اردو کا حصہ صرف مضمون نگاری، خطوط اور درخواستیں لکھنے وغیرہ سے متعلق سہل موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان سکولوں کے اساتذہ اس حصے کو اختیار کرنے کی سفارش بچوں کو کرتے ہیں کہ وہ اساتذہ اور طلبا دونوں کے لیے آسان ہوتا ہے (جبکہ نثر، شاعری و دیگر اصناف علم پڑھانے کے لیے

اساتذہ کو خود تیاری کرنی پڑتی ہے جس کے وہ عادی نہیں ہوتے) چونکہ والدین کو علم نہیں ہوتا کہ وہ تعلیمی ماہرین اور اساتذہ کی ان چالوں کو سمجھ سکیں اس بناء پر وہ اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں رکھتے اور نسل نو، اس طرح اپنے ماضی کے مشاہیر اور ان کے عصری، ادبی شاہکار تحریروں سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ ایسے عالم میں ان کی زندگی پر جو مثبت اثرات مرتّب ہو سکتے ہیں، وہ ان سے محروم رہ جاتے ہیں اور ان سکولوں سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں تو مغربی مفکرین، شعرا اور دانشوروں کے بارے میں تو ''کچھ'' جانتے ہیں لیکن ماضی بعید یا قریب میں انھیں غالب، علامہ اقبال اور حالی وغیرہ جیسے نابغہ روزگار اصحاب کا علم تک نہیں ہوتا!

یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ''غیروں کی عیاری اور اپنوں کی حماقت'' کا برملا اعتراف کیا جائے جس نے نہایت عیاری و پرکاری اور آسانی سے امریکی ماہرین تعلیم کی سفارشات پر مسلم قوم کو بانجھ بنا دیا۔ اس دو دھاری تلوار سے انھوں نے اردو کی اہمیت بطور بابو، کلرک، منشی کو تو سراہا تاہم مغربی مفکرین اور دانشوروں کا ایک ایسا انمٹ نقش انگریزی زبان میں تدریس کے راستے، مسلمان نوجوان نسل کے ذہنوں میں ڈال دیا جو آج سے قریباً دو صدی قبل لارڈ میکالے نے برصغیر ہند کے لیے تعلیمی پالیسی بناتے وقت بطور اصل الاصول طے کیا تھا کہ **''ہمیں اس بڑی مملکت کو چلانے کے لیے بابوؤں کی ایک ایسی نسل تیار کرنی چاہیے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں تاہم وہ انگریز کے ذہن سے اس کے مفاد کی ترجمانی وحفاظت کریں''**۔۔۔ اس صورت حال پر سید مودودیؒ (۱۹۸۲) کا وہ تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے جو انھوں نے ۱۹۳۶ء میں مسلم یونیورسٹی کورٹ کو علی گڑھ یونیورسٹی میں بڑھتے ہوئے الحادی اور اشتراکی فکر کو پروان چڑھنے کے موضوع پر اصلاح احوال کے موضوع پر لکھا تھا۔ موصوف نے اس تعلیمی نظام کے نقائص کو یوں واضح کیا کہ **''اس نے ہم میں کالے فرنگی پیدا کئے، اس نے ہم میں ''اینگلو محمڈن'' اور اینگلو انڈین'' پیدا کئے اور وہ بھی ایسے جن کے نفسیات میں ''محمڈن'' اور ''انڈین'' کا تناسب برائے نام ہی ہے۔''!**

اگرچہ اس موضوع پر مزید بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور وقت کی ضرورت ہے کہ مسلم اہل علم اس طرح کی تمام ''مساعیٔ جمیلہ'' کا ناقدانہ جائزہ لیں۔ تاہم اپنے مافی الضمیر کے اِظہار کے لیے بانگ درا میں علامہ اقبالؒ کی نظم ''فردوس میں ایک مکالمہ'' کی جانب اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہیں گے۔ اس نظم میں علامہ مرحوم نے فردوس میں مولانا حالیؒ اور شیخ سعدیؒ کے درمیان ایک گفتگو کا ذکر کیا ہے جس میں شیخ سعدیؒ نے مولانا حالیؒ سے سوال کیا تھا:

کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیان کر
واماندۂ منزل ہے یا مصروفِ تگ و تاز؟

مولانا حالی نے اس سوال کا جو جواب دیا وہ آج کے مسلمان (بالخصوص نوجوان نسل) کی اخلاقی زبوں حالی کی کس قدر صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔ کہ انسان اس کے ایک ایک شعر پر غور کرنے سے حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے!

جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی
ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

یہاں شیخ سعدی نے جس انداز میں اس گفتگو کو سمیٹا ہے، ظاہر ہے کہ یہ انداز بھی انہی جیسے صاحب فہم نظر کا ہوسکتا تھا۔ آپ نے فرمایا:

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں بافت ازاں پشم کہ رشتیم

ظاہر ہے کہ کانٹوں کی فصل اگانے سے خرما (کھجور) اور پشم (اون) سے ریشم کا حصول ممکن نہیں۔اس امر کی صراحت شاید ضروری ہے کہ کانٹوں سے مقصود وہ ملحدانہ نظام تعلیم ہے جس سے امت مسلمہ عالمی پیمانے پر دوچار ہے، اور انھیں مسلسل یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ اس مغربی تعلیم کے ذریعے سے ہم اپنی ملی اقدار اور اخلاق کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں ترقی بھی کرسکیں گے۔

درج بالا طول بیان کے بعد ایک بہت ہی اہم مسئلہ او لیول، اے لیول کے تمام مضامین کی انگریزی میں کتب کا ہے جس کے ذریعے اربوں روپے کا زرمبادلہ ہر سال امریکہ اور دیگر مما لک میں چلا جاتا ہے۔اس کا تو شاید کچھ زیادہ نقصان نہ ہو کہ وہ اس طبقے کے لوگوں کی ''اکثر و بیشتر گاڑھے پسینے کی کمائی نہیں ہوتی'' زرمبادلہ تو ملک کا جاتا ہے جس کی کسی کو پرواہ نہیں''___ تاہم اصل نقصان اس ذہنی مرعوبیت اور (Brain drain) کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس ذریعہ تعلیم کے تحت ''جہالت سے علمی روشنی کے سفر'' کی وجہ سے متوقع ہوتا ہے۔

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اے لیول/ او لیول کی کتب کا جائزہ

ذیل میں ہم نے او لیول، اے لیول کی تدریسی کتب کی تفصیل (از قسم قیمت، معیارِ طباعت، تعداد صفحات، کاغذ کی کوالٹی، فیس سٹرکچر، ڈریس، نیز امدادی کتب اور گزشتہ سالوں کے حل شدہ امتحانی سوالات وغیرہ) درج کی ہے۔ کہ گزشتہ صفحات میں بھی اس نظام تعلیم کے بارے میں ہم نے چند معروضات پیش کی ہیں۔تاہم ان کتب کے بارے میں بھی چند معروضات ضروری ہیں۔

سب سے پہلی بات جو ان کتب کو دیکھ کر ہم جیسے ایک عام قاری (باوجودیکہ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں) کے لیے باعث حیرت ہے کہ بیشتر غیر ملکی طباعت شدہ کتب کا ''معیار'' ہی اس قدر مرعوب کن ہے کہ ایک انسان حیرت وتعجب کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

گلیزڈ کاغذ (100 گرام سے زیادہ وزنی)۔رنگین چھپائی تو باعث حیرت ہونی ہی چاہیے کہ ''طبقۂ علیا'' کے بچوں نے پڑھنا ہے۔ قیمت بھی ان کے والدین کے لیے کسی اہمیت کی حامل نہیں۔ بچوں کی بصارت پر اس کے جو برے اثرات پڑتے ہیں اس کی جانب اساتذہ / والدین دونوں ''بے خبری'' کی حد تک لاعلم''۔کتابوں کا وزن بھی اہمیت نہیں رکھتا کہ 15 کلوگرام سے زائد وزن بستہ/ کاپیوں وغیرہ اٹھانے کے لیے چپڑاسیوں/ ڈرائیوروں کی فوج ظفر موج موجود تاہم صرف ایک سوال یہ ہے کہ کیا180 دنوں کی سکول کی تعلیمی مدت میں بائیس (22)صفحات روزانہ کی تعلیم ''خلائی مخلوق'' کا کام تو ہوسکتا ہے،سکولوں کے موجودہ نظام،اساتذہ کی اخلاقی، ذہنی، دینی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے پیش نظر دعویٰ کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ امر محال ہی نہیں ناممکن ہے۔

گوشوارہ نمبر ا: اے لیول تعلیم کی کتب کا جائزہ

Sbujects	**Remarks**
Chemistry (Matters)	Pages 494, glazed paper, Singapore. P.2555/-
Oxford New Syllabus Mathematic	Pages 483, Oxford University Press Pakistan
Cambridge Biology Course Book	Pages 536, glazed paper, P1995/-, Dubai
Cambridge Physics Course Book	Pages 565, glazed paper, P2595/-
Ideology of Islam	Pages 456
The History and Culture of Pakistan	Pages 208
The Environment of Pakistan New Edition	Pages 249
GCSE New Edition O Level Urdu (in accordance with syllabus B)	Pages 504, Allied Book Centre Urdu Bazar, Lahore.

☆......دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا کسی بچے کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ان تمام مندرجات کو سمجھ کر یاد کر سکے گا جو ان کتابوں میں درج ہیں؟ کیا ان کا یاد رکھنا ضروری بھی ہے؟ کہ بیشتر کا تعلق تعلیم سے نہیں صرف معلومات کی فراہمی تک محدود ہے!

☆......تیسرا سوال یہ ہے کہ اس تمام تر ''رطب و یابس'' کو جو ان کتب میں درج کیا گیا ہے کیا تعلق (Relevance) ہے ان کے امتحان یا عملی زندگی سے؟

☆......کیا کتب کی ضخامت و حجم، طباعتی معیار صرف اس لیے تو نہیں بنایا گیا کہ ''گاہکوں'' کو اپنی جانب متوجہ کیا جائے اور یوں ان کی جیبوں سے دولت لوٹ کر قوم و وطن پر ایسے افراد کو ''ٹھونس'' دیا جائے جو ٹائی لگا کر چند انگریزی کے حروف (وہ بھی توڑ موڑ کر) بول سکیں اور **سیاسی قیادتوں کے لیے Yes Sir کہنے والے سیکرٹری، چیف سیکرٹری اور دیگر بیوروکریسی کا کردار ادا کر سکیں**۔ جس کا مظاہرہ حالیہ کرپشن کے مختلف کیسوں میں سامنے آیا ہے کہ پرنسپل سیکرٹری ٹو وزیر اعظم اور صوبائی چیف سیکرٹری نے اس قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اور نیب کے سامنے رونے لگے اور یوں اس امت کو لوٹنے یا مدد دینے میں اپنا کردار ادا کیا؟

ایک آخری بات جو ہم اپنی برادری کے ایماندار اور مخلص وطن احباب/ اساتذہ سے کہنا چاہیں گے کہ خدارا وہ اس عالمی سازش کا شکار نہ بنیں۔ ایسی کتابیں ایمانداری کے ساتھ پڑھانے کے لیے منظور کریں جو پاکستان کے حالات کی عکاسی کرتے ہوں—— اس ضمن میں یاد آیا کہ اسلامک سٹڈیز کی کتاب جو لگائی گئی ہے وہ **کسی پاکستانی ادارے نے کسی ''غیر معروف شخصیت'' کی لکھی ہوئی، اخباری کاغذ، انتہائی ناقص چھپائی نیز ادھر ادھر سے مواد کو Cut+Paste کے ذریعے چھاپ دیا گیا ہے**۔ اسلامی موضوع پر اس کتاب کا مقابلہ، غیر ملکی کتب کے معیار طباعت، کاغذ کی کوالٹی سے کرنے پر واضح انداز میں اس مضمون کی **''کم ترین اہمیت''** کا ایک غیر محسوس پیغام (Message) بچوں کو ہر وقت اس طرح کی کتاب دیکھنے سے ملتا رہتا ہے۔ کیا اس تمام مواد پر جو انگریزی میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے بچوں پر دین کے اعلیٰ و ارفع ہونے کا کوئی تاثر

بھی پڑتا ہے؟ اور اس سب پر مستزاد یہ کہ نیوز پرنٹ کی کتاب کی **قیمت 525 روپے ہے۔سوال یہ ہے کہ کس بیوروکریٹ/ پرنسپل/ استاد نے اس میں کس قدر ''حصہ خیر'' وصول کیا ہے؟**

حالیہ دور میں ''یکساں نظامِ تعلیم'' کا بہت چرچا ہے اور خیر سے موجودہ حکومت نے اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے یکساں نصاب تعلیم بھی لاگو کردیا ہے۔اس کی حقیقت کو کتاب کے آئندہ ابواب (باب یازدہم) میں اہل علم نے بہت عمدہ طریق پر واضح کی ہے۔ تاہم یہاں اس امر کی جانب توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ تعلیمی سال کا ایک تہائی سے زائد عرصہ بغیر کسی ''باقاعدہ پڑھائی'' کرونا وائرس کی نظر ہوگیا۔حکومت نے صرف درج ذیل اداروں کو مختلف کتب شائع کرنے کی اجازت دی ہے۔قطع نظر اس حقیقت کو آخران اداروں کی ہی یہ ''خصوصیت'' کیوں؟___ مزید برآں یہ تمام ادارے مطلوبہ کسی ''بیوروکریٹ'' کا حصہ پتی ہے؟___ مزید برآں یہ تمام ادارے مطلوبہ تعداد میں کتب فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں اور اس پر بھی مزید ظلم یہ کہ کتب کی قیمت اس قدر زیادہ کہ شاید کسی ''ایماندار'' شخص چاہے وہ ۲۰ گریڈ کی تنخواہ ہی کیوں نہ وصول کررہا ہو، اپنے ''جائز'' ذرائع سے ۴،۵ بچوں کی کتابیں، ورک بک، کاپیاں (اعلیٰ ترین معیار اور خاص پبلشرز کی شائع کردہ) خریدنا ناممکن ہے___ یہاں ہم گریڈ 6 اور 7 کے بچوں کے لیے حساب اور سائنس کی جو کتب لگائی گئی ہیں ان کی قیمت ۱۴۰۰ روپے فی کتاب ہے۔ یہ دراصل شاخسانہ ہے ان چند اداروں کو حقوقِ طباعت دینے کا جن کی تفصیل ذیل میں درج کی جارہی ہے۔

① آکسفورڈ پریس ② کیمبرج ③ پیراماؤنٹ

④ جاوید پبلشرز ⑤ دانش

چھٹی اور ساتویں گریڈ کی انگریزی کی کتاب کی قیمت -/1945 روپے جب کہ ورک بک کی قیمت -/1045 روپے ہے۔کل قیمت -/3000 روپے ہے۔اتنی قیمتی کتابیں کون خرید سکتا ہے؟___ یہ وہ سوال ہے جو آج سب کررہے ہیں؟

مزید برآں، ان کتب کی قیمتوں اور دیگر اخراجات کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے

کہ ان سکولوں میں کسی اپر مڈل کلاس کے بچے تو تعلیم حاصل ہی نہیں کر سکتے الا یہ کہ ان پر کسی ''فضل خاص کا نزول'' ہوتا ہو۔ اس کے علاوہ مختلف تقریبات (برتھ ڈے پر تمام کلاس کے لیے تحفے، تحائف وغیرہ) چند ایسے اخراجات ہیں جو بچوں کو مغربی تہذیبی روایات کے تحت ضرور کرنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح وہاں سالانہ تقریبات کے موقع پر جن بچوں کو ناچ، گانے، ڈرامے، سکِٹ و دیگر امور میں شرکت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے، ان کے لیے منتخب شدہ کردار کے مطابق تمام ڈریس بچوں کو خود لانے پڑتے ہیں جن پر بھی یک خطیر رقم صرف ہوتی ہے ــــ کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح کی تقریبات میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ تاہم گزارش ہے کہ کیا یہ اس ''کلاس سسٹم'' کو فروغ دینے کی کوشش نہیں جو عام سکولوں، گورنمنٹ سکول، پرائیویٹ سکولوں اور دینی مدارس کے بچوں کے درمیان، تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے پیدا کی جا رہی ہے؟ اور جس کی جانب ہم نے گزشتہ صفحات میں اشارہ بھی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں بچوں، بچیوں کے درمیان اس طریق پر فاصلے بڑھائے جا رہے ہیں۔ ایک طبقے کو خاص حکمت عملی کے تحت تیار کیا جا رہا ہے کہ انھوں نے گویا شاہانہ طریق پر کل کلاں اس ملک پر حکومت کرنی ہے جبکہ دوسری کلاس کے بچوں نے اپنی تمام تر زندگی محکومیت اور غلامی میں بسر کرنی ہے۔ اس صدی کے ایک بہت بڑے مفکر نے لکھا کہ ''جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ اگر ہم اس کو بجنسہٖ لیکر اپنی نوخیز نسلوں میں پھیلائیں گے تو ان کو ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے۔ (سید مودودی ۱۹۸۲)

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

اب اگر غلامی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ آج کی پاکستانی نوجوان نسل (لڑکے، لڑکیاں) جو گزشتہ ۳، ۴ دہائیوں سے لے کر اب تک تعلیم گاہوں سے فارغ ہو کر نکلی ہیں وہ بے شمار استحصالوں کا شکار ہوتی رہی ہے۔ سب سے پہلے تو اس نسل کا رشتہ درجن بھر تعلیمی نظاموں کے تحت صباحی خطاب میں ''بچوں کی دعا'' جیسی

سبق آموز نظموں سے توڑا گیا جس کے ذریعے وہ اپنی عمر کے اس دس، بارہ سالہ دور میں (inspiration) لیتے تھے۔سکولوں میں دینی تعلیمات (وہ بھی انگریزی زبان میں) کا مناسب بندوبست نہ ہونے پر وہ قرآنی تعلیمات اور اس رول ماڈل سے بھی آگاہ نہ ہو سکے جس میں انھیں بتایا جاتا تھا کہ ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِؐ ہاشمی'' اور یوں انھیں ایک خلا میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا۔پسماندہ گھریلو ماحول، معاشرتی اونچ نیچ، غربت وعسرت کی زندگی، انصاف کا ہر سطح پر مذاق، رشوت اور لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری، کرپشن، امن و امان کی حالت زار اور محراب و منبر سے تفرقہ بازی پر مبنی مسلسل درس و تدریس نے اس نسل کو اس حالت تک پہنچا دیا ہے جسے اقبالؒ نے نوجوانوں کا گلا گھونٹ دینے سے تشبیہ دی اور انھوں نے اہل علم سے اپنے دلی کرب کا اظہار یوں کیا۔

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا!

یہی وہ چند وجوہات ہیں جن کی بنا پر نوجوان نسل، انگریز کے دور میں غلامی سے اتنی بری طرح متاثر نہیں ہوئی تھی جتنا کہ گزشتہ ۳۰ / ۴۰ سالوں کے ملکی و تعلیمی حالات سے ہوگئی ہے۔ایک صحیح نظامِ تعلیم کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ماضی اور حال کے تجربات کی روشنی میں مستقبل کی صورت گری کی جائے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دنیا کے ہر بڑے اور قابل ذکر نظامِ تعلیم نے ہمیشہ اس تہذیب وتمدن اور ثقافت کو پروان چڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے جس نظام میں ان کی نئی نسل نے جنم لیا ہو۔ دنیا کی ہر زندہ قوم اپنے نظامِ تعلیم کو اس طرح مرتّب کرتی ہے کہ اس سے تربیت پانے کے بعد جو نسل تیار ہو، اسے اپنے نظریے، تہذیب اور اخلاقی صفات کا حامل ہونا چاہئے جس کے لیے وہ تعلیمی نظام مرتّب کیا جاتا ہے۔ دیکھئے اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا:

سر زند از ماضئ تو حال تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

مشکن از خواہی حیات لا زوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال!

بالخصوص آخری شعر جو پیغام دے رہا ہے کہ اگر تو ایک ہمیشہ زندہ رہنے والی نسل پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کا رشتہ ماضی سے نہ کاٹ بلکہ حال اور مستقبل میں اس ماضی سے سبق حاصل کر!

اسی ضمن میں سورہ یٰسین کی آیت نمبر 9 کا ترجمہ بھی اس صورت حال پر روشنی ڈالتا ہے

وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

''ــــــ ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے، ہم نے انھیں ڈھانک دیا ہے انھیں اب کچھ نہیں سوجھتا''

سید مودودی (د 1998) نے حال اور مستقبل کی تیاری میں اپنے ماضی سے سبق نہ لینے والی قوموں کے بارے میں جس انداز میں ایک مختصر حاشیے سے اس کی وضاحت کی ہے، وہ ذیل میں درج ہے ''ایک دیوار آگے اور ایک پیچھے کھڑی کر دینے سے مراد یہ ہے کہ اس ہٹ دھرمی اور استکبار کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ نہ پچھلی تاریخ سے سبق لیتے ہیں اور نہ مستقبل کے نتائج پر غور کرتے ہیں۔ ان کے تعصّبات نے ان کو ہر طرف سے اس طرح ڈھانک لیا ہے اور ان کی غلط فہمیوں نے ان کی آنکھوں پر ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ انھیں وہ کھلے کھلے حقائق نظر نہیں آتے جو ہر سلیم الطبع اور بے تعصب انسان کو نظر آ رہے ہیں'' (حاشیہ نمبر ۷)

ہم معذرت خواہ ہیں کہ کسی حد تک جذبات کی رو میں بہہ کر اصل موضوع گفتگو سے دور ہٹ گئے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہنچی تیری جوانی تک!

امرِ واقعہ یہ ہے کہ نظامِ تعلیم کی قہر مانیوں نے ملت اسلامیہ کے دامن کو جس طرح داغدار ہی نہیں بلکہ تار تار کر دیا ہے، اس پر جس قدر آنسو بھی بہائے جا سکیں، کم ہیں ــــــ ہم اولیول، اے لیول اور اس قسم کے دیگر تعلیمی نظاموں کے تحت دی جانے والی کتب کا ذکر کر

رہے تھے۔اس ضمن میں جب ہم نے ان کتب کا جائزہ لیا جو وطن عزیز کے طول وعرض میں بچوں کو اس قسم کے تمام سکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں تو چند ایسے ہوشربا حقائق نظر آئے جن کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے۔ یادرہے کہ ایسی تمام کتب کو یہ طرۂ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہ کیمبرج، آکسفورڈ کے نصاب تعلیم کے ''عین مطابق'' مرتّب کی گئی ہیں۔اس کا پوسٹ مارٹم بھی دیکھنے کی چیز ہے!

ہم نے گزشتہ صفحات میں ان بھاری بھرکم بستوں کا ذکر کیا ہے جو پریپ سے لے کر پرائمری جماعت کے بچوں کو اٹھانا پڑتے ہیں۔ یہاں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔وہ بچے جو اولیول، اے لیول میں پڑھتے ہیں (باوجود اپنی صحت وتندرستی جو انھیں متمول بلکہ ''بہت زیادہ متمول گھرانوں'' میں متوازن غذا اور خوشگوار ماحول کی وجہ سے ملتی ہے) کی عمر ۱۳، ۱۴ تا ۱۶، ۱۷ تک ہوتی ہے۔عمر اور صحت وتندرستی کے لحاظ سے ان کا وزن اور قد کاٹھ بھی وطن عزیز کے ۹۵ فی صد بچوں کی نسبت بہتر ہوتا ہے۔**تاہم ایک ''تاجر ماہر کی نظر سے نہیں بلکہ ایک باپ۔ ''حقیقی استاذ'' کی نظر سے دیکھیں تو سوال یہ ہے کہ کیا وہ ۱۲ سے ۱۵ کلو وزن کا بستہ (بشمول کاپیاں وغیرہ) اٹھا سکتا ہے؟**

ہمارے سامنے اس وقت اولیول کی کتاب (کیمسٹری) بطور نمونہ موجود ہے۔ یہ ۴۸۵ صفحات پر محیط بڑی تقطیع کی کتاب ہے۔ یہ کتاب عمدہ قسم کے گلیزڈ (چکنے) کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔ہمارا سوال بچوں کے والدین سے یہ ہے کہ کیا کبھی انھوں نے اندازہ لگایا ہے کہ ان کا بچہ اپنے گھر میں اس بھاری بھرکم ایک کتاب کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر، گود میں رکھ کر، یا میز کرسی پر بیٹھ کر کتنی دیر تک پڑھ سکتا ہے؟ اور اس تمام مواد کو جو اس ضخیم انگریزی کتاب میں موجود ہے، کس حد تک ذہن میں محفوظ کر کے امتحانی کمرے میں لکھ سکتا ہے؟

چمکدار گلیزڈ کاغذ پر طبع شدہ کتب کے بارے میں ماہرین بصارت (Eye specialists) کا یہ کہنا ہے کہ بالخصوص ایسی کتابیں عمر کے اس حصے میں پڑھنا مناسب نہیں۔(یادرہے کہ پریپ سے لے کر اے لیول تک کی تمام کتب بیرون ملک اس طرح

کے چمکدار کاغذ پر شائع ہوتی ہیں) یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے تمام سکولوں میں بچوں کو پڑھنے یا دیکھنے (دوراورنزدیک) کی عینک کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے بہ نسبت ان بچوں کے جوسادہ کاغذ پرطبع شدہ کتابیں پڑھتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کے اشتہارات میں اس قسم کے اشتہارات نیز اس قسم کے کسی سکول کے بچوں کو جا کر دیکھا جا سکتا ہے کہ ان میں کتنے زیادہ بچوں کی تعداد عینک کا استعمال کرتے ہیں!۔◆

ہمارا ایک اورسوال اپنے قبیلے (پرنسپل، اساتذہ، ماہرین تعلیم، اوراس قسم کے تعلیمی اداروں کے مالکان، بورڈ آف گورنرز (جو بقول سپریم کورٹ ۸۰،۸۰ لاکھ روپے مشاہرہ وصول کرتے ہیں) سے ہے کہ کیا کبھی انہوں نے درج ذیل سوالات پرغور کیا ہے۔

☆۔۔۔ کیا کوئی پرنسپل، استادحلفیہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے مضمون (مثلاً اس مضمون کی کتاب جس کا ذکر چل رہا ہے) کے تمام موضوعات کوسال کے دوران تعلیم (جوگرما کی تعطیلات، ہفتہ، اتوار کی سال بھر دوچھٹیوں اور دیگر لازمی سرکاری چھٹیوں، جن کی کل تعداد ۱۸۰ بنتی ہے) سال کے بقایا ۱۸۰ دنوں میں ایمانداری کے ساتھ کما حقہ پڑھا سکتے ہیں؟ ہم اپنے مشاہدے اور ربع صدی کے یونیورسٹی میں تجربے کی بناء پر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ **اتنے صفحات پر مشتمل کتاب (ایک نہیں بلکہ متعدد مضامین) ایم ایس سی، ایم اے، ایم فل حتی کہ پی ایچ ڈی کے طلبہ بھی نہیں پڑھتے کجا کہ اولیول، اے لیول کے بچوں کو جن کی جسمانی، ذہنی نشونما بھی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہوتی وہ پڑھ سکیں۔**

☆۔۔۔ کیا بورڈ آف گورنرز، ڈائریکٹرز نے کبھی اپنے ماہانہ، سہ ماہی یا سالانہ میٹنگوں میں اساتذہ کی کارکردگی کا بےلاگ جائزہ لے کر کسی استاد کو کارکردگی کی بنیاد پر کوئی انعام دیا؟

☆۔۔۔ اسی طرح والدین کو بھی سوچنا چاہئے کہ وہ جوخطیر رقوم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پرخرچ کرر ہے ہیں، کیا بقول شاعر

◆ بچوں میں بصارت کی خرابی کے جس قدر کیسز میں اضافہ ہورہا ہے، اس کا اندازہ اس شعبے کے کسی کلینک میں جا کر بخوبی کیا جا سکتا ہے یہ امر جہاں اس قسم کی کتب کی وجہ سے ہے وہاں اس میں کمپیوٹر کے ساتھ بچوں کا بہت زیادہ انہاک بھی ذمہ دار ہے!

کچھ ہنر، کچھ سعی و کاوش اے میرے نور نظر
صرف اک پتلون کس لینے سے کام آتا نہیں؟

کیا والدین نے اس سوال پر بھی کبھی غور کیا ہے کہ ان کا بچہ مستقبل کے لیے کیوں کر اور کس طرح تیار ہو رہا ہے؟

☆ ــــ آخر ہم کسے دھوکہ دے رہے ہیں؟ کس کا مستقبل داؤ پر لگا رہے ہیں؟ ہمارے قول اور عمل کا تضاد ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟ ذرا غور سے سنئے، گھر کے کسی طاقچے، الماری میں رکھا ہوا قرآن آپ سے مخاطب ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (الصّف: ۲۔۳)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔''

اہم ترین سوال

درج بالا چند سوالات کے بعد ایک اہم ترین سوال یہ ہے کہ کیمبرج، آکسفورڈ کے نصاب کے **''عین مطابق''** کتب کی تیاری جن ''صاحبانِ علم و فضیلت'' سے کرائی جاتی ہے، ان کا اپنا ''مبلغ علم'' کیا ہے؟ ان کتب کے بیشتر مصنفین، مرتبین کے اسم ہائے گرامی کے ساتھ کبھی کسی علمی ڈگری یا تدریسی تجربہ کا ذکر نہیں ہوتا۔ اوّل تو کسی ''گورے، گوری'' کا نام ہوتا ہے جس کے بعد مزید کسی تفصیل، معلومات کی ضرورت کا مطالبہ ہی کرنا **گناہِ کبیرہ** سے کم نہیں۔ اس کے برعکس پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، فیڈرل بورڈز کی تیار کردہ، شائع شدہ تمام کتب پر مصنّفین، مرتبین نیز نظرثانی کرنے والے اصحاب و خواتین کے نام اور علمی ڈگری، تجربہ تک درج کیا جاتا ہے۔ آخر اس تفاوت کی کیا وجہ؟ انگریزی نام یا چٹی چمڑی؟

درج بالا گزارشات کی روشنی میں ہمیں یہ کہنے میں قطعاً کوئی باک نہیں کہ اردو، انگریزی کی کتب سے مواد اکٹھا کرکے، اس میں کسی قدر کتر بیونت کے ذریعے (Cut-Paste) کی مشہور زمانہ ٹیکنالوجی کے طریقے پر انگریزی زبان میں ضخیم کتب

تیار کرلی جاتی ہیں **جن میں اکثر رطب و یابس اور غیر ضروری تفصیلات کی بھر مار ہوتی ہے (کتب کے بوجھ کو بڑھانے کے لئے)**۔ ضرورت ہے کہ نوجوان نسل میں سے کسی کو یہ توفیق نصیب ہو کہ وہ مختلف کتابوں کا تفصیل سے تنقیدی جائزہ لے کر واضح کرے کہ ان کتب میں کس قدر مواد ایسا ہے جسے طالب علم کی حقیقی ضرورت قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور کتنا حصہ ایسا ہے جو زیب داستان کے لیے اضافہ کے طور پر کیا جاتا ہے تاکہ دیکھنے والے پر نفسیاتی بوجھ پڑے کہ بچے کس قدر زیادہ ''علم'' حاصل کر رہے ہیں؟

آہ وہ تیر نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

ایک مزید حقیقت جس کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ کہ اپنی تاریخ اور تہذیب کے لیے اکثر وہ حوالے دیے جاتے ہیں جو انگریز یا ہندو مصنّفین، تاریخ نویسوں نے اخذ کئے ہوتے ہیں مثلاً اورنگزیب عالمگیرؒ کا دور اگر ''سیاہ ترین'' نہیں تو تعصب کی بنا پر اس کی صفات اور خصوصیات واضح نہیں کی جاتیں۔ اسی طرح جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو غدر (Mutiny) پڑھانا معمول بہ ہے۔ آپ اپنے بچے کے سامنے اردو سن ۱۸۵۷ء کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر کیجیے۔ پھر دیکھئے وہ آپ کی طرف کن آنکھوں سے دیکھتا ہے جیسے اسے آپ کے مبلغ علم یا معلومات پر شک ہو، تاہم جب آپ انگریزی اعداد کے ساتھ اس سن کا نام لیں گے تو وہ پھر فوراً جواب دے گا ''جی ہاں Mutiny یعنی انگریزوں کی حکومت کے خلاف بغاوت!

ان تمام کوششوں (علمی بددیانتی) پر پردہ ڈالنے کے لیے نیز ملک و ملت کے نونہالوں کو اپنی تاریخ، تہذیب اور اخلاقی و علمی ورثے سے نابلد اور محروم کرنے کے لیے یہ سازش کی جاتی ہے کہ مصنفین، مرتبین کے علمی و عملی کوائف درج نہیں کئے جاتے اور صرف جلی اَلفاظ میں یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ یہ کتب **''عین بمطابق آکسفورڈ، کیمبرج نصاب تعلیم ہیں**___'' مستند ہے ''ان'' کا فرمایا ہوا!

اس ضمن میں ایک آخری بات (اگرچہ مزید بہت کچھ لکھنے، کہنے کی گنجائش کے ساتھ) یہ کہ اس قسم کے تمام سکولوں میں اردو، انگریزی خوشخط تحریر لکھنے کی جانب کوئی توجہ

نہیں دی جاتی۔ تختی اور سلیٹ پر بار بار لکھنے کا زمانہ تو شاید اب واپس نہ آئے تاہم Longman's Book کے ذریعے انگریزی عبارت تو خوشخطی کے ساتھ لکھوانے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ بھی شاید کسی طویل القامت (Long man) گورے کی کاوش تھی!◆

میٹرک اور انٹرمیڈیٹ میں سائنس کی عملی تعلیم وتربیت

قیام پاکستان کے فوراً بعد وطن عزیز کو جس مالیاتی بحران کا سامنا تھا، وہ صاحبان علم سے پوشیدہ نہیں۔ تاہم اس زمانے میں حکمران اور سیاسی طبقہ اس قدر بے ایمان، کرپٹ اور خدا خوفی کے جذبے سے تہی دست نہیں تھا۔ دسویں اور انٹرمیڈیٹ میں سائنسی مضامین (فزکس/کیمسٹری/ بائیولوجی) کے لیے نہ صرف عملی پریکٹیکل کرائے جاتے تھے بلکہ سکولوں کی لیبارٹریوں میں کیمیکلز، گلاس وئیر اور دیگر لوازمات کی اس قدر فراہمی ہوتی تھی کہ ایک ایک طالب علم اپنے ہاتھ سے عملاً تجربات کیا کرتا تھا اور یہی حال امتحانات میں ہوتا تھا کہ طلبہ سے امتحان میں عملاً کام کرایا جاتا تھا اور اس کے بارے میں طلبا تحریری طور پر امتحان بھی دیا کرتے تھے۔ المیہ یہ ہوا کہ جب سے سیاستدانوں اور حکمران طبقے نے (قریباً ۱۹۸۰ء) کے بعد تعلیم کے نام پر انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا اور سائنسی مضامین کی تعلیم بھی انگریزی میں دی جانے لگی تو پھر بقول اقبال

ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

یہاں اگر الحاد کی بجائے کرپشن کہا جائے تو بہتر ہے!

سکولوں/کالجوں میں سائنس مضامین کے لیے تجربات کی مد میں کیمیکلز/گلاس وئیر اور دیگر سہولتوں کے لئے کم سے کم بجٹ ہوتا چلا گیا اور نوبت آج ۲۰۲۰ء میں بہ اینجا رسید کہ

◆ بھلے وقتوں کی بات ہے جب، ایسی کاپیاں انگریزی خوش خطی کے لیے لکھوائی جاتی تھیں
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر!

راقم الحروف نے گزشتہ دنوں لاہور بلکہ وطن عزیز کے مشہور ترین اردو بازار میں سلیٹ/سلیٹی کی تلاش اپنی پوتی کے لئے کی تو پتہ چلا کہ ''ازمنہ قدیم'' کی یہ شے اب مارکیٹ میں نہیں ملتی!

کیماڑی سے لے کر طورخم تک شاید ہی کسی سکول/ کالج میں عملاً مختلف تجربات کرائے جاتے ہوں کہ:

دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم! ◆

اس تمام پر مستزاد یہ امر کہ نہایت اہتمام کے ساتھ پریکٹیکل کاپیاں بنوائی جاتی ہیں۔ یہ بھی از خود ایک نفع بخش پیشہ بن گیا ہے۔ اس کی تفصیل بھی دل پر ہاتھ رکھ کر سن لیجیے!

مختلف پبلشرز سکولوں کے سائنس ٹیچر/ ہیڈ ماسٹر/ پرنسپل کے ساتھ (براہِ راست یا اپنے گماشتوں/ سکول کلریکل سٹاف) کی معرفت سودا طے کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے سکولوں میں انہی پبلشرز کی عام کاپیاں نیز سائنس پریکٹیکل کی کاپیاں (نیز یونیفارم وغیرہ بھی) بہت مہنگے داموں (۵۰۰ سے ایک ہزار فی مضمون) خریدنے پر طلبہ کو مجبور کرتے ہیں۔ پھر بغیر عملاً تجربہ کرائے، طلبا، کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ فرضی طور پر کاپیاں تیار کریں اور امتحان میں وہ کاپیاں ممتحن کو دکھا کر بغیر کسی عملی امتحان یا تجربہ کیے سوال جواب نیز کاپی کی بناوٹ/ سجاوٹ/ کاغذ اور پرنٹنگ وغیرہ کا لحاظ کرتے ہوئے بیس میں اکثر بیشتر ۱۹ نمبر دلائے جاتے ہیں۔

درج بالا صورت حال کے ذمہ دار وہ تمام سائنس ٹیچرز/ ہیڈ ماسٹر/ پرنسپل ہیں جن کی زیر سرپرستی یہ تمام مہماتِ سرانجام پاتے ہیں۔ اساتذہ کے بارے میں تو کیا کہا جائے کہ علامہ اقبال ان کے بارے میں جو کچھ کہہ گئے، اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تاہم ہمیں بہت زیادہ فکر اَور تشویش اُن شاہین بچوں کی ہے جنہیں ابتدائے زندگی سے ہی خاکبازی کا سبق سکھایا جارہا ہے۔

اس تمام تر حکایت کا نکتہ عروج (Climax) یہ ہے کہ بعد از امتحان یہی کاپیاں شہروں میں Old Book Shops پر بکنے اور اگلے سال غریب طلبا کو سستے داموں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ اور یوں اساتذہ کو ان کی فروخت سے ''معقول آمدنی'' بھی ہو جاتی ہے!

◆ تعلیمی فنڈز تو چلے جاتے ہیں سوئٹزرلینڈ اور یورپی بنکوں میں، قوم کے نونہال اگر ہاتھ سے کام نہیں کر سکتے تو کون سے آئین سٹائن بن جائیں گے؟

مرید سادہ تو رو رو کے ہوگیا تائب
خدا کرے کہ ملے شیخ کو بھی یہ توفیق؟

ہم نے یہ تمام تر صورت حال اپنے دل پر بہت جبر کر کے تحریر کی ہے۔ اگر ہماری اس تحریر سے کسی ایک فرد (پرنسپل/ ہیڈ ماسٹر/ ٹیچر) کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہو جائے اور وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں غریب والدین اور یوں ان کے بچوں کے لیے مالی طور پر کسی قسم کی آسانی پیدا کر سکیں تو یہ نہ صرف ملک وملت کے لیے ایک بہت بڑی سعادت ہوگی بلکہ شاید آخرت میں ان تمام اساتذہ کے لیے مغفرت کا سبب بھی بن سکے!

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

یاد رہے کہ اسی قسم کی ایک نادر مثال پراسپکٹس کی فروخت کے سلسلے میں یونیورسٹیوں میں کی جاتی ہے۔ تفصیل اگلے صفحات میں آرہی ہے!

پروفیشنل تعلیم

وطن عزیز میں گزشتہ دو تین دہائیوں میں تھوک کے حساب سے وٹرنری سائنس کے کالج/ یونیورسٹیاں/ لاہور میں موجود دو (پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر ایک ایک میں) کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فیصل آباد، جھنگ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی اس پروفیشن کے ادارے کام کر رہے ہیں۔ بہاولپور، ملتان میں بھی اس پروفیشن کی فیکلٹیاں کام کر رہی ہیں۔ سندھ (بالخصوص کراچی) نیز ڈیرہ اسمٰعیل خان، پشاور میں جو کالج/ یونیورسٹیاں اس شعبے سے متعلق ہیں، ان تمام میں کلینک نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ کسی زمانے میں لاہور میں کالج آف اینمل ہسبنڈری (بعد ازاں کالج آف وٹرنری سائنس) ◆ میں بھینسوں/ گائیوں، گھوڑوں/ خچروں، بھیڑ/ بکریوں، پولٹری اور کتوں کے علیحدہ علیحدہ کلینک کام کرتے تھے جس میں سینئر پروفیسرز صبح آٹھ بجے سے ۱۲ بجے تک اور بعد ازاں چوبیس گھنٹے شعبہ میڈیسن/ سرجری کھلا رہتا تھا۔ جس میں سینئر طلبا (تیسرے اور چوتھے سال) دن رات ڈیوٹی پر موجود رہتے تھے۔ جب سے ان بڑے شہروں سے جانوروں کو باہر نکالنے کی مہم

◆ حالیہ یونیورسٹی آف وٹرنری اینڈ اینمیل سائنسز (UVAS)

شروع ہوئی ہے، تب سے ان شعبوں میں جانور نہ آنے کی بناء پر عملاً ان شعبہ جات کا وجود ختم ہو کر رہ گیا ہے **اور اب صورت حال یہ ہے کہ طلبا/ طالبات کو ڈاکٹر آف وٹرنری میڈیسن نامی ڈگری نظری طور پر دی جاتی ہے جبکہ کلینکس میں جو تجربہ وہ دوسرے سال سے لے کر پانچویں سال تک جانوروں کا عملاً علاج معالجہ/سرجری کر کے کیا کرتے تھے وہ سہولت اب کہیں بھی موجود نہیں!**

میڈیکل تعلیم

یہی حال تقریباً میڈیکل کالجز میں تعلیم کا بھی ہے، جو تھوک کے حساب سے ڈاکٹر بنا رہے ہیں۔ وہاں بھی تربیت کے لیے کلینیکل میڈیسن اور سرجری کے شعبہ جات میں تربیت کا جو انتظام ہوا کرتا تھا، وہ اب پروفیسر صاحبان کی عدم توجہ یا سٹاف کی کمی کی بناء پر رسمی انداز کا رہ گیا ہے۔ جب سے لاکھوں روپے خرچ کر کے پرائیویٹ میڈیکل کالجوں/ یونیورسٹیوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، پیشہ ورانہ تعلیمی نظام ہی نہیں بلکہ دیگر تعلیمی شعبوں کا نظام تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کی انتہا یہ ہے کہ ایک میڈیکل ڈاکٹر ایمرجنسی حالت میں کسی مریض (بالخصوص بچے کو) انٹراوینس (Intravenous) انجکشن نہیں لگا سکتا اور وہ سٹاف نرس کا انتظار کرتا ہے

تا تریاق از عراق آوردہ شود
مار گزیدہ مردہ شود!

''جب تک کہ عراق سے تریاق زہر کا حصول ہو، اس سے پہلے سانپ کا کاٹا ہوا شخص مر جاتا ہے؟''

گھوسٹ سکول اور بعد ازاں یونیورسٹیوں میں گھوسٹ کلاسز

ایک زمانے میں وطن عزیز کے مختلف صوبوں میں گھوسٹ سکولوں کا انکشاف ہوا تھا۔ یہ وہ سکول تھے جو پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے مختلف ادوار میں کھولے گئے تھے۔ حکومت نے مختلف دیہی علاقوں میں بالخصوص سکولوں کی عمارت بنا دی تھیں لیکن ان پر عملاً قبضہ علاقے کے ایم این اے/ ایم پی اے کا تھا اور وہ ان وڈیروں/ چوہدریوں/ سرداروں/ خوانین کے ڈیروں کے طور پر کام آتے تھے۔ ان سکولوں میں عملاً تعلیم کا کام نہیں ہوتا تھا اکثر و بیشتر ان

سکولوں کی عمارتوں میں بڑے لوگوں کے جانور بندھا کرتے تھے۔ تاہم اساتذہ کے فرضی ناموں سے لاکھوں/کروڑوں روپے ماہانہ تنخواہ اساتذہ و دیگر عملے کی مد میں وصول کیے جاتے تھے۔۔۔۔۔اگرچہ بعد میں جب یہ تمام منظر نامہ سامنے آیا تو اس پر یہاں ہم ایک صاحب دل ماہر تعلیم کی تحریر (ریاض احمد ۲۰۱۳) سے درج ذیل اقتباس پیش کرنا چاہیں گے جو ملکی تعلیمی نظام میں اس قسم کے سکولوں کے بارے میں سپریم کورٹ کے معزز اور فاضل جج صاحبان نے ''بے قرار'' ہو کر محکمہ تعلیم کے افسران سے استفسار کرتے ہوئے درج ذیل سوالات کیے۔

کیا وہ نہیں جانتے کہ ملک بھر میں سرکاری سکولوں کی حالت کس قدر دگرگوں ہے؟ یا (یہ سکول) وڈیروں، جاگیرداروں اور با اثر لوگوں کے ڈیروں، بیٹھکوں اور جانوروں کے باڑوں کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں؟ کیا ہزاروں کی تعداد میں گھوسٹ سکول ملک کے طول و عرض میں موجود نہیں؟

یہ اور اس قسم کے سوالات کے بعد فاضل جج صاحبان نے کہا:

> **''یہ سب کچھ نہیں چل سکتا کیونکہ یہ عوام الناس کے بچوں پر تعلیم کے دروازے بند کرنے کی گھناؤنی سازش ہے۔ تعلیم ان کا آئینی حق ہے جس سے انھیں محروم کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔''**

سپریم کورٹ کے معزز جج صاحبان کے ان دردمندانہ ریمارکس کا **جو حشر**، وطن عزیز کے ''وڈیروں اور قبضہ گروپ سابق حکمرانوں'' نیز وزیر تعلیم، محکمہ تعلیم کے سیکرٹری و دیگر افسران نے کیا، اس کا ٹریلر گھوسٹ کلاسز کی شکل میں ملاحظہ ہو۔

اس ضمن میں میڈیا میں بہت کچھ سوال و جواب ہوئے تاہم عملاً یہ سلسلہ نہ صرف مکمل طور پر بند نہیں ہوا بلکہ بہت بڑے پیمانے پر پبلک یونورسٹیوں میں رائج ہو گیا اور ہائر کمیشن کے تحت ماہانہ کروڑوں روپے کی گرانٹ/ فنڈز ہڑپ کیے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے علم میں یہ بات ہے یا نہیں تاہم جس بڑے پیمانے پر وطن عزیز میں گزشتہ ۳/ ۴ دہائیوں میں کرپشن اور بے ایمانی کو فروغ حاصل ہوا ہے، اس کے پیش نظر یہ امر باعث حیرت نہ ہو کہ اس میں کمیشن کے اہل کار بھی شامل ہوں۔ تاہم اگر کمیشن کے علم

میں ایہ امر نہیں تو مزید قابل افسوس بات ہے **ان کی بھی تعلیم کے لیے راہ نمائی اور اس کی Monitoring and Evaluation کی کارکردگی پر!**

صورت حال یوں ہے کہ یونیورسٹیوں میں مختلف مضامین میں فیل ہو جانے والے طلبہ، بعد میں وہی کورس دوبارہ پڑھنے کے لیے رجسٹر کرا لیتے ہیں۔ شعبہ کے سینئر پروفیسر (چیئرمین/ ڈین) وہ کورس کسی منظور نظر کو شام کی کلاسز میں دیدیتے ہیں۔ اس طرح اس مضمون کی دوبارہ کلاسز نہیں ہوتیں تاہم کسی اور (جعلی نام) یا دوسرے سٹاف کے نام پر پڑھائے جانے والے پیریڈ کی تعداد کے حساب سے ہزاروں روپے کا چیک بن جاتا ہے جو ان کے بنک اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں وہ منظور نظر فرد ان سے نقد رقم وصول کر لیتا ہے۔ اب اس میں سینئر پروفیسرز/ ڈین کا کس قدر حصہ ہوتا ہے؟ یا چند لوگ اس رقم کو خوانِ یغما سمجھ کر کھا لیتے ہیں جبکہ بھرم رکھنے کی خاطر ان طلبہ کا مڈٹرم امتحان بھی اکثر اوقات فائنل امتحان کے ساتھ ہی ضم کر دیا جاتا ہے۔ **ایسے معاملات میں سو فی صد نتیجہ اور A گریڈ کا حصول گویا طلبہ کا جائز حق ہوتا ہے۔** دلچسپ امر یہ ہے کہ ہر سہ/ چہار فریقوں میں سے کسی نے آج تک اس امر کی منہ بھاپ تک بھی نہیں نکالی! ہمیں یقین ہے کہ اگر HEC اس ضمن میں تمام صوبوں کی پبلک یونیورسٹیوں میں سے صرف کسی **ایک کا احتساب بھی کسی ایماندار شخص سے کرائے** ◆ تو بہت زیادہ حیرت ناک انکشافات ہو سکتے ہیں اور شاید کروڑوں روپے کی خورد برد کی بچت بھی ہو جائے—— ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے بارے میں مزید گفتگو آئندہ صفحات میں آ رہی ہے۔

درج بالا صفحات میں ہم نے جن تلخ حقائق کا ذکر کیا ہے، اگر چہ بظاہر یہ تمام تر صورت حال بہت ہی مایوس کن نظر آ رہی ہے جس سے تمام اساتذہ برادری کے بارے میں ایک بہت ہی مایوس کن تاثر ذہن میں آتا ہے۔ (اگر چہ ہماری ایماندارانہ رائے میں وطن عزیز، کرپشن، بدعنوانی اور اخلاق باختگی کے جس طوفان میں گزشتہ نصف سے دو چار ہے، اس

◆ کہ یہ جنس بھی اب وطن عزیز میں تو شاید نہیں پائی جاتی البتہ بین الاقوامی پیمانے پر ایسی ''کمپنیاں'' موجود ہیں جو ملک کی وزیر اعظم کے قتل کی ذمہ داری بھی ''حکمران طبقے'' کی مرضی ومنشاء کے مطابق دے دیتی ہیں!

میں استاد کی کرپشن اور نا اہلی کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے) تاہم برائی کے اس بڑے سمندر میں چند جزیرے ایسے اساتذہ کرام کے بھی ہیں جنہوں نے تعلیم وتدریس اور تحقیق کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا ہوا ہے۔ بلکہ ایسے اساتذہ نے نہ صرف اپنے کیرئیر کے اوقاتِ کار میں کالج/ یونیورسٹی میں حتیٰ کہ گھریلو اوقات میں بھی راہ نمائی کرتے رہے ہیں۔ ایسے اساتذہ کرام کے بارے میں بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے۔

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کہ ایں قوم
شاہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند!

''فقیروں کے بھیس میں ان عشاقان علم وعمل کو حقارت کے ساتھ مت دیکھو
کہ یہ ایسے بادشاہ ہیں جن کی کوئی مملکت/ ریاست نہیں اور جن کے سروں پر
کوئی تاج یا زرق برق کلہ بھی نہیں'' (تاہم وہ دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں)

اور ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ وطن عزیز کو گزشتہ نصف صدی کے تعلیمی اور اخلاقی بحران سے نجات دلانے اور ملک وملت کو اس نصب العین سے کامیابی سے ہمکنار کرنے نیز امت مسلمہ کو اس مقصد وحید کے حصول تک پہنچانے میں بھی اس قسم کے اساتذہ کرام کا کردار ہی مددگار ہوگا جسے قرآن کریم نے امت مسلمہ کا مقصد وجود قرار دیا ہے۔

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ (آلِ عمران: ۱۰۴)

''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔''

ہم اپنی اس خواہش کا اختتام اس شعر پر کرتے ہیں کہ ایسے اساتذہ کرام ہی کے ہاتھوں ملت اسلامیہ کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے

از صد سخن پیرم، یک حرف مرا یاد است
عالم نہ شود ویراں تامیکدہ آباد است!

''مجھے اپنے پیر کی سو باتوں میں سے صرف ایک بات ہی یاد رہ گئی ہے کہ یہ دنیا
اس وقت تک ویران نہ ہوگی جب تک کہ علمی میکدے آباد ہیں''

باب چہارم

کالج/یونیوسٹی ہائرایجوکیشن

طلبہ کی اخلاقی حالت: ایک عمومی جائزہ

گزشتہ صفحات میں ہم نے سرمۂ افرنگ سے بہرہ مند آنکھ کی نمنا کی سے محرومی اور ''پرکاری وسخن سازی'' کی جانب اشارہ کیا ہے۔۔۔۔۔یونیورسٹی میں ہائیرایجوکیشن (بی اے، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی بلکہ پوسٹ ڈاکٹریٹ) کے مرحلے تک پہنچتے پہنچتے نسلِ نو اس حد تک پُرکار اور سخن ساز ہوجاتی ہے کہ وہ اساتذہ کے ابرو کے اشاروں کو بہت خوبی سے سمجھتے اور اس کے مطابق عملاً صلاحیتوں سے بہرہ مند بھی ہیں۔۔۔۔۔استعارے کی زبان کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ کہنا زیادہ اہم ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے **'مزاج شناس'** ہوجاتے ہیں۔ دراصل موجودہ دور میں ایک ''غیر تحریری معاہدہ'' ہر دو فریقین (اساتذہ اور طلبہ) کے درمیان وجود میں آچکا ہے۔ ربع صدی کے اپنے تدریسی تجربے کی بنا پر علی وجہ البصیرت ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اس معاہدے میں اساتذہ کو دھوکہ دیا جاتا ہے یا وہ خود دھوکے میں آنا چاہتے ہیں۔ ہر دو صورتوں میں ''فریقین'' کا بھلا ہوتا ہے۔ یہ صورت کچھ یوں واقع ہوتی ہے کہ فریق اوّل (طلبہ) پروفیسر کے کمرۂ تدریس میں داخل ہوتے ہی ایک دل پذیر مسکراہٹ کے ساتھ ان کا کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے ابھی ان مسکراہٹوں کو قبول ہی کیا ہوتا ہے کہ ایک جانب سے آواز آتی ہے کہ ''سر آپ کو عالمی نوبل پرائیز کمیٹی نے کس طرح اپنے مضمون (مثلاً فزکس وغیرہ) میں اعلیٰ مہارت کے باوجود حالیہ سال میں پرائز نہیں دیا؟'' دوسری جانب سے آواز آتی ہے کہ ''قابل ترین مسلمان اساتذہ، محققین کو کس طرح یہ پرائز مل سکتا ہے، وہاں تو یہودی، ہندو لابی کام کرتی ہے''!۔۔۔۔۔یوں پیریڈ کا کم از کم ۱۵، ۲۰ منٹ وقت ختم ہوجاتا ہے۔اب پروفیسر صاحب،

طلبہ کو قطرے سے گہر ہونے تک کی تمام تر داستان نہایت لطف لے کر سناتے ہیں۔ اِدھر اُدھر سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے بھی برستے رہتے ہیں۔ اور یوں پیریڈ کا اختتام ہو جاتا ہے۔

حیف در چشم زدن، صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ ندیدم زبہار آخر شد!

''افسوس کہ دوست کے ساتھ ملاقات اس قدر جلد ختم ہوگئی کہ ابھی پھولوں کی خوشبو نے باغ کی سیر بھی نہ کی تھی کہ موسم بہار ختم ہوگیا۔''

اسی طرح کسی دوسرے دن کلاس میں داخلے کے ساتھ ہی پروفیسر صاحب کا کلرک یا دفتری کلاس میں آکر پروفیسر صاحب کے کان میں کوئی ''اہم پیغام'' دیتا ہے۔ اور پروفیسر صاحب اس پر ایک مصنوعی غصے کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ڈین، رجسٹرار وغیرہ کو بھی عین پیریڈ کے وقت ہی میٹنگز کرنی ہوتی ہیں۔ نمعلوم ان میٹنگز سے کب چھٹکارہ نصیب ہوگا؟ ـــــ یوں وہ اس ''عظیم مہم'' پر روانہ ہو جاتے ہیں کیوں کہ کلاس پڑھانے کے لیے پورا سمسٹر پڑا ہوتا ہے! ـــــ کہا جاسکتا ہے کہ کلاس کو پڑھانا اور تحقیقی کاموں کے لیے طلبہ، طالبات کی راہ نمائی کرنا تو گویا ایسا کام ہے جو ان کے لیے بنا ہی نہیں۔ وہ تو اپنی سلیکشن کے فوراً بعد پنشن ہی وصول کرنا شروع کر دیتے ہیں جب کہ ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم تو اس ''احسان عظیم'' کا معاوضہ ہوتا ہے جو انہوں نے خدمت ملک وملت کی سرانجام دہی میں کی ہوتی ہے!

یہاں ہم اس موضوع پر درجنوں واقعات درج کر سکتے ہیں لیکن بطور نمونہ دو ہی کافی ہیں ـــــ اگر پروفیسر صاحب نے اپنے زمانہ طالب علمی میں سرسید احمد خان کا مضمون ''خوشامد'' میٹرک یا انٹرمیڈیٹ میں پڑھا ہوتا تو انھیں یاد رہتا کہ سرسید نے دل کے امراض میں خوشامد کو مہلک ترین مرض قرار دیا تھا۔ اسی طرح اگر انھوں نے کلام اقبال میں ''مکڑا اور مکھی'' نامی نظم بھی پڑھی ہوتی تو وہ طلبہ کی اس قسم کی چاپلوسی کا شکار نہ ہوتے جو اس فن سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں ہائیر ایجوکیشن کے نام پر ملک و ملت کے ساتھ جو **''کاروباری دھوکہ''** کیا جا رہا ہے، اس کا آغاز صبح، وقت مقررہ سے کم از کم ایک گھنٹہ تاخیر سے ہوتا ہے کہ سینئر پروفیسر، ڈین تاخیر سے یونیورسٹی آتے ہیں۔ کسی زمانے میں سینئر اساتذہ اپنی کلاسز کا پہلا یا دوسرا پیریڈ رکھتے تھے تاکہ مختلف میٹنگز کی وجہ سے تعلیم و تدریس کا ہرج واقع نہ ہو۔ اب جبکہ یادوں کا سلسلہ چل ہی نکلا ہے تو پھر ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۰ء کے زمانہ طالب علمی کی یاد بھی ذہن میں تازہ ہوگئی۔ کالج کے سالانہ فنکشن کے بعد، طلبہ کی جانب سے ۳ روزہ چھٹی کا مطالبہ اور پرنسپل صاحب کی طرف سے چھٹی کے لیے ایک انگلی کا اشارہ ایک بہت دلچسپ صورت ہوتی تھی۔ بہر حال معاملہ دو یوم پر طے ہوتا تھا ___ ادھر ایک سفید ریش بوڑھے پروفیسر کے منہ سے ایک دلدوز آواز نکلی ''آہ میرے دو پیریڈ ضائع ہوگئے''

اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر!

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ''قنوطیت'' ہے اور صاحب تحریر کو بے جا شکوہ ہے۔ یہاں ہم اس امر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ ہر شخص کو حق ہے جو رائے وہ رکھنا چاہے ضرور رکھے۔ **تاہم امر واقعہ یہ ہے کہ بقول فیض ہم یہ سطور خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بیس سال بعد یہ تمام امور نوک قلم پر لانے کی ضرورت اس لیے یہ امر مجبوری کی ہے** کہ ملتِ اسلامیہ پاکستان بالخصوص اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑی ہے کہ ایک طرف وطنِ عزیز کے خلاف شر کی تمام الحادی طاقتیں، پاکستان کو جغرافیے کے نقشے سے مٹانے اور اسے ایک قصہ پارینہ بنانے کے مشن میں اپنے تمام تر وسائل استعمال کر رہی ہیں جبکہ دوسری جانب عوام الناس کو ۷۰ سال کی غفلت اور مجرمانہ کوتاہی کے باوجود، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک بار دوبارہ موقع دیا ہے کہ وہ اللہ کے دامن رحمت میں پناہ لینے کی خاطر اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن تھام لیں!

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونہ رسیدی، تمام بولہبی است

تاہم ایسا نہ کرنے کی صورت میں فطرت کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
ولے کرتی نہیں، ملت کے گناہوں کو معاف

یاد رہے کہ اسلام (بطور روایتی مذہب) کے نام پر گمراہی کا ایک وسیع وعریض جال ہے جو نام نہاد پیر، فقیر، مولوی نے گزشتہ چند صدیوں سے پھیلایا ہوا ہے۔ **انھوں نے لوگوں کو اس امر سے گمراہ کر دیا ہے کہ تمہارا کام صرف نماز، زکوٰۃ، حج کی پابندی کرنا اور ہمارے لیے نذر و نیاز،** تمھارے لیے آخرت میں نجات کے لیے کافی ہے تاہم جہاں کہیں ضرورت ہوئی تو اللہ کے یہ منظورِ نظر بندے سفارش کے ذریعے معافی دلا دیں گے۔ اس جال ہمہ رنگ زمین میں کیا جرنیل، بیوروکریٹ، کیا سیاستدان، تعلیم یافتہ، ان پڑھ، غریب و امیر سب لوگ بری طرح سے جکڑے ہوئے ہیں۔ **ان تمام نام نہاد مذہبی لیڈروں کا سحر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ کسی کو بھی اپنے طور پر قرآن وحدیث اور سیرتِ رسول ﷺ پڑھنے اور سمجھنے کا موقع نہیں ملتا۔** زمینی حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت شاید کسی میں بھی نہیں ہوتی!

حقیقت یہ ہے کہ امتِ مسلمہ اس مقصدِ عظیم کو اپنی نظروں سے اوجھل کر چکی ہے جس کے لیے بنی اسرائیل (یہود) کی معزولی کے بعد نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت ہوئی اور امتِ مسلمہ کو آخری امت کے طور پر دنیا میں آخرت تک کے لیے اس دنیا میں شریعت مطہرہ کے نفاذ کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ (اس ضمن میں ہماری ایک کتاب حال ہی میں اس موضوع پر شائع ہوئی ہے (محمد آفتاب اور ام انس ۲۰۲۰) کہ بنی اسرائیل کی بطور امت مسلمہ معزولی کیوں ہوئی)۔ (البقرہ ۲:۱۲۸، آل عمران: ۱۱۰)

ضرورت تو یہ تھی کہ پرائمری سے لے کر ہائی سکول، انٹرمیڈیٹ تک بچوں کو توحید ورسالت اور آخرت کے مضمرات سے آگاہ کیا جاتا تاکہ کالج اور یونیورسٹی میں ہائیر ایجوکیشن تک ان تمام تصورات سے نوجوان نسل آگاہ ہوتی اور یوں وہ زمانہ حاضر میں بولہب (الحاد) کے مقابلے میں حیدرِ کرارؓ (اسلام) کے علمبردار بنتے!

بولہب را حیدرِ کرارؓ کن!

اس موضوع کا آغاز کرتے ہوئے ہم نے نوجوان نسل کی ''پرکاری اور سخن سازی'' کا ذکر کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ فی زمانہ مصلحت کوشی، مکاری اور فریب نیز تعلیمی امور میں غفلت ہی نہیں بلکہ مداہنت، نتیجہ ہے ان تمام اخلاقی تعلیمات سے عاری ہونے کا جن سے پرہیز کرنے بلکہ بغاوت کرنے کا سبق علامہ اقبالؒ اور دیگر زعمائے ملت نے گزشتہ دو تین صدیوں میں مسلم نوجوان نسل کو دیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کا مقصد وحید اور اس کے حصول کے لیے تگ ودو کے بارے میں علامہؒ نے محراب گل افغان نامی نظم میں کیا خوب کہا:

یہ مدرسہ، یہ کھیل، یہ غوغائے روا رو
اس عیش فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو
وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو
ناداں! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسباب ہنر کے لیے لازم ہے تگ و دو!

یہاں ملاحظہ فرمائیں کہ نوجوانی میں تعلیمی دور کے مختلف مشاغل میں مشغولیت اور انہماک کے دوران نوجوان نسل کو آنے والے عملی زندگی کے دور میں **''ہر لحظہ غمِ نو''** سے کس خوبصورت انداز میں آگاہ کیا گیا ہے۔ مزید اگر تعلیم جدید (یا دینی تعلیم) کا حصول صرف معاش یعنی چند کفِ جو کا حصول ہی ہو تو اسے آزاد لوگوں کے لیے زہر سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ تیسرے شعر میں اقبال، جو خود بھی علم اور ادب کے بہت بڑے شناور تھے، اس فلسفے اور ادب کی نفی کرتے ہوئے نوجوان نسل کو ''اسبابِ ہنر'' یعنی علوم کے اعلیٰ ترین مقام حاصل کرنے کے لیے تگ ودو کرنے کی تلقین کر رہے ہیں ـــــ یاد رہے کہ علامہ اقبالؒ علوم و فنون، سائنسی علوم کے بارے میں جو ذہن رکھتے تھے، اس کا ڈھانچہ اور بنیادی خدوخال ''علمِ نافع'' کی اس دعا سے ماخوذ ہیں جو رسول اکرم ﷺ نے امت کو سکھائی ہے۔ (محمد آفتاب خان/ ڈاکٹر اسماء آفتاب ۲۰۱۷ء)

ایک اسلامی مملکت میں بالخصوص ہائیر ایجوکیشن کا مقصدِ اولین نوجوان نسل کے ذہن

میں نزولِ کتاب (قرآن کریم) کے اس مفہوم کو واضح کرنا ہوتا ہے جسے وہ سیرتِ رسولؐ کے آئینے میں دیکھ کر اس مشن کے لیے اپنی زندگی وقف کر دے جسے گزشتہ سطور میں درج آیاتِ قرآنی میں امتِ مسلمہ کا مقصدِ وحید بتایا گیا ہے۔ دیکھئے علامہؒ نے ان آیاتِ قرآنی کو کس فصاحت و بلاغت سے امتِ مسلمہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

افرنگ زخود بے خبرت کرد و گرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری! ◆

''اے بندۂ مومن تجھے بشیر اور نذیر بنایا گیا تھا، لیکن تجھے فرنگی تعلیم اور تہذیب نے اپنی اس حیثیت سے بے خبر کر دیا ہے!''

اس طرح ایک دوسری جگہ امت کو یاد دلایا۔

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی!

''مغرب نے الہامی ہدایت سے بے گانگی اختیار کر لی ہے جب کہ اہلیانِ مشرق نے اوہام وخرافات کا ایک جال اپنے گرد بن لیا ہے۔ ایسے عالم میں ضرورت ہے کہ امت مسلمہ دین کی توسیع و اشاعت کا جھنڈا بلند کرے۔''

اعلیٰ تعلیم کا مقصد، جو فی زمانہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے دنیوی فوائد کا حصول ہے، اس پر مستزاد یہ کہ وہ بھی کرپشن کے ذریعے۔ علامہ نے اس پر تڑپ کر کیا کہا:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے **فکرِ معاش**
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی، موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش!

◆ درج بالا ہر دو اشعار میں جس خوبصورتی کے ساتھ ''بشیر اور نذیر'' کی قرآنی اصطلاحات کو استعمال کرتے ہوئے امت کو ''نقش دگر'' کے قائم کرنے کے جس تصور کو پیش کیا گیا ہے، اس کی خوبصورتی اور حسن کی داد نہ دینا، زیادتی ہوگی۔

ان اشعار میں علامہ اقبالؒ نے وہ تمام نقائص اور عیوب نیز ان تمام کمزوریوں کی نشان دہی بہترین انداز میں کر دی ہے جو نوجوان نسل میں ''نام نہاد ہائر ایجوکیشن'' نے ان کے اندر پیدا کر دی ہیں۔ تاہم **''فکر معاش''** جو موجودہ ہائر ایجوکیشن کا مقصدِ اولین ہے اور ''حریفانہ کشاکش'' سے دل لرزنے کی کیفیت تو اس قدر قبیح ہے کہ علامہؒ نے انھیں ''روح قبض'' کرنا اور ''موت'' سے تشبیہ دی ہے کہ ان کے لیے اس سے موزوں تر اَلفاظ تلاش کرنے ممکن نہیں!

تعلیم اور تحقیق کا معیار

وطنِ عزیز کی تمام یونیورسٹیوں میں تعلیم وتدریس اور تحقیق کے بارے میں بھی بہت مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ اوّل تو کسی یونیورسٹی نے اپنے لیے کوئی واضح اور متعین اہداف مقرر نہیں کئے کہ وہ کن مضامین (سائنسی، ادب، فنون اور پیشہ ورو غیرہ) کے لیے معرضِ وجود میں آئی ہیں، جو کچھ لکھا اور کہا جاتا ہے، وہ محض اَلفاظ اور ان کی جادوگری ہوتی ہے۔ پھر کیا ان اہداف کے مطابق کام ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کا تو کسی کو خیال ہی نہیں۔ ڈھیروں یونیوسٹیوں کے باوجود قومی اور ملکی مسائل کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ کسی مضمون، موضوع کے بیشتر پہلوؤں پر کام ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں، کسی ایک مسئلے کا حل تلاش کیا جاچکا ہے اور جس کی وجہ سے وطن عزیز میں کسی صنعت وحرفت، پیداوار اور آمدنی میں اضافہ ہوا ہے؟

ایمانداری کے ساتھ اس امر کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے ہر دو فریق یعنی یونیورسٹی استاد، اور طلبہ ذمہ دار ہیں نیز اس میں ہائیر ایجوکیشن کمیشن کا بھی ایک کردار ہے جس کے بارے میں گفتگو آئندہ صفحات میں آ رہی ہے جو یونیورسٹی سطح پر تحقیقی معیار کے پرکھنے، جانچنے (Evaluation and Monitering) کے نظام کے ذمہ دار ہیں۔ آیئے اس پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

اخلاقی تربیت سے بے بہرہ سینئر اساتذہ (چیئرمین شعبہ، پروفیسر، ڈین حتیٰ کہ وائس

چانسلرز) ◆ کی ایک کثیر تعداد کو تعلیم و تدریس اور تحقیقی کاموں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کا بیشتر وقت یونیورسٹی میں کھانے پینے، سیاست اور جوڑ توڑ کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ دفتری اوقات کی پابندی ان میں سے بیشتر لوگ نہیں کرتے۔ دس بجے کے بعد محکموں میں چائے کا وقت ہو جاتا ہے، وہاں سے فارغ ہو کر پروفیسر، وائس چانسلر، ڈین، رجسٹرار اور خازن (ٹریژر) کو "سلام" کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ وہاں سے واپسی ۱۲ بجے تک ہوتی ہے۔ اس دوران جونیئر اساتذہ یا اسسٹنٹ پروفیسر ان کی جگہ کلاسز لیتے ہیں۔ جہاں تک سائنسی علوم کا تعلق ہے تو بعد از دوپہر ریسرچ، پریکٹیکل کام کی نگرانی بھی یہی جونیئر اساتذہ سرانجام دیتے ہیں (اپنی برادری، علاقے، زبان بولنے والے اس قسم کے جونیئرز کی بھرتی بھی اسی لیے کی جاتی ہے کہ وہ ان کے اشارہ ابرو پر سب کچھ، جائز و ناجائز کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں)۔ ان جونیئر اساتذہ کو خود بھی تدریس، تحقیق یا تھیسیس لکھوانے کا تجربہ نہیں ہوتا تو پھر وہ طلبہ کو حیلے بہانے زچ کرتے ہیں۔ یونیورسٹی سطح پر ہائیر ایجوکیشن میں ایک اور بہت ہی "انوکھا تجربہ" یہ کیا جاتا ہے کہ طلبہ کو M.Phil,M.sc کے فوراً بعد انھیں بطور لیکچرار بھرتی کر لیا جاتا ہے جبکہ تعلیم و تدریس کا انھیں کوئی تجربہ نہیں ہوتا **اس کے برعکس، پرائمری سے لے کر دسویں تک کے طلبہ کو سکولوں میں تعلیم دینے کے لیے ٹریننگ (بی ایڈ، ایم ایڈ) کی پابندی ہے۔** ضرورت ہے کہ یونیورسٹی سطح پر بھی اس قسم کی ٹریننگ کا اہتمام کیا جائے (چند مزید گزارشات آئندہ صفحات میں آ رہی ہیں)

تحقیق اور مقالہ جات لکھنے کے لیے لائبریری جا کر مواد کی تلاش (اگرچہ انٹرنیٹ نے کافی حد تک یہ کام آسان کر دیا ہے) سے مفر نہیں۔ کتب اور پرانے سائنسی و دیگر علمی و ادبی مجلّات (Journals) تو اب شاید ہی کسی یونیورسٹی میں محفوظ ہوں گے۔ ۱۹۸۰ء سے قبل کمپیوٹر عام نہیں ہوتے تھے تو راقم الحروف کا یہ ذاتی مشاہدہ ہے کہ یونیورسٹی کے

◆ ایسے ایسے صاحبان اس عہدے پر آج بھی براجمان ہیں جو "قوالی" اور گانے بجانے کی محفلیں سجانے میں ایک نام رکھتے ہیں۔ بمقابلہ اس مثال کے جو اس کتاب کے آغاز میں مختلف وائس چانسلر اصحاب کے نام کے ساتھ زیر بحث آئے ہیں!

۴۵۰-اساتذہ میں سے شاید ہی کسی سینئر استاد کو لائبریری میں بیٹھے دیکھا ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے جونیئرز یا طلبہ کے ذریعے نقل کردہ مواد تعلیمی اور تحقیقی امور میں ان کی کس قدر کفالت کرتا تھا۔ تاہم آج کے دور میں فوٹو کاپی مشین نے یہ ضرورت بھی پوری کر دی ہے اور اساتذہ طلبہ کے ذریعے کتابیں کی کتابیں فوٹو کاپی کرا لیتے ہیں۔

ڈیپارٹمنٹ کی سطح پر چیئرمین کے ساتھ ''تعلق خاطر'' رکھنے والے اساتذہ کا ایک جمِ غفیر ہوتا ہے جو ہر صحیح یا غلط، جائز و ناجائز امر میں ان کی ہاں میں ہاں ملانے ہی میں اپنی عافیت اور کامیابی سمجھتا ہے یا انھیں ''سمجھا'' دیا جاتا ہے کہ ''سالانہ رپورٹ'' میں اندراج ان کی تمام زندگی میں ان کا پیچھا کرے گا ◆ تاہم چند ہوشیار اور رجسٹرار، خازن سے تعلق رکھنے والے جونیئر اساتذہ ایسے ریمارکس ''تبدیل'' کرا کر دفتر میں جمع کرا دیتے ہیں کہ چند سال بعد کوئی بھی گزشتہ ہیڈ، چیئرمین کے دستخطوں کی پرواہ نہیں کرتا کہ ان تبدیل شدہ Remarks پر اصل دستخط ہیں یا جعلی؟

یاد رہے کہ یہ تمام تر گفتگو ان مشاہدات کی بنا پر کی جا رہی ہے۔ جو نہ صرف زمانہ تعلیم و تدریس بلکہ آج بھی مختلف یونیورسٹیوں سے کسی نہ کسی صورت استفادہ کرنے (لائبریری یا چند اہل علم کی خدمت میں حاضری) کی بناء پر حاصل ہوئی ہیں۔ اور کوئی ایک شخص بھی (جس کے دل میں خدا کا خوف اور ملک و ملت کے لیے بھلائی کا ادنیٰ سا جذبہ بھی ہو اس کا انکار نہیں کر سکتا البتہ ڈھٹائی کی اور بات ہے)۔ تاہم ایک بہت ہی قلیل تعداد (آٹے میں نمک کے برابر) ایسے اساتذہ کی ضرور ہے جو اپنے فرائض نیک نیتی اور ایمانداری سے سرانجام دیتے ہیں۔ تاہم ان کی حیثیت محکمے/ یونیورسٹی میں ایک ''نِکّو'' کی ہوتی ہے۔ اور

◆ اس طرح کی تمام تر دھمکیوں کی زیادہ تر شکار صنفِ نازک ہوتی ہیں بلکہ ایسی لڑکیاں جو عارضی نوکری (ADHOC) پر کام کرتی ہیں، انھیں تو سربراہ محکمہ ''گالیوں'' سے نوازنے سے بھی گریز نہیں کرتے!____ بدقسمتی سے یہ امر بھی جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ ایسے ایسے پروفیسر موجودہ دور میں وطن عزیز کی یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں! جن کے ضمیر نے انھیں یاد نہیں کرایا کہ ان کی بیٹیاں/ بہن، ازواج بھی کسی ایسے بد اخلاق شخص کا نشانہ بن سکتی ہیں!

اساتذہ کی پہلی قسم کی بیشتر تعداد انھیں ایک ''عجیب وغریب مخلوق'' سمجھتی ہے۔

درج بالا صورت حال سے زیادہ ''خطرناک اور تشویش ناک'' امر یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ محکمانہ اور یونیورسٹی سطح پر اس تمام تر ''تربیت'' کا یہ اثر ہوتا ہے کہ طلبہ کی بھی ایک کثیر تعداد (۸۰ فی صد سے زائد) ایمان دار اور پڑھانے والے اساتذہ (جو امتحانات میں ایمانداری سے نمبر لگاتے ہیں، کسی قسم کی سفارش، دباؤ از قسم برادری، محکمانہ پروفیسر وغیرہ قبول نہیں کرتے) کو طلبہ بھی پسند نہیں کرتے تاہم ایک قلیل خاموش تعداد طلبہ کی ایسی ضرور ہوتی ہے جن کے والدین یونیورسٹیوں میں کسی انتظامی یا تدریسی عہدے پر تعینات نہیں ہوتے، وہ اپنی محنت اور دیانت کی بناء پر ایسے اساتذہ کی عزت و احترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے لیکن کون سنتا ہے ''فغانِ درویش'' ـــــ ایسے طلبہ میں اکثر ان لڑکوں کی ہوتی ہے جنہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ صرف نماز، روزہ کی پابندی نیز کسی وقت تبلیغ کے لیے جاکر اپنی عاقبت سنوارنا ہی کافی ہے اور سیاسی/ اصلاحی کاموں میں حصہ لینا مناسب نہیں ـــــ لیکن اس المیے کا ایک دوسرا پہلو بھی اس قدر گھناؤنا ہے کہ جس کے ذکر سے ہی شرم آتی ہے۔ پہلی قسم کے طلبہ کو دیگر اساتذہ کی جانب سے ''ہلہ شیری'' بھی دی جاتی ہے کہ وہ دوسرے طلبہ کے ساتھ مل کر ''پڑھاکو اساتذہ'' کا بائیکاٹ کریں اور دستخطی مہم کے ذریعے ان اساتذہ کو وہ مضمون پڑھانے سے تبدیل کر دیا جائے۔ اخلاق اور کردار کی اس کمی کا رونا کہاں اور کب تک کیا جائے کہ

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم؟

تاہم اخلاقی گراوٹ کے ایک دو مزید واقعات کی نشان دہی اور تذکرے کے بعد ہم دوسرے موضوعات (جو از خود کسی حد تک بھی ''خوش کن'' نہیں) کی جانب آئیں گے۔

ہائر ایجوکیشن ڈگری کی تمام تر دیگر تدریسی و تکمیلی ضرورتوں کے بعد، ہائر ایجوکیشن کمیشن کی ایک اچھی روایت کو اساتذہ کی ایک بڑی تعداد (جس میں بظاہر متدین اور نیک لوگ بھی شامل ہیں) نے کس بری طرح سے اپنی ذات کی تشہیر کے لیے استعمال کیا ہے، وہ یہ کہ ڈگری کے اجرا کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس تحقیق کو کسی بین الاقوامی سطح کے جرنل میں

ایک یا دو مقالہ جات کی شکل میں شائع بھی کرایا جائے **جو ہائر ایجوکیشن کمیشن کے منظور شدہ بھی ہوں۔** ریسرچ اور مقالہ لکھنے کے بارے میں اساتذہ کے کردار کا اندازہ تو درج بالا صفحات کے مندرجات سے کیا ہی جا سکتا ہے کہ اس میں کس قدر حصہ اساتذہ کا ہوتا ہے تاہم مقالے کی اشاعت کے وقت اگر کسی طالب علم نے علامہ اقبالؒ کی ''خودی'' کے پیام کے تحت اپنا نام اوّل حیثیت سے لکھنے کی جسارت کی تو وہ مقالہ کسی جرنل میں چھپ ہی نہیں سکتا کیوں کہ محکمانہ جرنل، یونیورسٹی مجلہ کے تحت شائع ہونے والے جرنل پر ''قبضہ گروپ'' کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ اب وہ طالب علم مجبور ہے کہ اپنے مقالے پر پہلا نام چیئر مین، پروفیسر، ڈین کا لکھے اور دوسری جگہ اپنا نام ـــــ اس طرح یہ ہفت خواں سالوں، مہینوں میں نہیں بلکہ دنوں میں طے ہو جاتا ہے۔

سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!

درج بالا سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس مقالے کو ہائیر ایجوکیشن کی منظور شدہ اعلیٰ ترین کیٹگری میں شامل ہونا چاہئے اور مزید ایک شرط جس کا بہت بے دردی کے ساتھ ''مثلہ'' کیا جاتا ہے اور وہ بھی ''خداوندانِ مکتب'' کے ہاتھوں وہ یہ شرط کہ کسی ایک جرنل میں کسی ایک شخص کے نام سے ایک سے زائد مقالے شائع نہیں ہونا چاہیے (تا کہ کوئی ایڈیٹر صاحب ذاتی طور پر یا اپنے گروپ کے منظورِ نظر افراد کو نواز نہ سکیں) **لیکن ریکارڈ پر موجود ہے کہ ایک ہی رسالے یا لگاتار دو اشاعتوں میں دو یا زائد مقالہ جات شائع کر کے یار لوگ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر بن جاتے ہیں اور یوں بد دیانتی کا یہ سفر طے ہو جاتا ہے۔**

طے شود جادۂ منزل بہ یک آہ گاہے!

یونیورسٹی انتظامیہ (وائس چانسلر، رجسٹرار یا اس مقصد کے لیے جو ادارہ ہائیر کمیشن نے بنایا ہے، وہ اس ''جرم عظیم'' سے صرفِ نظر کرتے ہیں (ممکن ہے کہ ان میں سے کسی کے ایماء پر ایسا ہوتا ہو کہ جسے وہ نوازنا چاہتے ہوں، اس کے لیے آنکھیں بند کر لینا بھی ایک عام سی بات ہے!)۔ یونیورسٹیوں کے دیگر محکمہ جات اور ان کے اساتذہ اپنی ''حق تلفی'' پر

کڑھتے ہیں، نجی طور پر تبادلۂ خیال کر کے ایک دوسرے کو ''اکسانے، ابھارنے'' کی شعوری، غیر شعوری کوشش بھی کرتے ہیں لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ جرمِ ضعیفی کی سزا ہمیشہ سے مرگِ مفاجات ہی رہی ہے ــــــ کسی میں اس قدر جرأت کردار نہیں ہوتی کہ اس ''مافیا'' کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے کہ انھیں محراب و منبر سے حدیث رسولؐ کا یہ عمل کرنے کے لیے بتایا گیا ہے کہ برائی کو دل سے برا ماننا، اگرچہ ایمان کی سب سے نچلی سطح ہے، تاہم ''مومنین، صالحین'' کے لیے یہ کافی ہے!

تاہم جہاں تک ہائیر ایجوکیشن کا تعلق ہے تو وہ اس تفصیل میں نہیں جاتے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ انھوں نے اسقدر ''جامع'' پابندیاں وضع کر دی ہیں۔ آخر یونیورسٹی کے ذمہ داران بھی تو ''تنخواہ'' لیتے ہیں، وہ یہ کام کیوں نہیں کرتے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جاتا ہے اور (وہ بھی کسی شکایت پر) کہ **اس رسالے کو BAN کر دیا جاتا ہے (پنجاب کے ایک مشہور شہر کی یونیورسٹی میں حالیہ دور میں اس قسم کا واقعہ ہوا ہے) لیکن ''یار لوگوں'' نے تو اس طریق پر فائدہ اٹھا کر پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر بن گئے، اور یوں وہ تو ایک موقع حاصل کر کے ہمیشہ کے لیے سینئر بن گئے ــــــ ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ہائیر ایجوکیشن کمیشن، متعلقہ یونیورسٹی کو اس بے قاعدگی پر انصاف اور قانون کے مطابق ایسے عناصر کو سزا دینی چاہیے۔ تاہم وطن عزیز کی شاید ہی کوئی ایک یونیورسٹی/فیکلٹی/کالج میں ایسے اساتذہ ملیں جن پر اس قسم کی اخلاقی بدعنوانی کا داغ نہ ہو۔**

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں تھی!

چند مزید بدعنوانیاں

یونیورسٹی اور ڈیپارٹمنٹ کی سطح پر ایک اور ''بندر بانٹ''، جس کا اکثر و بیشتر مظاہرہ کیا جاتا ہے وہ سمسٹر کے آغاز پر تدریسی کورسز کی تقسیم ہے! علوم (سائنس، لسانیات، سماجیات) میں اب سپلائزیشن اس قدر زیادہ ہوگئی ہے کہ ان کا شاید شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ

گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا گیا کہ پبلک، پرائیویٹ سیکٹر میں یونیورسٹیاں خاص علوم میں سپلائزیشن کے لیے نہیں رہ گئیں **بلکہ تجارتی کاروبار کی وجہ سے ''جنرل یونیورسٹیاں'' بن گئی ہیں۔ جو بیک وقت پروفیشنل مضامین (میڈیکل، وٹرنری، انجینئرنگ وغیرہ)** اور (Humanities) کے بے شمار مضامین میں ایم، اے، ایم ایس سی، ایم فل، پی ایچ ڈی **کی ڈگریاں بانٹ** رہے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اپنے ''مخالفین'' کو ایسے مضامین، موضوعات دیے جاتے ہیں جس میں انھیں نئے سرے سے تیاری کرنی پڑتی ہے (جس کی تیاری اس نسلِ نو کے بس کا روگ نہیں جنہیں مسند ارشاد میراث میں ملی ہو) تاہم جب یہ ہو جاتا ہے تو اگلے سال، سمسٹر میں اس کورس کو کسی ''منظورِ نظر'' کو دیدیا جاتا ہے کہ وہ منظورِ نظر صاحب پرانے طلبہ سے نوٹس لے کر ''اپنا کام'' بہت آسانی کے ساتھ چلا لیتے ہیں اور پچھلے سمسٹر کے استاد کو ایک نیا مضمون دے دیا جاتا ہے ___ اس طرح نہ صرف یہ کہ محکموں میں کھینچا تانی کا ایک سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے بلکہ طلبہ اور خود اس استاد کو بھی ایک مضمون، موضوع پر مہارت حاصل نہیں ہوتی اور طلبا بھی ہر سمسٹر میں مختلف اساتذہ سے ''کچا پکا میٹریل'' پڑھنے کے نتیجے میں مستقبل میں کسی قسم کی اختصاصی مہارت اور نظر حاصل نہیں کر پاتے۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ!

اب ہم چند گزارشات، امتحانی سسٹم کے بارے میں کرنا چاہتے ہیں جس میں بتدریج خرابی نے نظامِ تعلیم کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی!

سالانہ امتحانات بمقابلہ سمسٹر سسٹم:

گزشتہ پچاس سالوں میں تعلیمی نظام کے اہم ترین شعبوں (طریقۂ تعلیم، امتحانات وغیرہ) میں بھی ایک بہت ہی مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی، میٹرک سے لے کر پی ایچ ڈی (بشمول پروفیشنل کالجز) کے طورخم سے لے کر کیماڑی تک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے سکولوں، کالجوں کے امتحانات لیا کرتی تھی اور سالانہ بنیادوں پر تمام امتحانات نہایت باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہوتے تھے اور وقت کی

پابندی کے ساتھ ہی نتائج کا اعلان بھی ہوتا تھا۔ امریکن تعلیمی ماہرین کے زیر اثر سمسٹر سسٹم کا اجرا کیا گیا جبکہ اس سسٹم کی بنیادی ضرورت وافر کتب کی فراہمی (متعدد کتب طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے تاکہ ہر طالبعلم خود کتاب سے پڑھے) اس طرح امتحانی طریق کار کو ۲، ۳ حصوں میں تقسیم کرنا اور امتحانی پرچوں کی تیاری نیز چیکنگ، انھیں اساتذہ نے کرنا جو کورس پڑھاتے ہیں۔ جس زمانے میں اس سسٹم کا اجراء کیا گیا تھا، اگرچہ کتب کی شدید کمی تھی تاہم اساتذہ کی ایک کثیر تعداد اپنے اپنے مضامین، موضوعات کے شناور ہوتے تھے۔ مزید برآں اخلاقی حالت کے لحاظ سے اگرچہ وہ صلحائے امت کے برابر تقویٰ اور اہلیت نہیں رکھتے تھے تاہم آج کے بتانِ حاضر کی طرح بھی نہ تھے کہ جن کی ادا کا فرانہ اور تراش آذرانہ ہو (کہ جو مطلوب نہیں تاہم کردار کی پختگی کی علامت ضرور ہیں!)

☆ وہ نسل اللہ اور رسولؐ پر ایمان رکھتی تھی۔ انھیں پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کا نہ صرف شعور تھا بلکہ اس کے حصول کے لیے انھوں نے خود بھی خاک وخون کا سمندر عبور کیا تھا۔

☆ انھوں نے اپنے بزرگوں کے ساتھ اللہ اور مخلوق خدا کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ مملکت پاکستان ریاست مدینہ کا پَرتو ہوگی۔

☆ ان میں ایک فی کروڑ بھی ایسے اساتذہ کی نہ تھی جو ''امن کی آشا''، ''امن کی فاختہ'' اور ''سرحدوں کے درمیان لکیروں کے خاتمے'' کی باتیں کرتے تھے لیکن (گزشتہ ۵۰ سالوں میں جن لوگوں کے ہاتھ میں تعلیمی نظام کی باگ دوڑ رہی ہے اور جس قسم کی نوجوان نسل تعلیمی اداروں میں تیار ہوئی ہے، ہر محب وطن اور ایماندار پاکستانی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اپنا جائزہ لے کہ کیا۔)

☆ یہ ایک حقیقت نہیں کہ موجودہ دور میں جو نسل تعلیمی شعبوں میں پرائمری سے لے کر ہائیر ایجوکیشن (کلرک، افسر، نظامی عملہ، جونیئر اور سینئر اساتذہ اور سب سے بڑھ کر کار پردازن یونیورسٹی بشمول ہائر ایجوکیشن کے ارکان وغیرہ) کیا وہ درج بالا اوصاف سے متصف ہیں؟

☆ کیا اس نظامِ تعلیم کے ''پڑھے لکھے لوگوں'' نے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کو دولخت نہیں کیا؟

☆ کیا اس نسل کے پروردہ لوگوں (بیوروکریسی، براکریسی، سیاست دان، اور طالع آزماؤں نے وہ غلیظ اور گلی سڑی فصل تیار نہیں کی جس کے بارے میں وطن عزیز کے ایک مفکر نے کہا:

''ان کو معزز سے معزز پوزیشن میں ہو کر بھی کسی ذلیل سے ذلیل بددیانتی اور بدکرداری کے ارتکاب میں دریغ نہیں ہوتا۔ ان میں بدترین قسم کے رشوت خور، خویش پرور، سفارش کرنے اور سننے والے، بلیک مارکیٹ کرنے والے اور کرانے والے، ناجائز درآمد و برآمد کرنے اور کرانے والے، انصاف اور قانون اور ضابطے کا خون کرنے والے، فرائض سے جی چرانے اور لوگوں کے حقوق پر چھری چلانے والے اور اپنے ذرا سے مفاد پر اپنی پوری قوم کے مفاد اور فلاح کو قربان کرنے والے، ایک نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہر شعبۂ زندگی میں کام کرتے نظر آئیں گے۔'' (سید مودودی ۱۹۶۲)

ان الفاظ میں جن جن کرداروں کی تصویر کھینچی گئی ہے کیا اس کے بعد اب ضرورت رہ گئی ہے کہ ان کے ''اسم ہائے گرامی'' بھی لیے جائیں؟ اور کیا یہ تمام کردار آج کے معاشرے کی جانی پہچانی ''شخصیات'' نہیں ہیں؟

یہ کس کا فرادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی؟

ہماری نظر میں کسی بھی تعلیمی نظام (سیکولر، لبرل، قومی و ملّی مقاصد کا حامل یا برعکس وغیرہ) میں اولین حیثیت اس مقصد زندگی کو حاصل ہے جو پرائمری سے لے کر اعلیٰ ترین تعلیم کے حامل افراد کے سامنے ہونا چاہئے۔ جب ہم اس نقطہ نظر سے جائزہ لیتے ہیں تو یہ خوفناک اور المناک صورت سامنے آتی ہے کہ جو جس قدر تعلیم یافتہ (بشمول دینی تعلیم مدارس حتیٰ کہ اسلامی یونیورسٹی وغیرہ الا ماشاءاللہ) ہے وہ اُسی قدر تعلیم کے مقاصد یا مقصد زندگی کے تصور سے نا آشنا نظر آتا ہے۔ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ لاکھوں روپے اور عمر کا ایک طویل

عرصہ صرف کر کے دولت اور مناصب کے حصول کے علاوہ بھی کوئی اور مقصد زندگی ہوسکتا ہے؟ اوراس کے لیے جائز، ناجائز کا سوال تو گویا ایک احمقانہ سوچ ہے!

وہ علم نہیں، زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو! (اقبالؒ)

سمسٹر سسٹم کے ضمن میں، کتب کی عدم فراہمی کا یہ حل تجویز کیا گیا (اس میں یونیورسٹی انتظامیہ بالخصوص وائس چانسلرز اور خازن یونیورسٹی کے کردار کا جائزہ آئندہ صفحات میں لیا گیا ہے) کہ ایم ایس سی، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کے لیے سینئر اساتذہ مختلف کتب کے چند مخصوص ابواب، صفحات، موضوعات کی نشان دہی کتب پر کر دیتے ہیں جو کسی صورت بھی ایک سو صفحات سے زائد نہیں ہوتے۔ طلبہ وہ نوٹس ان دکانداروں سے خرید لیتے جو فوٹو کاپی کا کام کرتے ہیں ـــــ اساتذہ کو فوٹو کاپی والے کی جانب سے طلبہ کی تعداد کے مطابق ''حق الخدمت'' مل جاتا ہے اور طلبہ اپنے ''خرید کردہ نوٹس'' کی مدد سے امتحانی رات میں پڑھ کر (یا دیگر طریقوں سے کہ امتحانی نگرانی بھی تو انھیں اساتذہ یا جونیئر سٹاف نے کرنی ہوتی ہے) اس مضمون کا امتحان A گریڈ میں حاصل کر لیتے ہیں!

قیاس کن زگلستانِ من، بہار مرا

امتحانی طریق کار:

سمسٹر سسٹم میں ۲، ۳ مراحل میں امتحان لینے کی جو وجہ امریکہ یا یورپ میں بیان کی جاتی ہے وہ کتب کی فراواں تعداد اور اساتذہ کا اخلاقی معیار ہے (جس کی انتہا یہ ہے کہ استاد اپنی گرل فرینڈ، بوائے فرینڈ کے ساتھ بھی رعایت نہیں برتتا اور شاید فریق ثانی بھی کسی قسم کی ''غیبی مدد'' کا قائل نہ ہو) لیکن خدا پر ایمان رکھنے والے اور آخرت میں جواب دہی کا تصور رکھنے والے اساتذہ اور تلامذہ کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجئے جس قسم کے حربے وہ استعمال کرتے ہیں۔

(ا) اساتذہ میں سے ایک بہت قلیل تعداد (آٹے میں نمک کے برابر) ایسی ہے جنھوں نے تمام سمسٹر وقت پر باقاعدگی سے کلاسیں لی ہوتی ہیں اور مجوزہ کورس کو، کتب کی

مدد سے لیکچر کے ذریعے سلائیڈز و دیگر طریقوں نیز (Assignments) دے کر پڑھایا ہوتا ہے، ایسے اساتذہ محنتی اور قابل طلبہ کے لیے ہرگز پریشانی کا باعث نہیں بنتے۔ تاہم وہ طلبہ جن کے والدین، رشتے دار، برادری یا علاقائی زبانوں وغیرہ کی وجہ سے اساتذہ کے ساتھ ''تعلق خاطر'' رکھتے ہوں اور ان اساتذہ نے لڑکوں کو پڑھایا بھی نہیں ہوتا (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ''غیر تحریری معاہدہ باہمی'' کا ذکر کیا گیا ہے) چونکہ طلبہ نے اپنے طور پر ایسے اساتذہ کو پڑھانے کے لیے ''تنگ'' نہیں کیا ہوتا، ان کے ہاتھ میں ایک ''حربہ'' ہوتا ہے ایسی صورت میں استعمال کرنے کا، اس لیے اب یہ استاد کا ''فرض'' ہے کہ وہ بھی طلبہ کے ساتھ ''شاہانہ فیاضی'' کا مظاہرہ کرے۔ یوں ''امتحانی سوالات کا افشاء ہونا، بعد از امتحان پرچوں کو دوبارہ لکھنا یا تبدیل کرنا'' اور نمبروں کی شاہانہ تقسیم (کہ یہ پرچہ جات کنٹرولر امتحانات کے ''ذخیرۂ ردی'' میں یوں گم ہو جاتے ہیں کہ ان کی تلاش ممکن ہی نہیں ہوتی اور بعد چند ماہ، سال وہ دکانداروں کے ہاں سودا سلف بیچنے کے لیے لفافے بنانے کے کام آتے ہیں)۔۔۔۔ یہ اور ایسے چند دیگر حربے ہیں جو اکثر بغیر کسی پریشانی اور وقت عموماً کئے جاتے ہیں اور چونکہ کسی فریق کو بھی کسی قسم کی شکایت نہیں ہوتی اس لیے **''سب اچھا''** کی رپورٹ ڈین، وائس چانسلر کو دے دی جاتی ہے۔

اگر ان تمام کرتبوں کے باوجود کام نہیں بنتا تو پھر ''سفارش کا جھرلو'' بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے اور یوں جب اس طریق پر ۳، ۴ سمسٹر میں A گریڈ لے کر کوئی طالب علم پاس ہوتا چلا جاتا ہے اور اگر شومئ قسمت سے کسی اگلے سمسٹر میں کوئی ایسے پڑھانے والے اور ایماندار استاد سے واسطہ پڑ گیا جو اس قسم کے حربوں سے آگاہ نہیں ہوتا تو انھیں یہ کہہ کر مرعوب، مطمئن اور ہراساں کیا جاتا ہے کہ ''آخر طالب علم نے پچھلے ۳، ۴ سمسٹرز میں A گریڈ حاصل کیا ہے، کیا وجہ ہے کہ وہ آپ کے مضمون میں ہی فیل ہو گیا ہے؟ آپ بہت ''ایمان دار'' بنتے ہیں؟ تاہم کچھ ''دیوانے'' جو اس قسم کے حربوں سے ہراساں نہیں ہوتے، ان کے لیے پورے کیمپس میں گویا ''اعلانِ عام'' ہو جاتا ہے جیسے قرآن کریم نے اپنے مخصوص انداز میں یوں بیان کیا ہے۔

اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾ (الاعراف)

''نکالو انھیں اپنی بستی سے۔ یہ بہت پاکباز بنتے ہیں''

یوں طلبہ ان اساتذہ سے پڑھنا پسند نہیں کرتے بلکہ اکثر دیگر اساتذہ کی جانب سے طلبہ کو ڈرایا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات کچھ لوگ تو طلبہ کو ''کلا شیری'' بھی دیتے ہیں کہ ایسے محنتی اور ایماندار استاد کے خلاف درخواست دے کر وہ کورس کسی دوسرے استاد کو بھی دلا دیا جاتا ہے تاہم ایسا بھی ہوتا ہے کہ زچ ہو کر استاد خود ہی وہ کورس چھوڑ دیتا ہے!۔۔۔۔اس ضمن میں اخلاقی گراوٹ کی یہ انتہا بھی یونیورسٹیوں کے ریکارڈ میں موجود ہے کہ کسی خاص برادری کے چیئرمین یا پروفیسر نے کورس آفر کیا جس میں ان کی اہلیہ، بیٹا، بیٹی نے بھی Enroll کیا۔ یاد رہے کہ ضابطہ اخلاق ہی نہیں بلکہ قوانین کی رو سے بھی کوئی ایسا کورس کوئی شخص نہیں پڑھا سکتا جس میں ان کا قریبی رشتے پڑھ رہا ہو۔ ایک یونیورسٹی میں اس قسم کے ایک کورس میں ایک پروفیسر صاحب کو سنڈیکیٹ نے فوری استعفیٰ کے ذریعے ''فارغ'' کر دیا۔ لیکن ان وائس چانسلر صاحب کو تھوڑے ہی عرصے بعد ''فارغ'' کر دیا گیا کہ پروفیسر موصوف کا کسی برادری کے ایک صاحب کے ساتھ تعلق تھا جو بعد ازاں صوبے میں وزیر قانون بن گئے اور یوں انھوں نے ترازو کے دونوں پلڑوں کو از روئے انصاف، قانون برابر کر دیا! آخر وہ ''وزیر قانون'' جو تھے

پُر ہے افکار سے مدرسے والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز!

امتحانات کے ضمن ہی میں ایم ایس سی، ایم فل کے Final examination کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ (خازن، کنٹرولر امتحانات) نے ایسی ایسی اختراعات کی ہیں کہ ان کے ذہن رسا کی داد دینی پڑتی ہے۔ یہ حضرات اس قدر ''بااثر اور طاقتور'' ہوتے ہیں کہ وائس چانسلر بھی مجبور ہو جاتے ہیں (آخر وہ بھی تو اس دھرتی کے سپوت ہوتے ہیں جنھوں نے نمعلوم کن کن حیلوں اور کرتبوں سے یہ عہدہ حاصل کیا ہوتا ہے، ماضی کا زمانہ لد گیا جس کی مثال گزشتہ صفحات میں دی گئی ہے) بھلے وقتوں میں جبکہ وطن عزیز ابھی طفولیت کی زندگی

مکمل کرنے کے بعد حالت بلوغت کو پہنچ رہا تھا (قریباً عرصہ ۱۹۷۵ تا ۱۹۸۰) تو بی ایس سی، ایم ایس سی کے امتحانات اور Thesis defence کے لئے ممتحن حضرات مملکت کے دوسرے صوبوں سے بلائے جاتے تھے۔ پیشہ ورانہ کالجوں میں سیکنڈ پروفیشنل سے لے کر فائنل پروفیشنل امتحان کے لیے امتحان کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے تحت ممتحن حضرات مشرقی پاکستان، افواج پاکستان اور دیگر صوبوں سے بلائے جاتے تھے (راقم نے خود بھی اس قسم کے ممتحن حضرات سے تین مختلف سالوں کے امتحانات دیئے) تاہم آہستہ آہستہ **ملک نے جب ''ترقی کی منازل'' طے کرنی شروع کیں** اور جبکہ ایسا ہونا شروع ہوا کہ ''سیاست کے بے تاج بادشاہوں نے ریڑھی بانوں، مٹھائی اور برف بیچنے والوں کے نام سے اربوں روپے بنک میں جمع کرانے شروع کئے تو تعلیمی سیکٹر میں فنڈز کی کمی آنی شروع ہوگئی جسے یونیورسٹی انتظامیہ (بالخصوص خازن یونیورسٹی) نے بچت کے نام پر دوسرے صوبوں، یونیورسٹیوں سے ممتحن بلانے بند کر دیئے اور بطور پالیسی یہ طے کیا گیا کہ اپنے ہی شہر کے کسی شخص کو جس نے اس یونیورسٹی، ڈیپارٹمنٹ سے Ph.D/Msc کی ہو بطور ممتحن بلالیا جائے۔۔۔۔ یوں یہ ''خطیر رقم'' انتظامیہ کے الّلے تلّوں کے لیے بچ جاتی ہے یا پھر خازن کو سالانہ بجٹ میں خسارے کی مد میں چند ہزار/ لاکھ کا اضافہ نہیں کرنا پڑا۔۔۔۔ اور وہ بآسانی ۲۵ / ۳۰ سال ہر رپورٹ میں غالب کا یہ شعر لکھ کر داد وصول کرتے تھے ◆

قرض کی پیتے تھے مئے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن!

ظاہر ہے کہ ایسے امتحانی طریقے کو مذاق ہی کہا جاسکتا ہے (مزید چند گزارشات آئندہ صفحات میں آرہی ہیں)

اس قسم کی تمام تر صورت حال کا تدراک و انسداد، قوانین کی مدد سے کرنا جہاں

◆ پنجاب کی ایک بڑی یونیورسٹی کی سینیٹ کی ۱۹۷۴ تا ۱۹۹۸ میٹنگز کی سالانہ کارروائیوں (Proceedings) میں اس ''کرتب'' کی مسلسل مثالیں تحریری شکل میں آج بھی موجود ہیں!

ضروری ہے وہاں اس سے بھی زیادہ یہ ضروری ہے کہ ہم نظامِ تعلیم میں پرائمری سے لے کر اعلیٰ تعلیمی اداروں تک اپنی نوجوان نسل اور اساتذہ میں اخلاقی اقدار اور اسلامی تربیت کا بندوبست کریں وگرنہ قاعدے، قانون میں (Loopholes) تلاش کرنا، موجودہ مسلمانوں کے لیے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔۔۔! کسی بھی شخص کی بے ایمانی، رشوت، کرپشن وغیرہ کا تدارک کرنے کے لیے ہر شخص کے **دل و دماغ میں توحید باری تعالیٰ، اسوہ رسول ﷺ کا اتباع اور آخرت میں جوابدہی کا تصور جاگزیں کیئے بغیر یہ امر ممکن ہی نہیں کہ وطن عزیز ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکے۔ یہ وہ کلیدی نکتہ ہے جس سے ماضی کے حکمرانوں نے صرف نظر کیا اور آئندہ بھی جو شخص، حکومت، پارٹی یا ادارہ وطن عزیز میں کرپشن فری نظام زندگی نافذ کرنے کا خواہاں ہے انھیں بھی اسی نسخۂ شافی پر عمل کرنا ہوگا۔**

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں!

اگرچہ امتحانات کے بارے میں ہماری گزارشات کسی حد تک طویل ہوگئی ہیں تاہم یہ موضوع تعلیمی نظام میں ایک کلیدی حیثیت کا حامل ہے اور اس میں خرابی کی صورت دراصل پورے تعلیمی نظام کے مثبت اثرات کو سبوتاژ کردیتی ہے۔ مزید ایک دو معروضات کے بعد اس طول بیانی کو ختم کریں گے!

☆۔۔۔۔ اولین امر جس کی جانب توجہ دلانی ضروری ہے وہ چند ایسے محیر القول اور علمی دنیا کے ایسے نادر الوجود واقعات ہیں جو شاید دنیا میں کہیں بھی واقع نہ ہوئے ہوں گے اور اگر کہیں ایسا ہوا تو پھر ان کے ذمہ داران سے باز پرس بھی اس قدر سخت کی گئی ہوگی کہ شاید ہی کسی جرم کے لیے ایسی سزا دی گئی ہو۔

ہم نے درج بالا صفحات میں تحریر کیا ہے کہ کسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی وطن عزیز میں میٹرک تا اعلیٰ تعلیم بشمول پروفیشنل کالجز کے امتحانات لیتی تھی جس کے تحت لاکھوں طلبہ، ہر سال کامیاب ہوتے تھے۔ لیکن وطن عزیز کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی (جو اپنی برادری

پرستی) کے لیے بدنامی کی حد تک شہرت رکھتی ہے) میں ایک طالب علم کو بیک وقت دو مضامین کی ایم ایس ڈگری دی گئی۔ اس 'بخشش اور عطا'' کے پیچھے کنٹرولر امتحانات کی غفلت تھی۔ پتہ چلنے پر اگر چہ ایک ڈگری منسوخ کر دی گئی لیکن اس کا ایک قانونی طریقہ ہوتا ہے کہ ملک کے اسسٹنٹ کمشنر (جو انتظامی یونٹ تحصیل کی سطح پر سی ایس پی افسر ہوتا ہے) سے لے کر صدر مملکت، وزیر اعظم سیکرٹریٹ اور عام سرکاری وغیر سرکاری اداروں (وفاقی اور صوبائی) نیز چیف جسٹس آف پاکستان، صوبائی ہائی کورٹس کے ججز، ماتحت عدالتوں اور دیگر اداروں کو بذریعہ نوٹی فی کیشن برائے اطلاع دی جاتی ہے ___ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود حسن کارکردگی کا اعلیٰ ترین مظاہرہ اس امر سے ہوتا ہے کہ درج بالا کسی اتھارٹی نے بھی وائس چانسلر، کنٹرولر آف امتحان و دیگر کسی سے باز پرس نہ کی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ متعلقہ اہل کار یعنی کنٹرولر امتحانات کو معطل کر کے قرار واقعی سزا دی جاتی لیکن یونیورسٹی نے اس معاملے کو اس طرح گول کر دیا گویا کچھ ہوا ہی نہیں ___ چونکہ اس کے پیچھے برادری گٹھ جوڑ بھی تھا۔ وائس چانسلر، کنٹرولر امتحانات مدت ملازمت پوری کر کے اپنی اپنی پنشن بھی شاید اب تک وصول کر رہے ہیں!

اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ سائنسی مضامین (ایم ایس سی) کے لیے Thesis کا امتحان لینے کے لیے بین الصوبائی یا کم از کم صوبے کی دوسری یونیورسٹیوں سے ممتحن بلائے جائیں اور ان کے اخراجات ہائیر ایجوکیشن کمیشن ادا کرے۔

پراسپکٹس کی فروخت ذریعہ آمدنی یا؟

یونیورسٹی سطح پر تعلیمی منظر نامے کا ایک نہایت گھناؤنا طرز عمل اس وقت سامنے آتا ہے کہ اب یونیورسٹیوں نے تجارتی اداروں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ کسی ملک کی یونیورسٹیاں جو علم و تحقیق کا گہوارہ ہوتی ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ اس پر ممبران سینڈیکٹ سے لے کر صوبائی زیر تعلیم تک کسی کو قطعاً خیال نہیں آتا۔ امر واقعہ یہ ہے، طلبہ کو کسی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے ایک پراسپیکٹس کی خرید کے لیے کم از کم ایک ہزار روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ تاہم سرکاری یونیورسٹیوں میں مختلف فیکلٹی یا ڈیپارٹمنٹس میں داخلے کے لیے

علیحدہ علیحدہ ایک ایک ہزار کے پراسپیکٹس خریدنے پڑتے ہیں کہ ہر ایک فیکلٹی کے لیے داخلہ فارم علیحدہ ہوتا ہے اور ایک سے زائد داخلہ فارم ایک پراسپیکٹس میں نہیں ہوتے۔ اب اگر کسی کے ایک سے زائد بچے بچیاں داخلہ لینا چاہتے ہیں تو انھیں ہزاروں روپے تو صرف فارم جمع کرانے کے لیے کالج، یونیورسٹی ''یاترا'' کے لیے **''مندر کے مہنتوں/پجاریوں''** کی نذر کرنا پڑتا ہے — **اور شاید ایسی رقم کا آڈٹ بھی نہیں ہوتا!**

اب ذرا پراسپیکٹس کی ہیئت پر نظر ڈالیں کہ اس میں کس قدر ''مقدس معلومات'' درج ہوتی ہیں۔ سو صفحات (کم وبیش) پر مشتمل یہ دستاویز چہار رنگی طباعت گلیزڈ/ چکنے کاغذ (۱۰۰ گرام یا زائد) پر

۱۔ ٹائٹل پر یونیورسٹی بلڈنگ کا مونوگرام

۲۔ اندرونی ورق پر قائداعظم محمد علی جناح کی تصویر بمعہ کسی قول، جس پر عمل کرنے کی توفیق کسی کو بھی نہیں ہوتی۔

۳۔ صدر مملکت کی تصویر (نہایت بدنام زمانہ لوگوں کی تصاویر تک)

۴۔ وفاقی وزیر تعلیم کی تصویر، جن کا اکثر وبیشتر شعبہ تعلیم سے واجبی سا تعلق ہوتا ہے۔

۵۔ گورنر صوبہ کی تصویر — ماضی میں کھرا اور اسی قماش کے لوگ — شاید اس بناء پر چند غیر ملکی یونیورسٹیاں اپنے ملکوں میں داخلے کے لیے بچوں کے امتحانات دوبارہ لیتی ہیں!

۶۔ وائس چانسلر، ڈین، پروفیسرز اور یونیورسٹی کے متعلق دیگر تصاویر

۷۔ یونیورسٹی میں حصول تعلیم کے دوران قاعدے، قوانین جنہیں نہ کسی نے پڑھا ہوتا اور نہ ہی عمل کرنا مقصود۔

واضح رہے کہ یہ ایک ایسے ملک کی یونیورسٹیوں کا حال ہے جس ملک کا ہر باشندہ حتیٰ کہ ماں کے پیٹ میں بچہ بھی لاکھ، سوا لاکھ روپے کا مقروض ہے۔ تاہم عملاً صورت حال یہ ہے کہ صرف ایک فارم داخلہ حاصل کرنے کے بعد اس کی کسی وقت کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بلکہ اس کی مناسب حفاظت کرنی مشکل ہو جاتی ہے کہ قائداعظم کی تصویر کو ایک پاکستانی کیونکر اور کیسے ردی کی ٹوکری میں ڈالے؟

اب ذرا ۱۹۵۵ء کا حال بھی ملاحظہ فرمائیں!

لاہور کے ایک پروفیشنل کالج کے پراسپیکٹس کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی جو ۷۰ صفحات پر مشتمل نیوز پرنٹ یا کسی حد تک بہتر کوالٹی کے کاغذ پر طبع شدہ جس میں کالج کے قواعد اور تعلیمی ریگولیشن درج ہوتے تھے جو گورنمنٹ پرنٹنگ پریس سے خرید کئے جاتے تھے! اور صرف ایک کاپی ہی کی ضرورت ہوتی تھی! اور درج بالا تمام فضول علائق سے مبرا ہوتے تھے___یوں والدین کسی طور پر مالی لحاظ سے زیر بار نہ ہوتے تھے!

پروفیشنل کالجز، یونیورسٹی میں داخلے کی فیس:

تعلیم کو کاروبار بنانے کا آسان نسخہ ہماری بیوروکریسی کو کیا سوجھا اور وہ بھی اس قدر ''اندھا کاروبار'' کہ ہر کہہ ومہہ نے میڈیکل، وٹرنری، لاء، انجینئرنگ یونیورسٹیاں کھول لیں۔ اس وقت درجنوں سے زائد میڈیکل یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں اسی طرح وٹرنری یونیورسٹیوں کی بھی بھرمار ہے تاہم کروڑوں روپے لے کر پاکستان میں جو میڈیکل یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں اور جو اربوں روپے لے کر پاکستان میڈیکل اینڈ ڈینٹل کونسل کی منظوری، اطلاع کے بعد کاروبار چھوڑ گئیں، ان کا تو شمار نہیں۔ یہ از خود ایک بہت دل شکن تاہم سبق آموز پہلو ہے جس پر قلم اٹھانے کی اشد ضرورت ہے!

فیس سٹرکچر

ادھر فیس سٹرکچر کا یہ حال کہ سالانہ ۱۰، ۱۲ لاکھ فیس جو اکثر وبیشتر اکٹھی اور یکمشت ادا کرنی پڑتی ہے۔ کتب کی خرید، ہاسٹل اخراجات و دیگر اس کے علاوہ___ہر یونیورسٹی نے داخلہ دینے کے نام پر اربوں روپے بیرون واندرونِ ملک رہنے والے والدین سے لوٹے کھسوٹے، اس کا کوئی حد اور حساب نہیں۔ پرائیویٹ اے لیول، اولیول سکولوں کے نام پر بقول سپریم کورٹ آف پاکستان، ایک سکول سے شروع کر کے ۱۲۵ سکول بنانے کا ریکارڈ کارنامہ گزشتہ ۲۰، ۲۵ سالوں میں واقع ہوا لیکن سرکاری ٹیکس کی مد میں برائے نام رقم کی ادائیگی کہ اس میں طبقہ اشرافیہ کے بچے پڑھتے ہیں جن کے بارے میں ایک دردمند دانش ور،

اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی کے سابق سربراہ (مرحوم) ڈاکٹر محمود غازی ۱۹۹۰) کا یہ تبصرہ پڑھنے کے لیے ہی نہیں بلکہ عبرت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

''آج قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں ہے، وہ طبقہ ایک خاص انداز کا تربیت یافتہ ہے۔ لارڈ میکالے کے زمانے سے آج تک چار پانچ نسلیں اس طبقے کے زیر اثر ایک خاص ماحول میں پرورش پا چکی ہیں۔ اس کے اپنے ادارے ہیں جن کا مخصوص ماحول ہے۔ وہ طبقہ اپنے قرب وجوار میں سڑک بھی نہیں بننے دیتے لیکن اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اس نے خصوصی ادارے بنا رکھے ہیں۔ ان کے آپس کے سیاسی و دیگر طرح طرح کے دوسرے اختلافات تو موجود ہیں مگر اس کے باوجود جس تعلیمی ادارے میں ان کے بچے پڑھتے ہیں، وہاں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ وہ سب مل جل کر انھیں مضبوط اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے پوری دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ **گویا یہ مفادات کی جنگ ہے۔** اس کے بعد جب یہاں تعلیم مکمل ہو جاتی ہے تو وہ اپنے بچوں کو انگلستان اور امریکہ کے تعلیمی اداروں میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں سے اعلیٰ تربیت پا کے وہ یہاں آتے ہیں اور ہم پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس سے ہو رہا ہے'' ـــــ ''اب ایک صورت تو یہ ہے کہ جیسے یہ سلسلہ چل رہا ہے اس کو آپ چلنے دیں۔ وہ طبقہ ہم پر حکومت کرتا رہے اور اسلامی تعلیم اور اسلامی ماحول کا یہ جزیرہ سمٹتا جائے اور سمٹتے سمٹتے نا معلوم کہاں تک پہنچ جائے اور کتنا رہ جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس طبقے کے اسلحے سے اس کا مقابلہ کریں اور جس اسلحے سے کام لے کر وہ طبقہ اسلام کا راستہ دانستہ یا نادانستہ طور پر روک رہا ہے (اکثر لوگ نادانستہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں) اس طبقے کے ہتھیار لے کر اسلام کا دفاع کریں''

بچوں کی یونیورسٹی تعلیم (بالخصوص پروفیشنل کالجز، کے لیے لاکھوں روپے کی خطیر رقم کی فراہمی (وہ بھی ۵ سال تک) ایک ایسا امر ہے جس نے وطن عزیز میں کرپشن، چوری، رشوت اور منشیات (ہیروئین) کی فروخت اور اس قسم کے بے شمار خلاف قانون اور اخلاق امور اختیار کرنے کے لیے لوگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکیں تاہم تعلیمی قابلیت اور مہارت کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس امر سے واضح ہے کہ کراچی میں ایک بہت

بڑی شاہراہ کا پل اپنی تعمیر کے چند سال بعد ہی ٹوٹ گیا اور ایک ڈاکٹر کا یہ حال ہے کہ وہ MBBS کی ڈگری لینے کے بعد کسی مریض کو Intravenous انجیکشن نہیں لگا سکتا بالخصوص بچوں کو۔اس کام کے لیے وہ نرسوں کا ہی محتاج ہوتا ہے!

شبینہ تعلیم: Evening Education

وطن عزیز میں تعلیمی سہولتوں کی کمی کے پیش نظر کسی زمانے میں کوئی صاحب دور کی یہ کوڑی لائے کہ چونکہ تعلیمی ادارے دو پہر کے بعد بند ہو جاتے ہیں اس لیے اس جگہ کو شام کے وقت تعلیم کے حصول کے لیے بھی استعمال کرنا چاہئے۔ بالغ افراد کی حد تک تو شاید یہ قابل عمل ہوتا لیکن چھوٹے اور معصوم بچوں کے لیے یہ معاملہ سوہانِ روح سے کم نہیں۔ بیوروکریٹس اور نو دولتیوں اور سیاستدانوں کے بچوں کے لیے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔انھیں تو دن کے اوقات میں داخلہ مل جاتا ہے تاہم غریب عوام کو جو تکالیف اور مسائل پیش آتے ہیں ان کا کسی کو خیال ہی نہیں کہ شاید یہ ملک ان کے لئے بنا ہی نہیں؟

اس تجویز کو یار لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا کہ ان کے لیے یہ ایک بہت اچھا موقعہ تھا کہ ایک دن میں دہرا منافع کمایا جائے۔اب صورت حال یہ ہے کہ دو پہر کے وقت اگر ایک جانب صبح کی کلاسز کی چھٹی ہوتی ہے تو دوسری جانب سہ پہر، شبینہ کلاسز کے طلبہ کی آمد بھی شروع ہو جاتی ہے۔شہروں کی گنجان آباد علاقوں میں اکثر تعلیمی ادارے بڑی سڑکوں پر قائم ہیں، وہاں ٹریفک کے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں وہ اپنی جگہ دردسر سے کم نہیں کہ بچوں اور دفتری ملازمین کے لیے گھروں تک آتے آتے ۳، ۴ بج جاتے ہیں۔ دوسری جانب رات (مغرب کے لگ بھگ) بالخصوص سردیوں میں اندھیرا، بارش کی وجہ سے بچوں کا بسوں، ویگنوں یا پیدل آنا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے____ کاش کسی بیوروکریٹ یا تعلیم کے وزیر نے پنڈی، اسلام آباد، لاہور، کراچی میں کسی جگہ جا کر از خود حالات کا مشاہدہ کیا ہوتا تو انھیں پتہ چلتا کہ ماں باپ کس طرح اپنے بچوں کی سلامتی کے لیے دعائیں کرتے ہیں جبکہ لاقانونیت، حادثات اور قتل و غارت کا ایک بازار ہر طرف گرم ہے!

اس طریق تعلیم کا ایک دوسرا پہلو بھی کم اہمیت کا حامل نہیں۔اکثر و بیشتر صبح کے وقت

پڑھانے والے اساتذہ ہی یہ ''خدمت'' بھی سرانجام دیتے ہیں۔ کالجوں، یونیورسٹیوں میں بالخصوص پرائیویٹ یونیورسٹیوں میں بطور ''رسم'' کے کلاسز ہوتی ہیں۔ شاید ایک فی لاکھ اساتذہ (سینئر اساتذہ بالخصوص) شام کی کلاسز لیتے ہیں اور چونکہ طلبہ کی ۹۵ فی صد سے زائد تعداد بھی ''بالغ'' منجھے ہوئے ملازمت پیشہ افراد' کی ہوتی ہے تو پھر یہ ایک ''امداد باہمی کی انجمن'' بن جاتی ہے۔ استاد اور طالب علم مل جل کر تعاون کرتے ہیں اور ہفتے میں ایک دو دن کا ٹائم ٹیبل بنا لیتے ہیں تاکہ خانہ پُری کی جا سکے ــــ یوں اساتذہ کی تنخواہ دوگنی، سہ گنی ہو جاتی ہے اور لوگوں کو بغیر پڑھے ڈگری مل جاتی ہے ــــ ماضی میں (اور شاید اب بھی) یونیورسٹی میں انتظامی امور پر فائز لوگوں نے اپنے مناصب کی بناء پر اس سہولت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اعلیٰ ڈگریاں لے کر کلرکی سے رجسٹرار اور خازن (۲۰ گریڈ) میں ترقیاں حاصل کیں ــــ سپریم کورٹ آف پاکسان نے حال ہی میں پرائیویٹ سکولوں کے ڈائریکٹرز کو ۸۰، ۸۰ لاکھ روپے تنخواہ کی ادائیگی پر بھی سوال اٹھایا کہ ایسے ایسے ''نابغہ روزگار'' لوگ بھی یارب ان بستیوں میں بستے ہیں جبکہ ان حضرات میں اکثر و بیشتر اپنے خاندان کے لوگوں ہی پر مشتمل ہوتے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں ملازمت

پبلک یونیورسٹیوں میں بالخصوص لیکچرار کی تعیناتی میں جہاں بے شمار نقائص اور خامیاں ہیں (سفارش، رشوت، ذات برادری وغیرہ) وہاں یہ حقیقت بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ تعیناتی سے قبل یہ طلبہ یونیورسٹیوں میں طلبہ کی دھڑے بندیوں (طلبہ تنظیموں، برادری اور علاقائی ولسانی پارٹیوں) کی سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں، اس لیے مسلسل ایسے اساتذہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جو اس قسم کی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں ــــ اس قسم کے طلبہ، نوجوان لیکچرار چونکہ سفارش کی بناء پر تعینات کئے جاتے ہیں اس لیے وہ سینئر اساتذہ کے ہر قسم کے احکامات (خلافِ قانون، غلط) کی دل وجان سے بجا آوری کرتے ہیں۔ سینئر اساتذہ اپنے طلبہ کی تحقیق اور لکھنے کا کام بھی انھیں سونپ دیتے ہیں۔ چونکہ اس کام کی انھیں تربیت نہیں ہوتی اس لیے ایسی ایسی ''حرکات'' کا انکشاف ہوتا ہے کہ

۔۔۔۔لیکن اس قسم کی تمام تر حرکات کا خمیازہ غریب طلبا، طالبات ہی کو بھگتنا پڑتا ہے کہ عرصۂ دراز تک انھیں ڈگری ہی نہیں ملتی۔ تاہم اس بارے میں مزید ایک مثال اسلام آباد کی ایک وفاقی یونیورسٹی کی بہت دردناک ہے!۔ جہاں اکثر طلبا/ طالبات ایک طویل عرصے سے ایک پروفیسر صاحبہ کی اس قماش کی حرکتوں کا شکار ہورہی ہیں اور پھر وائس چانسلر بھی ایک ایسے صاحب ہیں جو اپنے ''ذوق تماش بینی'' میں بہت مشہور ہیں۔

اس طرح کی تمام تر مشکلات کا تدارک یوں کیا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹی سطح پر لیکچرار کی آسامی پر تعیناتی کے لیے بھی کم از کم ۶ ماہ کا ریفریشر کورس ضروری قرار دیا جائے تا کہ انھیں طریق تعلیم کے ابتدائی اسباق ذہن نشین ہو جائیں۔۔۔۔ یہ ایک طرفہ تماشہ ہے کہ پرائمری سے لے کر ہائی سکول کے طلبہ کے لیے ٹرینڈ ٹیچر (کم از کم بی ایڈ، ایم ایڈ) کی شرط ہے جبکہ ہائیر ایجوکیشن میں اس قسم کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔

یونیورسٹیوں میں رجسٹرار، خازن کا کردار:

گزشتہ ۵۰ سالوں میں وطن عزیز میں جس انداز میں یونیورسٹیاں (پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں) کھمبی (Mushroom) کی فصل کی طرح اُگی ہیں، ان میں ''رجسٹرار اور خازن'' کا کردار بھی ایسا ''من موہنا'' رہا ہے کہ یار لوگ اچھے بھلے تعلیم و تعلم کے کار انبیاء کو چھوڑ کر ''رجسٹرار جیسی کلرکی'' کو ترجیح دینے لگے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوا کہ **رجسٹرار اور خازن نے ''سانجھا'' کرلیا اور یوں کسی کمزور وائس چانسلر کو یرغمال بنالیا۔ ہر دو حضرات اساتذہ کے ایک گروپ کو ساتھ ملا کر اس قدر مضبوط جتھہ بندی کر لیتے ہیں کہ وائس چانسلر کو ان کی منشاء اور پالیسی کے مطابق کام کرنا پڑتا** ہے۔ تاہم اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ''ہوشیار'' وائس چانسلر نے ان دونوں کو اپنے ساتھ ملا کر ''حکومت'' کرنی شروع کر دی۔۔۔۔ ہر دو صورتوں میں برادری ازم کے گٹھ جوڑ نے ایک گھناؤنا کردار ادا کیا ہے۔ پنجاب میں برادری کے نام پر صوبے کی ۳، ۴ یونیورسٹیوں اور وفاق میں تحقیقی اداروں میں ایک ہی برادری کے لوگوں کے طویل عرصے تک وائس چانسلر وغیرہ کے عہدے پر قبضہ رہا تاہم جس کا علاج بالآخر سپریم کورٹ کو کرنا پڑا۔ اس قسم

کے حالات دوسرے صوبوں میں بھی رہے جہاں ایک سیاسی پارٹی نے ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کو اپنے لیے جائز قرار دیا ہوا ہے۔ ایسے حالات میں اگر کسی وائس چانسلر اور اس کے چند پروفیسرز کو ہتھکڑی لگ جائے تو ہر صاحب ایمان کو دلی دکھ تو ضرور ہونا چاہئے کہ اسلامی معاشرے میں استاد کا مرتبہ بہت بلند و بالا سمجھا گیا ہے لیکن جب استاد ہی اپنا وقار چند ٹکوں کے عوض، سفارش یا خلاف قانون طریقوں سے کرنے لگے تو پھر گلہ شکوہ کیوں اور کس سے؟◆

یونیورسٹیوں میں تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کے لیے یہ **ضروری ہے کہ ایک ہی صوبے میں تینوں آسامیوں وائس چانسلر، رجسٹرار اور خازن کے لیے ۳ سال بعد تبادلے کا قانون بنایا جائے اور یوں ان تینوں آسامیوں کو مختلف صوبوں میں تعینات کیا جائے** تاکہ ذات برادری، لسانیت، علاقائیت کی بنیاد پر قائم ہونے والی دھڑے بندیوں کا تدارک کیا جاسکے ـــــ اسی قسم کا قانونی بندوبست پرائیویٹ یونیورسٹیوں کے لیے بھی کیا جائے۔

ہماری ان گزارشات سے ہوسکتا ہے کہ کسی کو کوئی ذہنی اشکال ہو جو بالخصوص تعلیم کو اپنے ذاتی / سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرتے رہے ہوں! تاہم تعلیم اور ریسرچ کے مفاد میں ہم علی وجہ البصیرت یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے بہتری کا ظہور ہوگا۔ ان تین مناصب اور اختیار رکھنے والے لوگوں کے گٹھ جوڑ نے گزشتہ ادوار میں تعلیمی معیار کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ یہی صورت حال وفاقی یونیورسٹیوں میں بھی ہونی چاہیے!

امتحانی نظام کو بہتر بنانے کے لیے صوبے کی دوسری یونیورسٹیوں سے سینئر اساتذہ کو بلانے کے لیے اخراجات کم کرنے کی پابندی اور ماضی میں پرچوں کی چیکنگ پر شرح معاوضہ پر ۱۹۶۵ء کے جہاد کی بناء پر کمی کی گئی (جو شاید اب تک جاری ہے) اساتذہ کو

◆ یہ امر اقرار الحق صاحب جن کا ARY ٹیلی ویژن سے تعلق ہے، کے لئے غور و فکر کا ایک وسیع میدان ہے۔ حالیہ دور میں انہوں نے ملی سطح پر جن چند ''میگا بدعنوانیوں'' کو طشت از بام کیا ہے، وہ قابل تحسین ہے! کیا ان کا ذوقِ تحقیق اب ٹھنڈا پڑ گیا ہے؟

مختلف سہولتوں از قسم ٹرانسپورٹ ایڈوانس، ہاؤس رینٹ الاؤنس اور اسی قسم کی دیگر سہولتوں پر پابندی کو اٹھانے کے لیے اساتذہ تنظیموں نے جس قدر تکلیف اٹھائی وہ ماضی کی چند تلخ یادوں سے بھرپور ہے۔ اسی طرح تعلیمی، تحقیقی امور کے لیے کئے جانے والے ٹریولنگ الاؤنس پر جسقدر تخفیف کی گئی، تجربات کے لیے کیمیکلز اور دیگر سامان کی خرید کے لیے اپنے منظورِ نظر افراد کو ٹھیکے دینے کے لیے مختلف حربوں (از قسم کوٹیشن کھولنے کا اختیار خازن کو ہوتا تھا) ❶ نیز کتب کی خرید پر طلبہ اور اساتذہ کی ضروریات کا خیال نہ کرنا بلکہ کمشن کی خاطر لائبریرین کی وساطت سے ہر قسم کی رطب و یابس کتب خرید کرنا وغیرہ، چند ایسے امور ہیں جن سے اساتذہ برادری کا ہر رکن آگاہ ہے۔

حال ہی میں یونیورسٹیوں کی بلڈنگز میں اضافے (بلکہ فیصل آباد کی ایک یونیورسٹی کے مین گیٹ کی تزئین و آرائش پر لاکھوں روپے کے اخراجات اپنے منظورِ نظر ٹھیکیداروں کے ذریعے) اور کروڑوں/ اربوں روپے کے گھپلے صوبے کی مختلف یونیورسٹیوں میں کئے گئے۔ ان تمام امور کا بدقتِ نظر جائزہ لینے سے، مزید متعدد اساتذہ، وائس چانسلر کا بھی ہتھکڑی کے آہنی زیور سے آراستہ ہونا، چنداں حیرت کا باعث نہ ہوگا۔

حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

❶ ایک یونیورسٹی میں خازن صاحب نے اپنے منظورِ نظر افراد کو ٹھیکہ دیا ہوا تھا۔ خازن صاحب کوٹیشن کھولنے پر اگر اپنے ''ملازم ٹھیکے دار'' کا نرخ زیادہ دیکھتے تھے تو وہ اسے بلا کر اس کی کوٹیشن میں چند پیسے/ روپے کم کر دیا کرتے تھے۔ چند احباب نے جب اس مسئلے کو سینٹ میں اٹھانا چاہا اور انھیں اس کی بھنک پڑ گئی تو انہوں نے سینٹ کی میٹنگ سے چند لمحات قبل ایک نوٹیفکیشن کے ذریعے یہ اختیار ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ کو سونپ دیا ـــــ ''بے تاج بادشاہ'' ایسا ہی کیا کرتے ہیں!

باب پنجم

ہائر ایجوکیشن کمیشن
(HIGHER EDUCATION COMMISSION)

اب ہم اپنے موضوع کے تیسرے اہم ترین جز ویعنی وہ ادارہ جو وطن عزیز میں ہائر ایجوکیشن کا ذمہ دار اور نگران ہے کی جانب آتے ہیں۔ ماضی میں اس ادارے کی تشکیل اور کارکردگی کے بارے میں جو بھی اعلیٰ ترین مقاصد بیان کیے گئے ہوں گے تاہم گزشتہ سالوں کی کارکردگی کی بنا پر یہ ادارہ ان توقعات پر پورا نہیں رہ سکا کیونکہ یونیورسٹیوں کی سطح پر جس قدر کرپشن (علمی/تحقیقی/ مالی وغیرہ) اور قاعدے/قوانین کی بے حرمتی نیز بے قاعدگی اس کمیشن میں یا اس کے ذریعے سے یا اس کے تساہل کی بناء پر ہوئی ہے، وہ شاید ہی کہیں ہوئی ہو۔۔۔۔ سب سے پہلے اس کی مختصر تاریخ کا جائزہ لیں۔

ہائر ایجوکیشن کمیشن کا قیام صدر مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک آرڈیننس کے ذریعے ۲۰۰۲ء میں عمل میں آیا جس کے فرائض میں وطن عزیز میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق کو ترقی دینا نیز یونیورسٹیوں کی کارکردگی کا جائزہ لینا اور اس کے متعلقہ مسائل پر راہ نمائی دینا تھا۔ گزشتہ سالوں میں کمیشن نے جو خدمات سرانجام دیں، وہ مختلف سالانہ رپورٹوں کی شکل میں صرف ۲۰۱۵ء تک انٹرنیٹ پر پڑھی جاسکتی ہیں۔ تاہم گزشتہ ۴ / ۵ سالوں کی رپورٹوں کا منظر عام پر نہ آنا کمیشن کی ''اعلیٰ کارکردگی'' کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس ضمن میں متعدد سوالات میں اہم ترین سوال یہ ہے کہ اتنے ذرائع وسائل اور فوج ظفر موج عملے کے باوجود (چپڑاسی سے لے کر ۱۷ تا ۲۱ / ۲۲ گریڈ کے افسران بھی بمعہ چیئر مین) سال بہ سال سالانہ رپورٹوں کی تیاری/ اشاعت کیوں نہ ہوسکی؟ کمیشن کے جن اعلیٰ افسران نے اس اہم ترین فریضے سے کوتاہی برتی کیا ان سے کوئی باز پرس ہوئی؟ وزارت تعلیم، قومی اسمبلی،

سینیٹ نے کبھی اس مسئلے پر کوئی استفسار کیا؟ لیکن اس ''جمہوری دور میں ان امور کی کسے پرواہ ہے___ اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۰۱۵ء کے دوران ۱۹۶ سکالرز Ph.d کی ڈگری غیر ملکی یونیورسٹیوں سے حاصل کرنے کے بعد ملک کی مختلف یونیورسٹیوں ، اداروں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں ۔ اس بارے میں مزید گفتگو آئندہ صفحات میں کی گئی ہے۔

ہائر ایجوکیشن کمیشن کی تاریخ، مقاصد اور طریق کار کے بارے میں نہایت مختصر معلومات کے بعد، ان ''اصلاحی اور انقلابی'' اصلاحات کا بہت مختصر جائزہ کہ اس کے لیے

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک!

سیکورٹی اقدامات

☆......اول قدم پر ایک اہم امر جس سے HEC سے متعلق کسی بھی فرد کو جسے **بدقسمتی** سے اس ادارے سے کام پڑ گیا، وہ یہ کہ کمیشن کے دروازے ہر اس شخص کے لیے بند کیے گئے ہیں جسے وہاں پر کوئی کام ہو۔ راولپنڈی میں GHQ پر تو ایک زمانے میں تخریبی کارروائی ہوگئی تھی لیکن مجال ہے کہ کسی شخص کو اپنے کام کے لیے کمیشن میں گھنٹوں یا دنوں کے بعد بھی اندر تک رسائی ہو سکے!

(i) پہلی بات تو یہ کہ اگر کسی شخص کو کراچی/ پنجاب یا کسی دور دراز علاقے سے آنا ہے تو وہ بلا پیشگی اجازت (بذریعہ ٹیلی فون یا E-mail) نہیں آ سکتا۔ ٹیلی فون کا یہ حال کہ گھنٹوں کوشش کے باوجود جواب نہیں ملتا اور اگر شومئ قسمت سے مل گیا تو نوجوان نسل کے ہونہار اسسٹنٹ ڈائریکٹر صاحب جس انداز خسروانہ سے بات کرتے ہیں کہ انہیں اس امر کا بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ ''سائل'' کتنی دور اور مشکل سے (باوجود ۲۰ /۲۱ گریڈ کے سینئر پروفیسر) ٹیلی فون پر درخواست گزار ہے۔ پہلے قدم پر بہت ہی ٹیکنیکل قسم کا جواب ہوتا ہے (جیسے ٹیلی فون پر کال کا جواب دینے کے لیے خودکار سسٹم جس میں کم از کم ایک خوبصورت آواز آپ کو انگریزی اور بعد میں اردو میں جواب دیتی ہے)۔ یہ بھی گوارا لیکن افسر صاحب یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ ''اس پر پالیسی نہیں بنی یا بن رہی ہے۔''

اگر کسی کو شرفِ باریابی حاصل ہو گیا اور وہ بدقسمت (بالخصوص خواتین اساتذہ)

طویل سفر اور اخراجات کے بعد اسلام آباد دفتر پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو پھر کسی وقت متعلقہ ڈپٹی ڈائریکٹر یا ڈائریکٹر صاحب موجود نہیں ہوتے یا کسی میٹنگ میں مصروف اور اگر سائل کی خوش قسمتی سے مل بھی گئے تو اکثر و بیشتر وہ اس قسم کے قوانین کا سہارا لیتے ہیں جو بہت ہی مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی یہ خیال نہیں آتا کہ سائل کہاں اور کس قدر دقت کے ساتھ ان کے ''حضور'' باریابی کے لئے حاضر ہوا ہے!

اعلیٰ ترین مقالہ جات کی اشاعت سے متعلقہ چند امور

(ii) ایم فل/ پی ایچ ڈی کے مقالے کی کمیشن کے کسی مصدقہ جرنل میں اشاعت پر ایک خاص رقم دی جاتی ہے لیکن اس کا طریق اس قدر طویل، مشکل اور **''جان لیوا''** ہے کہ شاید ہی کسی خوش نصیب نے اس سے فائدہ اٹھایا ہو کہ اس تمام تر کارروائی کے لیے خاصی رقم کے علاوہ جو وقت اور محنت کرنی پڑتی ہے، وہ کسی ایسے پروفیسر کا تو کام نہیں جسے طلبہ کو محنت اور ایمانداری سے پڑھانا یا تحقیقی مقالہ لکھوانا ہو البتہ **''دیہاڑی دار اساتذہ''** کی ایک بڑی تاہم خاص تعداد ہی اس سے استفادہ کر سکتی ہے کہ ان کے پاس **صرف اس کام کے لیے وافر وقت ہوتا ہے** اور شاید کمیشن میں کسی کے ساتھ اس قدر گہرے تعلقات بھی ہوتے ہوں کہ انہیں کمیشن کے دفتر میں کوئی دقت نہ ہوتی ہو!

(iii) دنیا جہان میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالہ جات اس قدر گراں تصور کیے جاتے ہیں کہ بعد ازاں انہیں کتابی شکل میں شائع بھی کیا جاتا ہے۔ **دنیا میں پاکستان کا ہائر ایجوکیشن کمیشن شاید منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ ان کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔** اگر وہ مقالہ کسی کتاب کی شکل میں شائع ہو گیا ہے تو دنیا بھر میں مصنف کو اسے کسی سائنسی جرنل میں شائع ہونے کے برابر حیثیت دینا یا سالانہ اضافہ تنخواہ میں (۲ / ۳ انکریمنٹ کا ملنا وغیرہ) بطور حوصلہ افزائی دیا جاتا ہے۔ **یہاں صورت حال بالکل مختلف بلکہ برعکس ہے۔** نہ صرف ان میں سے کسی ایک قسم کا Incentive بھی نہیں دیا جاتا بلکہ اگر بدقسمتی سے کسی نے اس بارے میں کمیشن سے رجوع کر لیا تو کمیشن کے مختلف سربراہان کا علمی کمال کہ اس کے لیے بھی ایک **ہفت خواں کلرکی طریق کار** مثلاً ۸

کتب (جن کی قیمت ہزاروں روپے بنتی ہے اگر وہ کتاب مغرب/ امریکہ میں چھپے) بمعہ دیگر لوازمات درخواست اور معلومات وتصدیقی سفارشات کا ایک گورکھ دھندا اس پر مزید یہ انوکھا طریقہ کہ ۸ **کتب بذریعہ ڈاک یا بالمشافہ نہیں بلکہ بذریعہ کوریئر سروس بھیجی جائیں** جس پر دوبارہ چند ہزار روپے لگتے ہیں۔ براہِ راست جمع کرانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس طرح شاید کتابوں میں ''ملفوف ایٹم بم'' کا خطرہ ہوتا ہے!

اس سے اگلا قدم مزید پریشانی کا باعث ہے کہ درخواست بمعہ ۸ کتب۔ ''بحضور شہنشاہ معظم'' جمع کرانے کے بعد، کمیشن کی طرف سے سالہا سال گزرنے پر بھی منظوری یا رد کرنے کی اطلاع نہیں دی جاتی۔ مہینوں انتظار کے بعد ٹیلی فون پر جواب حسب سابق ناقابل حصول یا اگر کوئی قسمت کا مارا رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو کوئی کرخت آواز اسے جھڑکنے کے انداز میں یہ خوشخبری سنا دیتی ہے کہ ''ماہرین کے پاس سے جواب نہیں آیا'' یا ''پھر ماہرین نے اس کتاب کو ایک مقالے کی اشاعت کے ''وزن'' برابر بھی نہیں گردانا''___ ہائر ایجوکیشن کمشن نے اگر یہی جواب دینا تھا (وہ بھی کم از کم سال/ ڈیڑھ سال بعد) **تو کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ایم فل/ پی ایچ ڈی کی ایسی ''نادر تخلیق'' پر ڈگری ہی ضبط کر لی جاتی!** اس پر مزید ظلم یہ کہ ان ماہرین کی آراء سے بھی مصنف کو آگاہ نہیں کیا جاتا۔ تاکہ نہ صرف وہ ان غلطیوں کی اصلاح کر لیتا جس پر غیر ملکی اداروں کے ماہر پروفیسروں نے تو Ph.D ڈگری دینے کی منظوری دیدی لیکن **پاکستان کے ارسطو اور بقراط جیسے پروفیسر اسے رد کر دیتے ہیں!**___◆ اہل علم و ہنر (پروفیسر صاحبان) کو مبارک ہو کہ کمیشن کے کسی کلرک نما اسسٹنٹ یا ڈپٹی ڈائریکٹر کو یہ نہیں سوجھا کہ وہ اس قسم کا قانون بھی بنا دیتے وگرنہ کسی صاحب کتاب کو اپنی ڈگری کے لینے کے دینے پڑ جاتے!___ ہم نے کتاب کے آغاز میں کمیشن کی کارکردگی کے بارے

◆ وطن عزیز میں کسی زمانے میں ایسے ''پروفیسر'' بھی پائے جاتے تھے جو سڑک کنارے ''طوطے سے فال نکالنے'' کے ذریعے لوگوں کو مستقبل کی خوش خبری سنایا کرتے تھے!___ شاید اب اسی قسم کے پروفیسروں نے یونیورسٹیوں پر قبضہ کر لیا ہے!

میں ''غیر تسلی بخش'' ہونے کا ذکر کیا ہے۔امید ہے کہ اب کسی کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

یہاں ہم اپنے اس شکوہ کو بجا تسلیم کرنے پر اصرار کریں گے کہ جس انداز کی ''قلعہ بندی'' کمیشن کی عمارت کی حفاظت کے لئے کی گئی ہے، وہ کسی تعلیمی ادارے کی نگرانی اور راہ نمائی کرنے والے ادارے کو زیب نہیں دیتی۔آپ سکریننگ مشین لگائیں، گارڈز کی تعداد بڑھا دیں، ''عمارتِ مقدسہ'' سے باہر کسی جگہ پر ''جامہ تلاشی'' کا بندوبست کر لیں تاہم خدارا **قوم کے معلم کو اس قدر ذلیل وخوار نہ کریں** کہ وہ اپنی ہی نظر میں گر کر رہ جائے۔

(ا) ہائیر ایجوکیشن کمیشن کا ایک اچھا اقدام جسے یونیورسٹی سطح پر ''اساتذہ کے ایک مافیا'' نے ملی بھگت کے ذریعے اپنے ذاتی فوائد کے لیے استعمال کر کے ایک ناقابل معافی جرم بنا دیا ہے، وہ یونیورسٹی/محکمانہ یا موضوعاتی ریسرچ جرنل میں ایم فل/ پی ایچ ڈی کے مقالہ جات کی اشاعت ہے اور ڈگری کے اجراء سے قبل کم از کم دو مقالوں کی اشاعت کا لازمی ہونا ہے۔اس ضمن میں گزشتہ صفحات میں ہم نے جو معروضات کی ہیں، ضرورت ہے کہ اس اعلیٰ روایت کو پروان چڑھانے کے لیے یونیورسٹیاں ازخود ایک فول پروف سسٹم وضع کریں اور HEC اس پر سختی کے ساتھ عمل درآمد بھی کرے تا کہ اس قسم کا مافیا اسے اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے اور جن لوگوں نے اس قانون کی خلاف ورزی کر کے پروموشن اور مالی فوائد لیے ہیں انہیں قرار واقعی سزا دے کر ان کے ایسے زائد تعداد میں مقالہ جات کو منسوخ کیا جائے!'' نیز اس دور کی تنخواہ و دیگر سہولتوں کا ہرجانہ بھی وصول کیا جائے اور ان کی پروموشن کو ختم کیا جائے!

ڈاکٹر عطاء الرحمن صاحب کے دور میں بہت سی انقلابی اصلاحات تعلیمی نظام بالخصوص ہائر ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے بارے میں کی گئی تھیں۔لیکن ایک تو وہ دور بہت ہی مختصر تھا نیز ایک نہایت ہی بنیادی امر جو تمام اصلاحی اقدامات (حتیٰ کہ الہامی تعلیمات میں بھی شرک و

نفاق کی آمیزش کرنے سے اسے بازیچہ اطفال بنا دیتا ہے) کو سبوتاژ کر دیتا ہے، وہ خدا، رسولؐ اور آخرت میں جواب دہی کے تصور سے ماورا ہونا ہے۔ ان تصورات کی بنیاد پر استوار نظام ہی میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ کسی کو سیدھے راستے پر قائم رکھ سکے جیسا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں عرب میں ہوا تھا کہ ان تصورات پر عمل کرنے سے عربوں کی حالت میں ایسا انقلاب آ گیا تھا جس کی نظیر تاریخ میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی!

اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایک ایسے دور میں جہاں صرف نام کی حد تک لوگ مسلمان کہلاتے ہوں جبکہ ان کے سامنے ایسے ایسے صدر مملکت اور وزرائے اعظم کے ''اسوۂ ہائے کرپشن'' ہوں، وہاں موجودہ نسل کے سترہ اور اٹھارہ گریڈ کے افسران کے لیے اسلام آباد کے کسی 4 سٹار ہوٹل میں ہائی ٹی، ڈنر یا لنچ کی دعوت ایک ایسی خوش نما پیش کش ہے جو دور دراز سے آنے والے کسی نوجوان استاد کے لیے ہائر ایجوکیشن کمیشن کے تمام دروازے ہی نہیں بلکہ فائلوں تک کو ''آ ہے گا ہے'' مکمل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ایسے نوجوان اساتذہ کو پراجیکٹ ہی نہیں ملتے بلکہ ان کی رقوم بھی بہت جلد ادا کر دی جاتی ہیں۔ اس طرح پراجیکٹس کی تکمیل میں کسی قسم کی کمی/کوتاہی، دانستہ بے ایمانیوں اور ہر قسم کے تسامح سے اغماض برتا جاتا ہے اور یوں وہ مستقبل میں بڑے بڑے پراجیکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو بالآخر مستقبل میں ان کے لیے پروفیسر/ڈین/وائس چانسلر بننے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ البتہ جہاں تک ان پراجیکٹس کی عملی افادیت اور ملک وملت کے لیے بہتری کا سوال ہے تو ایسی باتوں کا اس زمانہ میں کسے خیال ہے؟ اس قسم کی دقیانوس فکر کو تو ہم نے اس وقت ہی خیر باد کہہ دیا تھا جب آج سے پچاس سال قبل ہم نے کالج/یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
ایک دیوانہ سرِ راہ پکار اٹھا تھا
کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو

اور بقول علامہ اقبال:

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

ہم نے درج بالا جو "حرف چند" تحریر کیے ہیں وہ اپنے دل پر جبر کر کے بیان کیے ہیں۔ اپنے زخم جگر کو چھیڑنا، کسی بھی معقول شخص کے لیے کوئی خوش گوار عمل نہیں ہوسکتا لیکن مریض کی صحت یابی کے لیے ایک سرجن کو کسی حد تک یہ ظلم وستم کرنا پڑتا ہے—— وگرنہ موجودہ حالات میں اس قسم کے واقعات تو اس تسلسل کے ساتھ ہو رہے ہیں کہ **ان پر اگر کوئی صاحب دل قلم اٹھائیں تو پاکستان کی چند یونیورسٹیوں سے ہی اساتذہ کے سینکڑوں ایسے سٹڈی کیس مل جائیں گے جو کسی نہ کسی صورت کمیشن کے زاغ نما شاہین اہل کاروں کے ہاتھوں زخم خوردہ ہیں** لیکن اساتذہ برادری کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جو

ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم

کے مصداق بنے بیٹھے ہیں۔ ایسے عالم میں کوئی مردِ حُر ایسا ہو جو میڈیا میں اس موضوع کو اپنی تحقیق وجستجو کا موضوع بنائے اور ان حقائق کو بیان کرے جو جسدِ ملی کو سرطان کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہے ہیں لیکن امت اور اس کے ذمہ داران، خواب خرگوش میں محو ہیں!

درج بالا چند امور سے بھی بہت زیادہ اہم معاملہ کمیشن کے اعلیٰ مناصب پر متمکن اصحاب کا ہے جو شاید علم وفضل کے لحاظ سے تو اس ملک کی کریم سمجھے جاتے ہیں لیکن ملکی سطح پر اس قسم کے تمام افسران کی کارکردگی نہایت مایوس کن رہی ہے۔ بیوروکریسی کا حال تو چیف سیکرٹری صوبہ جات اور وفاقی سطح پر وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری کی کارکردگی سے حالیہ دنوں میں نیب اور سپریم کورٹ کے ذریعے سامنے آ گیا ہے۔ ان کے کردار کا تو یہ عالم ہے کہ گویا وہ وزرائے اعلیٰ یا وزیراعظم کے سامنے ایک دفتری یا زیادہ سے زیادہ ایک جونیئر کلرک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ جبکہ اپنے سے کم تر لوگوں کے لیے وہ کسی "ہامان" سے

کم نہیں ہوتے۔ ◆ **دستور اور قانون کے مطابق کام کرنے والی بیوروکریسی نام کی کوئی مخلوق تو شاید وطن عزیز میں پائی ہی نہیں جاتی اور اگر کہیں کوئی ایسی نادر الوجود ہستی (الا ماشاء اللہ)** موجود ہے بھی تو وہ کسی ایسے شعبے میں اپنی تنخواہ لینے کے سوا کسی قابل ذکر کردار ادا کرنے کے قابل نہیں۔

حمیت نام تھی جس کا، گئی تیمور کے گھر سے!

ریسرچ پراجیکٹس کی فنڈنگ کا پیچیدہ طریقہ

اس طویل تر بیان کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ کمیشن کے بیشتر فاضل ارکان کا کام بھی صرف کلرکوں کے بنائے ہوئے نظام پر دستخط کر کے اپنی ''حاضری'' لگانے کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ اس ضمن میں ان حضرات کی ذہنی، علمی اور عملی حالت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ تحقیقی پراجیکٹس کے لیے فنڈنگ کی فراہمی کمیشن کے نہایت اہم فرائض میں شامل ہے۔ اس کے لیے جو پروفارما بنایا گیا ہے (وہ کسی کلرک کے ذہن رسا کا اعلیٰ ترین نمونہ تو ہوسکتا ہے) لیکن کسی پڑھے لکھے فاضل ممبر کمیشن کا نہیں ہوسکتا جس نے اسے خود بغور دیکھا ہو۔ ایک کلرک تو کام کی ابتدا (کسی بھی کیس کو ڈیل کرنے کا آغاز) اس امر سے کرتا ہے کہ یہ کسی بے ایمان اور چور شخص کی تجویز ہے جس میں اس نے 75 فی صد فنڈز سے زیادہ رقم کو خورد برد کرنا ہے۔ اس لیے ایسے چیک اینڈ بیلنس بنائے جائیں کہ سرکاری رقم ضائع نہ ہونے پائے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر اس میں ان کا اپنا حصہ ہو تو اربوں روپے کی کرپشن، جس کا بازار ایک معمولی سرکاری دفتر سے لے کر وزیراعظم ہاؤس تک گرم رہا ہے۔ ایسی تمام کوتاہیوں کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

◆ موجودہ دور میں بیوروکریسی کی Go Slow Policy اس کا منہ بولتا ثبوت ہے جو انہوں نے موجودہ حکومت کو ناکام بنانے کے لئے نہایت خاموشی سے اختیار کر لی ہے۔ جرائم اور کرپشن کے حالیہ واقعات اس پر شاہد ہیں! اب حال ہی میں ''شہریوں کے شکایت سیل'' (Citizen Portal) کا حال بھی اس بیوروکریسی کے ہاتھوں یوں خراب ہو رہا ہے کہ مہمات مسائل گرانفروشی، رشوت اور اس قسم کی شکایات پر ''سب اچھا'' کی رپورٹ اوپر بھیج دی جاتی ہے جب کہ ڈپٹی کمشنر/کمشنر کسی معاملے کو سنجیدگی کے ساتھ حل کرانے کے لئے تیار نہیں!

پروفارما بنانے میں جس قدر دقت نظر کا مظاہرہ کیا گیا ہے، ہمارا دعویٰ ہے کہ کمیشن کا کوئی بڑے سے بڑا افسر بھی اسے ایک ہفتے میں (بلا کسی مدد) صحیح طور پر مکمل کردے تو ہم انہیں کسی بڑے سے بڑے ''سول ایوارڈ'' کا مستحق سمجھیں گے! ہماری معلومات کی حد تک، وطن عزیز کی کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں شاید ہی کوئی ایسا ''نابغۂ روزگار'' (Super Intellectual) مل جائے جس کے پُر کیے ہوئے پروفورما کو کمپیوٹر پہلی مرتبہ ہی صحیح قرار دیدے۔ ہم نے اساتذہ کی ایک بہت بڑی تعداد کو اس کوشش میں بار بار ناکام ہوتے دیکھا—— یاد رہے کہ اس میں ایسے ایسے ذہین/ قابل اور محنتی اساتذہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے پراجیکٹ کے خدوخال اور تفصیلات، اغراض ومفاد اور اہداف کا تعین کرنے میں شاید دو ہفتے بھی نہ لگائے ہوں گے کہ وہ اپنے اپنے مضمون/ موضوع کے شناور ہوتے ہیں لیکن اس مرحلے پر آ کر انہوں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے، اکثر اس کوشش کو چھوڑ دینے کا عزم کرتے دیکھا ہے جبکہ ہمیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں گئی وہ رائیگاں نہیں!

صورت حال یہ ہے کہ اس قسم کے چیک اینڈ بیلنس کے گوشوارے بناتے وقت (جیسا کہ درج بالا سطور میں اشارہ کیا گیا) یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کا کوئی استاد بھی (جو بدقسمتی سے صحیح طریق پر تخلیق کے ذریعے علمی افق کو وسیع تر کرنے کا خواہاں ہو وہ درجہ اول کا ''زردار'' اور ''شریف بے ایمان'' ہے)۔ اور پروفارما بنانے والے کلرک صاحب اس کی تمام تر بے ایمانیوں کا تدارک کرنے کے لیے اس کمپیوٹر پروگرام کو اس قدر مشکل اور پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ سیدھے طریقے پر دو اور دو چار جواب حاصل کرنا ایک امر محال بن جاتا ہے (یہاں ہم اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ بلا شبہ حالیہ چند دہائیوں میں سیاسی میدان میں اس قسم کا ایک طبقہ اس قسم کی بدعنوانیوں میں ملوث رہا ہے تاہم اس کا علاج یہ نہیں)۔ دیکھا گیا ہے کہ درج بالا سطور میں بتائے ہوئے غلط طریقوں کے مطابق چالاک اساتذہ کو بڑے بڑے منصوبے مل جاتے ہیں۔ جبکہ ملت کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا!

اس قسم کے امور کو سرانجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ کمیشن کے اعلیٰ افسران کسی ماہر کمپیوٹر سے سادہ اور آسان پروگرام بنوائیں اور خود بھی اس کام کی نگرانی کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں۔ ہر وہ کاغذ/ تجویز (Puc) جو کلرک یا جونیئر افسر کی جانب سے ان کی خدمت میں پیش کیا جائے اس پر آنکھیں بند کر کے دستخط نہ کردیں—— ایسا نہ ہو کہ ''صاحب بہادر'' کبھی اپنے استعفیٰ پر ہی انگوٹھا لگا بیٹھیں!

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ نہفتہ باشد!

''جنگل میں کسی جگہ کو بھی خطرے سے خالی نہ سمجھ شاید کسی جھاڑی/ کونے میں کوئی چیتا چھپا بیٹھا ہو۔''

ہائر ایجوکیشن کمشن کی خدمات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے اور راہ نمائی حاصل کرنے کے طریق کار کو بھی آسان تر بنانا از حد ضروری ہے—— اخلاقیات کا سبق ایک چوکیدار سے لے کر اعلیٰ ترین افسر کو حرز جاں بنانے کی ضرورت ہے۔ خوئے دلنوازی کے لیے کوئی پروگرام امریکہ کے کسی ماہر اخلاقیات (از قسم ڈیل کارنیگی) کی خدمات حاصل کر کے کمیشن کے ارکان اور ملازمین کو آگاہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ ہمارا ماضی تو شاید اس قسم کی اخلاقی ہدایات مہیا نہیں کر سکا!

سائنسی مضامین اور دیگر علوم کے لیے وظائف کی غیر مساویانہ تقسیم

ہائر ایجوکیشن کمشن کی سالانہ رپورٹس کی کارکردگی کے بارے میں ہم نے آغاز میں ذکر کیا تھا کہ انٹرنیٹ پر رپورٹ ۲۰۱۵ء تک کے عرصے کی موجود ہے۔ وہاں اس امر پر حیرت کے ساتھ یہ سوال بھی کیا گیا تھا کہ گزشتہ پانچ سالوں کی رپورٹ کیوں نہ منظر عام پر آسکی؟ تاہم اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس سال کے دوران متعدد سکالرز نے غیر ملکی یونیورسٹیوں سے Ph.D کی ڈگری حاصل کی اور وہ اب ملکی یونیورسٹیوں اور دیگر تحقیقی/ تعلیمی اداروں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس رپورٹ میں من جملہ مختلف اعداد وشمار گرافس اور اشکال خاکوں کے ذریعے واضح کیے گئے ہیں۔ منسلکہ ڈایا گرام کے مطالعے

Discipline-wise Scholarships Completed in FY 2015-16

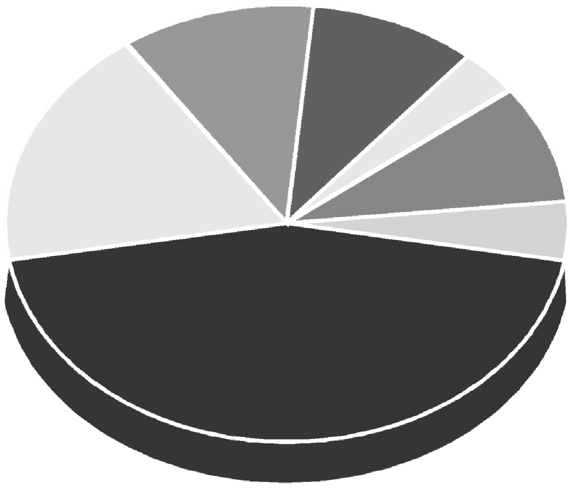

Agriculture & Verternary Sciences (12%)
Arts & Humanities (7%)
Biological & Medical Sciences (18 %)
Business Education (8%)
Engineering & Technology (66%)
Physical Sciences (36 %)
Social Sciences (13 %)

سے پتا چلتا ہے کہ:

☆......سب سے زیادہ Ph.D انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی 66 فی صد تھے۔

☆......فزیکل سائنسز کے .36 فی صد

☆......بائیولوجیکل اور میڈیکل سائنسز کے 18 فی صد۔

☆......ایگریکلچر اور وٹرنری سائنسز کے 12 فی صد۔

☆......بزنس ایجوکیشن کے 8 فی صد۔

یہ کل 140 بنتے ہیں جو کل Ph.D کی تعداد کا 87 فی صد ہے۔

☆......جبکہ سوشل سائنسز (13)، آرٹس اینڈ ہومینیٹز کے صرف 7 پی ایچ ڈی تھے۔

اس صورتحال سے پتہ چلتا ہے کہ گزشتہ چند عشروں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم پر بہت زور دیا گیا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر یہ تمام کام بغیر مناسب منصوبہ بندی کیا گیا ہے۔ سائنسی

مضامین میں تو جس قدر ترقی ہوئی ہے اور ملک وملت کو جس قدر **"عظیم فوائد"** اس سے حاصل ہوئے ہیں۔ اس کا تو حال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں آج بھی تجربات کے لیے طلبہ کو (Distilled water) خرید کر استعمال کرنا پڑتا ہے۔ نیز سکول/ کالجوں میں جو صورت حال ہے، وہ کسی دوسری جگہ زیرِ بحث آئے ہیں۔ فی الوقت انہیں نظر انداز کرتے ہوئے، **اس غیر مساویانہ بجٹ کی تقسیم کا ایک نہایت مضر اور خطرناک پہلو اس شکل میں ظاہر ہوا ہے کہ کالجوں/ یونیورسٹیوں میں علوم انسانی واجتماعی Social and Humanities کی تعلیم ختم ہوتی جا رہی ہے۔** اسی طرح دیگر سوشل مضامین اور لسانیات (بالخصوص عربی/ فارسی/ اردو/ سندھی اور پشتو) کی تعلیم کے شعبے بند ہو رہے ہیں کیونکہ ان مضامین کے پڑھنے کے لیے طلبہ کی اتنی تعداد نہیں ہوتی کہ ان شعبہ جات کو جاری رکھا جا سکے۔

سماجی اور انسانی علوم کی اہمیت وفوائد

قوموں کی ترقی اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں جو اہمیت ان سماجی اور انسانی اجتماعی علوم کو حاصل ہے، اسے کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جن ترقی یافتہ ممالک (امریکہ/ یورپ) کے ماہرین کے ایما پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے، وہاں لاکھوں طلبہ ہر سال، ان علوم کی تعلیم و تحقیق میں مصروف ہیں اور اعلیٰ ترین ڈگریاں لیکر پسماندہ ممالک/ اقوام پر حکومت کرنے کے نت نئے ڈھنگ سیکھ رہے ہیں اور ان ممالک کے تعلیمی نظاموں میں اس قدر انقلابی تبدیلیاں لا رہے ہیں جس کی واضح ترین مثال مملکت خداداد پاکستان کا تعلیمی نظام ہے جس میں گزشتہ پچاس سالوں میں اِس قدر تبدیلیاں لائی گئی ہیں کہ قوم کو مختلف فرقوں/ گروہوں/ طبقات میں تقسیم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ وطن عزیز میں نژادِ نو کا رشتہ ماضی سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا:

سر زند از ماضئ تو حال تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو
مشکن از خواہی ، حیاتِ لازوال
رشتہ ماضی و استقبال و حال!

بظاہر ہماری اس تحریر کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس تمام کا ہائر ایجوکیشن سے کیا تعلق اور واسطہ ہے؟ تاہم بنظر غائر دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہائر ایجوکیشن کے اس باغ کے لیے جو کمزور پود (Nursery) سکولوں/کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لگائی جا رہی ہے، اس سے تناور اور پھل دار درختوں کا باغ کیوں کر وجود میں آ سکتا ہے؟ــــــ ہمارے اس دعویٰ کی دلیل خود وہ نسل ہے جو اس وقت ''نام نہاد ہائر ایجوکیشن'' حاصل کر رہی ہے یا کر چکی ہے اور گزشتہ پچاس سالوں سے مختلف ''خدمات'' سرانجام دے رہی ہے!۔ اس نظامِ تعلیم کے ''فیض یافتہ'' اعلیٰ ترین بیوروکریٹ (چیف سیکرٹری، پرنسپل سیکرٹری، سیکرٹری، کمشنر اور دیگر افسران) نے کرپشن کے جس سونامی کو جنم دینے میں اپنا کردار ادا کیا ہے کیا وہ ہمارے اس دعویٰ کا منہ بولتا ثبوت نہیں؟

☆ ......کیا اس نسل نے ملک کو دولخت نہیں کیا؟

☆ ......کیا موجودہ نسل کے لوگوں (بیوروکریسی، براکریسی، سیاست دان اور مذہبی طالع آزماؤں) کی وہ غلیظ اور گلی سڑی، اخلاق باختہ فصل نہیں جس نے وطن عزیز میں عرصہ دراز سے ابتری کی حالت برپا کی ہوئی ہے؟

☆ ......کیا ان ''اعلیٰ تعلیم یافتہ'' افراد کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی نہیں جنہیں وطن عزیز کے بنیادی مقصد تخلیق اور اس کے پس منظر کا واضح شعور ہو؟ کیا انہیں یاد نہیں رہا کہ عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جان کن کن وادیوں سے گزرا تھا؟

☆ ......کیا یہ تمام تر صورت حال ایک نظریاتی، فلاحی اور اسلامی ریاست کے قیام و بقا کے لیے نہایت خطرناک مستقبل کی نشان دہی نہیں کرتی۔ اور کیا وطن عزیز کے ہائر ایجوکیشن کمیشن کے قیام کی واحد غرض و غایت اور مقصد وحید یہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس ضمن میں تعلیم و تحقیق اور تربیتی نظام کے ذریعے یہ خدمت سرانجام دے کہ وطن عزیز کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدیں مضبوط ہوں؟ــــــ کسی ملک و قوم کے لیے نظامِ تعلیم کا مسئلہ کس قدر اہمیت کا حامل ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قیام پاکستان کے فوراً بعد (صرف تین ماہ بعد) اکتوبر ۱۹۴۷ء میں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ملک میں

پہلی تعلیمی کانفرنس بلائی جس میں وطن کے دونوں بازوؤں کے اہل علم کو یہ کہا گیا کہ ''موجودہ نظام تعلیم ہماری ملکی وقومی ضروریات کی تکمیل نہیں کرسکتا اور ہمیں ''رائیٹ ٹائپ'' ایجوکیشن (مثبت تعلیمی نظام) کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔'' اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بانئ پاکستان کے دل میں نظام تعلیم کی کس قدر اہمیت تھی؟ یادرہے کہ قائداعظم، اپنی زندگی کے ان ایام میں تپ دق کی آخری حالت میں نہایت تکلیف کے دور سے گزر رہے تھے جبکہ لاکھوں مہاجرین کی بحالی اور نئی مملکت کے قیام و بقا کا گھمبیر مسئلہ بھی ان کے سامنے تھا۔ اہل علم سے یہ امر بھی پوشیدہ نہیں کہ اپنی وفات پر انہوں نے کروڑوں روپے کی اپنی جائیداد بھی مختلف تعلیمی اداروں کو دیدی تھی! ◆

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم پاکستان میں نظام تعلیم اور ہائر ایجوکیشن کمیشن کا جائزہ لیتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ:

☆ ......آج وطن عزیز میں کروڑوں بچے تعلیمی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے آوارہ پھرنے/ بھیک مانگنے اور بچپن میں محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔

☆ ......لاکھوں بچے، ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے دینی مدارس/ مساجد میں زیر تعلیم ہیں جہاں انہیں دینی تعلیم کے نام پر فرقہ وارانہ عصبیت کا زہر پلایا جارہا ہے۔

☆ ......گورنمنٹ سکولوں/ کالجوں میں داخلہ نہ ملنے کی بناء پر لاکھوں والدین اپنے بچوں کو ان پرائیویٹ سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخل کرانے پر مجبور ہیں جہاں ''دولت کے پجاری'' بچوں میں ڈگریاں تقسیم کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔

☆ ......ان پرائیویٹ کالجوں/ یونیورسٹیوں میں ایک قلیل تعداد دولت منداور متمول طبقے کے بچوں کی ہے جنہیں اولیول، اے لیول، کیمبرج، آکسفورڈ کے نام پر ''اینگلومحمڈن'' بنایا جارہا ہے۔

◆ ہے کوئی ایسا جی دار ''زرداری یا شریف انسان'' اس ملک میں جو ایسے اقدام کا کرنا تو کجا، اس کے متعلق سوچ بھی سکے!

انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

☆ ......ایک درجن سے زائد مختلف النوع تعلیمی نظاموں کے ذریعے مستقبل کی نسل کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا گیا ہے جن کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہوگئی ہے اپنے رہن سہن، مقصد زندگی کے لحاظ سے!

☆ ......لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم کے تحت ایک سازش کے نتیجے میں وہ دین و مروت سے بے بہرہ کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں تشدد کا رجحان عام ہوگیا ہے اور جب وہ **اپنے مقصد زندگی (حصول زر اور مرتبہ) میں ناکام ہوتے ہیں** تو پھر نشہ کے ذریعے ''اک گونہ بےخودی'' کا شکار ہو کر معاشرے میں ڈاکہ زنی، قتل و غارت اور جنسی استحصال کو جنم دیتے ہیں۔ بقول ایک دانش ور **''سرکاری یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے طلبہ میں تشدد پسندی اور دہشت گردی کے ذمہ دار، دینی مدارس کے فارغ علماء کے فتاویٰ نہیں ہیں بلکہ یہ ہمارے درآمد کردہ تعلیمی نظام کی ناکامی کی علامتیں ہیں۔ حالیہ دور میں یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کرنے والے افراد کا دہشت گردی میں ملوث ہونا، اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ (انیس احمد، ۲۰۱۲ء)**

پرائیویٹ یونیورسٹیوں کی حالتِ زار

اس ضمن میں ہائر ایجوکیشن کی نام نہاد اصطلاح کے پردے میں ان پرائیویٹ کالجوں/ یونیورسٹیوں کی حالت زار بھی دیدنی ہے۔ چند کمروں پر مشتمل کرائے کی عمارت میں بڑے بڑے شہروں میں یونیورسٹیوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے تاہم تعلیم اور تحقیق کے لیے اس قدر جگہ بھی دستیاب نہیں کہ ایک کمرے میں ۳/ ۴ پروفیسر بمعہ ڈین فیکلٹی ایک ایک میز اور صرف دو کرسیوں کے ساتھ تعلیم و تدریس کا ''فریضہ عظیم'' سرانجام دے کر ملت و ملت کو امام یوسفؒ اور امام محمدؒ جیسے نابغۂ روزگار پیدا کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔ اسلام آباد اور راولپنڈی میں اگر یہ حال ہے تو صوبوں میں کیا صورت حال ہوگی، اس کے لیے قیاس سے بہتر اور کوئی حل نہیں۔ دیکھئے ایسے عالم میں علامہ اقبال یاد آ گئے۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی!

اور

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی!

ان تمام یونیورسٹیوں میں لائبریری نام کی کوئی ''جگہ'' نہیں جہاں عالمی تحقیقی جرنل اور کتب وافر مقدار میں موجود ہوں۔ یہاں تو پاکستان کے اخبارات اور دیگر جرائد تک نہیں آتے کہ ان یونیورسٹیوں کے خازن صاحبان نے اس طریق پر بھی ''مالکان یونیورسٹی'' کے لیے ''لاکھوں روپے کی بچت'' کا سالانہ کا کارنامہ سرانجام دیا ہوتا ہے ـــــ شاید انٹرنیٹ نے یہ ضرورت بھی پوری کردی ہو لیکن اب تو یونیورسٹی میں انٹرنیٹ کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ ہر طالب علم کے پاس اب تو ''عطیہ شریفین'' کی شکل میں لیپ ٹاپ موجود ہے ـــــ رہ گئے کھیل کے میدان اور دیگر علمی/ ادبی/ اخلاقی سرگرمیاں (مباحثے/ مشاعرے) تو اب اس ''دورِ جدید'' میں یہ باتیں یادِ ماضی بن کر رہ گئی ہیں اور نوجوان نسل کو باور کرادیا گیا ہے کہ:

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا!

درج بالا صفحات میں ہم نے جو اعداد و شمار اعلیٰ ترین تعلیمی ڈگری کے حامل افراد کے بارے میں دیئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ۸۷ فی صد اصحاب کا تعلق سائنس کے مختلف مضامین سے تھا اور ان میں بھی بالترتیب انجینئرنگ (۴۱ فی صد) فزیکل سائنسز (22 فی صد) اور 11 فی صد بائیولائیوجیکل اور میڈیکل سائنسز کا تھا۔ تاہم جب ''سائنس دانوں کی اس عظیم الشان تعداد (74 فی صد)'' کو اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کرنے کے بعد ملک وملت کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک عام آدمی یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ صحت عامہ کی جو حالت ہے، وہ امراض کی بڑھتی ہوئی شرح سے عیاں ہے۔ انجینئرنگ اور فزیکل شعبے میں گیس، بجلی، پانی اور اس قسم کے دیگر شعبے ''ان صاحبان علم وفضل'' کا انتظار دیکھ رہے ہیں کہ کب ان کے ناخنِ تدبیر سے امت کو تھر اور چولستان تو کجا لاہور/ اسلام آباد/ راولپنڈی جیسے مقامات پر صاف اور صحت مند پانی پینے کو میسر آتا ہے؟

اگر چہ اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جاسکتا ہے تاہم صرف اس کے ایک مزید پہلو کی جانب توجہ دلانا چاہتے ہیں جو صرف اور صرف ہائر ایجوکیشن کمیشن کے بنیادی دائرہ کار میں آتا ہے ـــــ کیا وہ کسی ذریعے سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ جن شعبوں کے لیے انہوں نے غیر ملکی وظائف نیز اس تمام دوران تنخواہوں سمیت مراعات جن حضرات کو دی تھیں، انہوں نے کیا خدمات سرانجام دیں اپنے شعبہ تحقیق میں ملک وملت کے لیے؟ کیا **ان کی اعلیٰ کارکردگی کا ایک بیانیہ صرف دو صفحات پر مشتمل تحریر کی صورت میں** ان سے حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ان سے ملک و ملت کو کیا فوائد حاصل ہوئے ہیں؟ ہماری معلومات کی حد تک تو حقیقت یہ ہے کہ یونیورسٹیوں اور تحقیقی اداروں میں ''نام نہاد سائنس دانوں'' کے درمیان سیاست، اختلافات اور کھینچا تانی کا یہ شاخسانہ نکلا ہے کہ جو لوگ بیرون ملک سے مختلف شعبہ جات کی تربیت لے کر آتے ہیں، اگر وہ کرپشن اور کھینچا تانی کے ماحول سے سازگاری کر لیتے ہیں (جو اکثریت کر لیتی ہے) **تو وہ ''بغیر کام کیے تنخواہ'' لے کر روزمرہ کے امور سرانجام دیتے رہتے ہیں۔** تاہم جو قلیل تعداد ایسا نہیں کر سکتی اور اپنی طبیعت، ایمان (جو بھی سمجھ لیا جائے) کے تقاضے سے مجبور ہو کر ایسا نہیں کر سکتے، وہ کسی نہ کسی طرح ملک سے باہر چلے جاتے ہیں۔ ہمیں ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ایک صاحب جنہوں نے Dolly (بھیڑ کے بچے کی لیبارٹری میں پیدائش کے تمام مراحل کی تربیت اس نامی گرامی سائنس دان کی لیبارٹری میں خود سرانجام دیئے تھے جس نے نر و مادہ کے ملاپ کے بغیر یہ کام سرانجام دیا تھا، وہ اسی قسم کے خود پرست اور من مانی ذہن رکھنے والوں کے ہاتھوں وطن عزیز سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے اور دیارِ غیر میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں!۔

اس ضمن میں ایک آخری بات کہہ کر اس سمع خراشی کو ختم کرنا چاہتے ہیں بشرطیکہ اس سے بھی کسی کی جبین پر کوئی شکن نہ آئے اور کمیشن کے فاضل چیئرمین یا متعلقہ افسر اس کا خیال کریں۔

ہم نے جو رنگین ڈایا گرام/ خاکہ انٹرنیٹ میں دیکھا ہے، اور اس میں جس قسم کے

ملتے جلتے رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے، وہ اس قدر یکسانیت کے حامل ہیں کہ ہم نے ایک خصوصی ترکیب کے ذریعے (انٹرنیٹ کی مدد سے) ان رنگوں کے درمیان فرق کومحسوس کرتے ہوئے مختلف شعبہ جات کے سکالرز کی تخصیص کی ہے۔(جس میں کسی حد تک غلطی کا امکان بھی ہوسکتا ہے)۔توجہ طلب امر یہ ہے کہ کیا پرنٹنگ کے اس جدید ترین دور میں اور اس قسم کے اعداد وشمار کے درمیان تمیز کرنے کا کوئی بہتر طریقہ موجود نہیں ہے؟ اور کیا کمیشن کے فاضل ارکان یا عملے میں کوئی ایسے صاحبِ علم وفن موجود نہیں جو اس کام کو ماہرانہ انداز سے سرانجام دے سکیں؟ تفصیلاً اگر تمام ڈایاگرامز کا جائزہ لیا جائے تو پڑھنے والے کے لیے ان تمام سے کچھ اخذ کرنا بہت مشکل ہی نہیں بسا اوقات ناممکن بھی ہو جاتا ہے اور ایسے اوقات میں ایک ''ہم جیسا عامی'' انسان کمیشن کے لیے دعائے خیر کے سوا کچھ نہیں کر سکتا!___ **یہ امر بھی ہمارے اس دعویٰ کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ اس ادارے نے وہ توقعات پوری نہیں کیں اور بہتری کا ایک بہت بڑا میدان ایسا ہے جسے اصلاح کے ذریعے ٹھیک کیا جا سکتا ہے!**

درج بالا چند بنیادی امور کے بارے میں گفتگو کے بعد، اب ہم ان چند انتظامی مسائل کا ذکر کریں گے جس کی وجہ سے طلبہ اور والدین مختلف پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔اور جنہیں حل کرنا چنداں مشکل نہیں بشرطیکہ کسی کو اپنے فرائض منصبی کا خیال ہو کہ انہیں کسی وقت اس کا حساب بھی دینا ہے!

(i) ایم فل/پی ایچ ڈی ڈگری کی مدت:

وطنِ عزیز میں ہائر ایجوکیشن کا ایک مزید پہلو جسے ''انتہائی ظلم'' سے کم الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا، یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں ایم فل/پی ایچ ڈی میں داخلہ لینے کے بعد طلبہ (بالخصوص طالبات) کو یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔اور جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا کہ سینئر اساتذہ، تحقیق اور مقالہ جات نیز تھیسیس لکھنے (Thesis Writing) میں طلبہ کی راہنمائی اور مدد نہیں کرتے یا اکثر اس قابل نہیں ہوتے اور بالعموم طلبہ کو جونیئر اساتذہ کے سپرد کر دیتے ہیں جو خود بھی اس کام کی مہارت

نہیں رکھتے۔ یوں طلبہ کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ سینئر اساتذہ/ سپر وائزر، طلبہ کے کام (پراگرسس رپورٹ) پر اس وقت تک دستخط نہیں کرتے جب تک جونیئر اساتذہ اس کام کے بارے میں تسلی بخش رپورٹ نہیں دیتے۔ رہے ڈین صاحبان تو وہ تو چونکہ پروفیسروں میں سینئر ترین ہوتے ہیں، انہیں دفتری ملاقاتوں/میٹنگز سے ہی فرصت نہیں ملتی کہ اس قسم کے کاموں پر توجہ دے سکیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ایم فل/ پی ایچ ڈی کے آخری مراحل (بلکہ بیرونی ممتحن کی مثبت رپورٹ آنے تک) پانچ تا سات سال لگ جاتے ہیں۔ اس طرح طلبہ کو نہ صرف مالی طور پر زیر بار ہونا پڑتا ہے کہ ہر سمسٹر میں انہیں فیس کی ایک خطیر رقم جمع کرانی پڑتی ہے اور اکثر انہیں سکالرشپ/ انٹرن شپ کی رقم بھی نہیں ملتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس ''ظلم عظیم'' کو برداشت نہ کرنے کی بناء پر بد دل ہو کر تعلیم کو ہی خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ ایسے اساتذہ کی خدمت میں ''خراج تحسین'' پیش کرنے کے لیے علامہ اقبال کے کلام سے اس سے بہتر کوئی دوسرا شعر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

میراث میں آئی ہے ، انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

راقم الحروف کو اپنی طالب علمانہ زندگی کا ایک واقعہ (بطور نمونہ ۱۹۷۱ء سے قبل کا زمانہ) بہت اچھی طرح نہ صرف یاد ہے بلکہ اب بھی جسم و جان میں اس کی یاد سے ایک جھرجھری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک بنگالی طالب علم جو پی ایچ ڈی کرنے کے لیے وظیفے پر مشرقی پاکستان سے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد آیا ہوا تھا اور شادی شدہ نیز بچوں کا والد بھی تھا۔ اس کے کمرے سے اکثر دوپہر کے وقت رونے کی آواز آتی تھی۔ معلوم ہوا کہ اس کے پروفیسر صاحب اس کے تھیسیس کو حتمی شکل دینے میں حارج ہیں۔ ایک عرصہ تک وہ صاحب اس ظلم کا شکار رہے!

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ بھی اسی یونیورسٹی کا ہی ہے جبکہ ایک طالبعلم نے تنگ آ کر پروفیسر صاحب کے گھر رات کے وقت جا کر ''دھمکی'' دی اور یوں اسی وقت اپنے کاغذات

پر دستخط کرائے۔◆

طے شود جادۂ منزل بہ یک آہے گاہے!

اگر چہ یہ صورت حال آج سے ۲۵ / ۳۰ سال قبل کی ہے تاہم اسلام آباد کی ایک وفاقی یونیورسٹی میں آج بھی صورت حال بہت زیادہ مختلف نہیں۔ وہاں بھی ایک شعبہ کی پروفیسر صاحبہ اپنے طلبہ کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کر رہی ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے جونیئر اساتذہ کو تمام اختیارات سونپ کر گویا ابھی سے اپنی ریٹائرمنٹ کی زندگی کا آغاز کر دیا ہے جبکہ طلبا/ طالبات ان کی اس ''ادائے خسروانہ'' کا شکار ہو رہی ہیں۔ لیکن کوئی یونیورسٹی سے پوچھنے والا نہیں کہ ہر سمسٹر میں وہ طلبہ سے کس کھاتے میں ہزاروں روپے وصول کرتے ہیں۔ **کیا ہائر ایجوکیشن کمیشن کے فاضل چیئرمین اس جانب توجہ فرمائیں گے کہ یہ یونیورسٹی توان کی ناک کے عین نیچے اس قسم کے ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہے**___ ہمیں یقین ہے کہ **اگر چیئرمین کمیشن، اس ضمن میں تمام یونیورسٹیوں (پبلک/ پرائیویٹ دونوں) سے اعداد وشمار جمع کرائیں کہ ایم فل/ پی ایچ ڈی میں طلبہ نے کب داخلہ لیا اور کب ڈگری مکمل کی، تو انہیں اس ضمن میں محیر العقول تاہم بہت ہی ننگ انسانی حقائق کا علم ہو جائے گا۔ مزید یہ گزارش بھی کہ پہلے وہ اس امر کا قانونی استحقاق بھی حاصل کر لیں کہ ایسے اساتذہ سے فالتو مدت کی تنخواہ و دیگر فوائد واپس وصول کیے جائیں گے!___ یہ تو ایک مثال ہے تاہم اس ''باغ'' میں ایسے حالات اکثر یونیورسٹیوں میں پائے جاتے ہیں!**

اس ضمن میں ایک اور بہت بڑی انتظامی خرابی اس شکل میں کی جاتی ہے کہ پی ایچ ڈی طلبہ کی غیر مساویانہ تقسیم، محکمہ میں موجود اساتذہ کے درمیان کی جاتی ہے۔ اعلیٰ نمبر/ ڈویژن والے طلبہ چیئرمین اپنے اور اپنے منظورِ نظر افراد کو دے دیتے ہیں جب کہ درمیانہ درجے (تعلیمی استعداد اور دنیاوی طور طریق رکھنے والے) کے طلبا دوسرے ''ناپسندیدہ

◆ بالعموم اس قماش کے لوگ اپنے مذہبی اعتقادات اور اعمال کی بناء پر شاید ایسی کاملیت (Perfection) کے قائل ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی تحریر پر اعتماد نہیں ہوتا___ نزلہ بے چارے طلبا پر گرتا ہے!

اساتذہ'' کو دے دیتے ہیں ـــــ چلئے یہ تو معاملہ شاید ایسا ہے کہ اس ''پسند و ناپسند'' کا فیصلہ تو رب کریم کی ذات قیامت کے روز ہی کرے گی ان کی نیت کے حساب سے ـــــ لیکن ایک معاملہ جو از روئے قانون اور انصاف نیز تعلیمی روایات کے برعکس ہے وہ یہ کہ جب اساتذہ اپنے کسی طالب علم کو موضوع کے انتخاب کے بعد تمام تر ضروری ہدایات دے کر Synopsis بنوا دیتے ہیں تو پھر پروفیسر وہ تمام کام کسی ''اپنے منظور نظر استاذ'' کو کسی بہانے دے دیتے ہیں۔ اور یوں اساتذہ کے درمیان کھینچا تانی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تاہم سب سے زیادہ نقصان تو متاثر طلبہ کا ہوتا ہے کہ دوسرے صاحب اس تمام تر تفصیلات سے آگاہ نہیں ہوتے جس ''خونِ جگر'' کے ساتھ اس طالب علم اور اس کے پہلے سپروائزر نے کیا تھا ـــــ ایسے بچے جب کام کرتے ہیں تو نہایت بے دلی سے ـــــ نتیجہ ایک ایسے Thesis کی شکل میں نکلتا ہے جس میں کاغذی کاروائی تو ہوتی ہے لیکن وہ روح اور مقصدیت سے خالی ہوتا ہے!

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

انتظامی امور میں بدانتظامی کا مظاہرہ:

یونیورسٹیوں میں ایک عام طریقہ ہے کہ ایم ایس سی/ ایم فل/ پی ایچ ڈی کی تمام تر تعلیمی/تحقیقی امور کی تکمیل کے بعد جب ڈگری کے حصول کا وقت آتا ہے تو ایسے وقت میں (جبکہ دورانیہ ۷ سال تک کا طویل ہو جاتا ہے) طلبہ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ درخواست فارم کے ساتھ گزشتہ سالوں کی تمام بنک رسیدات و کوائف وغیرہ جمع کرائیں۔ یونیورسٹیوں میں سینکڑوں کلرک اور ان پر ۱۷ تا ۱۹ گریڈ کے درجنوں افسران کی فوج ظفر موج اور کمپیوٹر میں موجود ریکارڈ دیکھنے کی کوئی ایک شخص بھی تکلیف گوارا نہیں کرتا اور اگر کوئی طالب علم اس پر حرف شکایت زبان پر لائے تو کلرک سے لیکر ڈائریکٹر تک اسے مختلف انداز میں زجر و توبیخ کرنے میں اپنا تمام تر زور لگا دیتے ہیں۔ ایسے عالم میں کہ نوجوان طلبہ کی اکثریت ایسے کاغذات سنبھال کر رکھنے کے عادی نہیں ہوتے کہ انہیں اس کی تربیت نہیں

دی جاتی اور ویسے بھی اس زمانے کی فضا ہر چیز کو خام رکھتی ہے۔ اور اگر انہیں کسی دور دراز علاقے سے سفر کر کے بڑے شہر میں آنا پڑے تو شہروں میں رہائش/ قیام وغیرہ کے متعدد مسائل کے علاوہ خواتین طالبات کی عزت آبرو کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ راقم الحروف کو ایک بڑی نامی گرامی یونیورسٹی میں اسلام آباد جا کر اپنے بچوں کے سلسلے میں اس قسم کی تمام کارروائی سے ''نبرد آزما'' ہونے کا ذاتی تجربہ ہے!

بظاہر ان تمام مسائل کا ہائر ایجوکیشن کمیشن سے براہِ راست کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ تاہم اس قسم کی دفتریت (Redtapism) کا مظاہرہ وہاں بھی کیا جاتا ہے جس کی جانب گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ تاہم کیا یہ ضروری ہے کہ کمیشن نے اپنے کام اور مقاصد کے لیے جو بھاری بھرکم الفاظ پر مبنی (Aims and Vision) کی اصطلاحات وضع کی ہوئی ہیں ان پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو پیش آنے والے **''جان لیوا روز مرہ مسائل''** کا حل بھی تلاش کیا جائے اور کمیشن کی سطح پر اس قسم کے مسائل کا حل بھی تجویز کیا جائے۔ ہے کوئی ''بندہ خدا'' جو طلبا/ طالبات کے اس قسم کے مسائل کا مداوا کر سکے!۔

دنیا ہے تری منتظر اے روزِ مکافات!

گزشتہ صفحات میں ہم نے مقالہ جات کی اشاعت کے بارے میں اشارہ کیا تھا۔ خیر سے اب تو ہائیر ایجوکیشن کمیشن کے صاحبان علم و ہنر کے تحت ایسے رسائل و جرائد کا آغاز ہو چکا ہے جو لاکھوں روپے کی خطیر رقم لے کر جلد از جلد مقالہ جات کی اشاعت کر دیتے ہیں اور چونکہ ان رسائل کا تعلق بھی کمیشن کے لوگوں کی سرپرستی ہی میں ہوتا ہے اس لئے ان مقالہ جات کو سلیکشن بورڈز میں شرفِ قبولیت بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر ملک وملت کا درد رکھنے والے کوئی صاحب اس بارے میں تحقیق کریں تو جس طرح خیبر پختونخواہ کی ایک یونیورسٹی میں ایک سینئر اور دین دار پروفیسر کے جنسی سکینڈل کا انکشاف ہوا ہے اور لاہور میں ایک پرائیویٹ ادارے سے جس طرح دنیا کی نامی گرامی یونیورسٹیوں کی ڈگری کے اجراء کا انکشاف ٹیلی ویژن چینل کے ذریعے ہوا ہے، اس سے زیادہ ہوشربا حالات منظر عام پر آ سکتے ہیں!____ ہے کوئی ایسا مردِ مجاہد جو ظالم سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی ہمت رکھتا ہو؟

حصہ دوئم

پاکستان میں تعلیمی نظام
کی تشکیلِ نو

باب ششم

پاکستان میں نظامِ تعلیم: تاریخی پس منظر

کسی بھی مملکت کے نظام کو چلانے کے لیے تعلیمی نظام کی جو اہمیت ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔قوموں کی زندگی میں تعلیم کی حیثیت اس روح کی مانند ہے جس کے نکل جانے سے ایک انسان، جسد خاکی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ان ملکوں اورقوموں نے ہمیشہ ترقی کی منازل طے کیں جنہوں نے اپنی نوجوان نسل کے لیے مناسب نظامِ تعلیم کا بندوبست کیا تاہم جن قوموں نے اس عظیم فریضے سے غفلت برتی، وہ جلد یا بدیر اپنے وجود کو ہی برقرار نہ رکھ سکیں بلکہ پستی اور ذلت کے ان گڑھوں میں جا گریں جہاں سے انہیں دوبارہ اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔۔۔۔ اس جگہ کسی دوسری مملکت یا قوم کی مثال دینے سے زیادہ امت مسلمہ کے ماضی کی جانب اشارہ کر دینا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی تعلیمات کے نتیجے میں تیئیس سال کی قلیل ترین مدت میں مسلمانوں نے جزیرہ نما عرب سے نکل کر کس طرح دنیا کی دو متمدن اور طاقتور ترین حکومتوں کو شکست دے کر ایک ایسے نظامِ حکومت کی داغ بیل ڈالی جس نے صدیوں انسانیت کو امن وآشتی کی نعمت سے بہرہ مند کیا اور جس کی ضوفشانیوں سے آج تک ایک دنیا مستفیض ہو رہی ہے۔ تاہم بعد ازاں، امت نے جب اسلام کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑا تو مغربی اقوام نے غلبہ کرلیا اور گزشتہ تین صدیوں میں، مسلم ممالک کو اس قدر کمزور کر دیا کہ اگرچہ گزشتہ صدی میں بیشتر ممالک آزادی کی دولت سے ہمکنار ضرور ہو گئے لیکن ذہنی اور تہذیبی آزادی کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک حکومت کی۔ تاہم اس تمام دور میں ٹھیٹ اسلامی حکومت قائم نہ ہو سکی کیونکہ حکومتی وسائل، اسلامی تعلیمات کی

ترویج واشاعت کے لیے اس طریق پر استعمال نہ ہوئے جس طرح دورِاول اور بعد ازاں خلفائے راشدین کے عہد میں ہوئے تھے۔ اس تمام علاقے میں اسلامی تعلیمات کے فروغ میں ان اہل علم وتقویٰ کی مساعی کو زیادہ دخل حاصل ہے جن کا سلسلہ محمد بن قاسم اور ان سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں ان تجار سے ہے جو اس علاقے میں آتے رہتے تھے۔ ایک طویل عرصہ تک اس علاقے پر مختلف مسلمان حکمران قابض رہے۔ مغل حکمرانوں بالخصوص اکبر کے زمانے میں ہندو اور دیگر اقوام کی عورتوں کے ساتھ شادی/بیاہ کے نتیجے میں ایک ایسے مذہب کو فروغ دینے کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے اثرات سے آج تک امت نجات حاصل نہ کر پائی اور دن بدن مختلف اقسام کی گمراہیوں اور بدعات کا شکار ہوتی چلی گئی۔ تاہم ان تمام تر کمزوریوں اور خامیوں کے علی الرغم، اس وسیع وعریض خطہ زمین میں تعلیمی نظام ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم رہا کہ انسانی زندگی کے جملہ امورِ سیاست، معیشت، معاشرت، عدل وانصاف اور جان ومال کی عزت وحرمت کی حفاظت کا سامان احسن انداز میں ہوتا رہا۔

جہانگیر نے انگریزوں کو بمبئی اور کلکتہ میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت دی۔ بعد ازاں جب عالمگیر اورنگزیبؒ نے دیکھا کہ انگریز اس سہولت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں تو انہوں نے بظاہر تجارتی لیکن اندرونِ خانہ سیاسی اختیار حاصل کرنے والی کوششوں کا قلع قمع کرنے کے لیے وہ کوٹھی ان سے چھین لی اور اسے نظام الدین سیالوی نامی ایک صاحب علم کو دیدی جنہوں نے وہاں ایک دینی درس گاہ قائم کی جو فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئی اور وہاں ایک ایسی دینی تعلیم کا آغاز ہوا جو دراصل امت مسلمہ کی ہزار سالہ علمی وتحقیقی تجربات کا نچوڑ تھا۔'' ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اس نصابِ تعلیم کا فارغ التحصیل کسی بھی رائج الوقت علم سے بالکل ناواقف نہ ہو۔ چاہے وہ سائنس ہو، طب ہو یا انجینئرنگ ہو۔ اس نصابِ تعلیم میں عرب سے آنے والا ورثۂ قرآن وحدیث، ایران سے آنے والا عقلیات کا استدلال اور افغانستان اور سنٹرل ایشیا سے آنے والا تصوف بھی شامل تھا۔ یہ نظامِ تعلیم اس زمانے میں مروجہ ۵۶ علوم کی تعلیم پر مبنی تھا جنہیں نہایت خوبصورتی کے ساتھ ایک آٹھ

سالہ تعلیمی نظام میں سمو دیا گیا تھا جس میں قریباً ۲۰۰ بنیادی کتب ◆ شامل تھیں۔ ان کی کوشش تھی کہ اس نظام سے فارغ ہونے کے بعد اگر کوئی شخص کسی خاص میدان مضمون میں ترقی (Specialize) کرنا چاہے تو اسے ایسا کرنے میں کوئی دقت نہ ہو اور وہ ہر علم کی مشکل ترین کتب کا از خود مطالعہ کر سکے''___ یہی وجہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم سے فارغ ہونے والوں میں جہاں ہمیں دینی علوم کے ایسے جید ماہرین ملتے ہیں جن میں بقول ڈاکٹر محمود غازی (۲۰۰۵) ''برصغیر کے جتنے دینی قائدین اور اہل علم پیدا ہوئے، ان میں سے ۹۵ فیصد کا تعلق اسی نظامِ تعلیم سے رہا۔ ان جید اہل علم وتقویٰ میں مولانا قاسم ناتوتویؒ اور ان کے استاد مولانا مملوکؒ بھی اس درسِ نظامی سے فارغ یافتہ تھے''___ محمود غازی نے مزید واضح کیا کہ ''جہاں اس زمانے کے نظامِ تعلیم سے مجدد الف ثانی (شیخ احمد سرہندیؒ) جیسے بزرگ پیدا ہوئے وہاں دنیوی امور کے چلانے والے نواب سعد اللہ خان بھی ایک ہی استاد کے فیض یافتہ تھے جو شاہ جہاں کے دور میں پورے برصغیر ہندوستان (موجودہ ہندوستان، پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال چھ ملکوں) کے ۴۸ سال تک وزیر اعظم رہے۔ ◆ وہ بھی اسی نظامِ تعلیم سے فارغ شدہ طلباء تھے جنہوں نے چٹائیوں پر بیٹھ کر عربی صرف ونحو (گرائمر) کی کتب پڑھی تھی اور یہی ریاضی (Mathematics) اور (Geometry) کی کتب پڑھی تھیں۔ مختلف تفاسیر وحدیث کی شرحیں (Commentaries) پڑھی تھیں۔ بلکہ ان طلبہ نے اس زمانے میں مروجہ سائنسی علوم از قسم انجینئرنگ کے لیے ضروری مضامین حساب، اقلیدس، الجبرا/ جیومیٹری جیسے مضامین بھی پڑھے تھے۔ آزاد معیشت اختیار کرنے کے لیے اس میں طب (Medical) کو بھی شامل کیا گیا تھا''___ ''موجودہ دور کے صاحبان علم اور عوام/ الناس کے لیے شاید یہ امر ایک بہت بڑے انکشاف

◆ ہمارے علم کی حد تک آج تک دنیا میں کسی بھی تعلیمی ادارے سے پی ایچ ڈی کرنے والا، اتنی زیادہ کتب کا مطالعہ نہیں کرتا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ ہزاروں کتب کو لائبریری میں صرف دیکھ ضرور پاتا ہے۔

◆ انگریز کے زمانے کی بیوروکریسی اور موجودہ دور کی سول ایڈمنسٹریشن کو اس عظیم الشان سلطنت کی ایڈمنسٹریشن سے کیا نسبت ہے؟ صاحبانِ علم وبصیرت کے لیے اس میں بہت سامانِ عبرت ہے!

کی حیثیت رکھتا ہو کہ دنیا کے سات عجائبات میں شامل تاج محل آگرہ کا بنانے والا انجینئر (مہندس) احمد معمار لاہوری (۱۶۴۹ء) بھی اسی درسگاہ سے فارغ التحصیل تھا'' ــــــ بقول محمود غازی مرحوم (۲۰۱۶ء) ''تاج محل جس انجینئر نے بنایا تھا وہ امریکہ/ برطانیہ کا تربیت یافتہ نہ تھا بلکہ وہ اسی نظامِ تعلیم میں پڑھا ہوا تھا۔''

ڈاکٹر محمود غازی (۲۰۰۶ء) نے مزید کہا کہ ''برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا بارہ سو سالہ دورِ حکومت علمی، تعلیمی اور فکری اعتبار سے ایک نمایاں اور قابل ذکر دور ہے۔ یہاں کے اہل علم نے جو علمی روایات اور معیار قائم کیا، ان سے کسب فیض کے لیے وسط ایشیاء اور موجودہ روسی فیڈریشن کے انتہائی آخری کناروں حتیٰ کہ مشرقی یورپ کے علاقے بوسنیا سے، مصر سے اور عرب دنیا کے مختلف گوشوں سے جویائے علم آیا کرتے تھے۔''

درج بالا حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں جو تعلیمی نصاب رائج تھا، وہ دین و دنیا کی جامعیت کا آئینہ دار تھا۔ تاہم یہاں ہم اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کچھ لوگ (دینی اور دنیوی تعلیم سے بہرہ مند بھی) یہ خیال کرتے ہیں کہ اس نظام تعلیم کا کوئی تعلق بغداد میں قائم مدرسہ نظامیہ میں رائج نظام تعلیم سے ہے۔ یہ ایک واضح غلطی اور بدیہی طور پر غلط خیال ہے۔ (محمود غازی ۲۰۰۶)''

ڈاکٹر محمود غازی مرحوم نے اپنے لیکچر (۲۰۰۶) میں یہ صراحت بھی کی کہ درس نظامیہ کوئی آسمانی چیز ہے، نہ اس کو اختیار کرنا شریعت کا کوئی حکم ہے، نہ خیر القرون میں اسلام کے سنہری دور میں اس نام کی کوئی چیز پائی جاتی تھی۔ اس کا تذکرہ نہ قرآن میں آیا ہے، نہ حدیث میں۔ نہ اس کا کوئی تعلق اسلام کے مستقبل یا ماضی سے ہے۔ یہ چند ماہرین تعلیم اور اہل علم کے اپنے تجربے پر مبنی ایک نصاب ہے جو اپنے زمانے میں ایک اچھی مفید چیز تھی۔ آج بھی اس میں ایک حد تک افادیت پائی جاتی ہے۔ اس کی افادیت سے انکار نہیں تاہم ان تمام تر تصریحات کے باوجود ڈاکٹر غازی نے یہ سوال کیا کہ کیا پاکستان بننے کے بعد بھی دینی مدارس کے یہی تقاضے ہونے چاہئیں تھے جو برطانوی حکومت میں غلامی کے دور میں دینی روایات اور ورثے کو محفوظ کرنے کے لیے حفظ ما تقدم کے طور پر کئے گئے تھے؟ اس

ضمن میں انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ ان تین ضرورتوں کا ذکر کیا ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد نہ صرف نوجوان نسل کی ذہنی، علمی اور عملی تربیت کے لیے ضروری ہیں بلکہ ایک اسلامی مملکت کے تمام امور چلانے اور دورِ جدید کے تقاضوں اور حالات کے تحت سول، ملٹری سروس اور معیشت و معاشرت کو چلانے کے لیے مردانِ کار کی تیاری کے لیے ضروری ہیں۔اس ضمن میں میں انہوں نے جن تین تقاضوں یا مقاصد کی نشاندہی کی ہم ان کے اس لیکچر سے بہت اختصار کے ساتھ چند نکات درج کر رہے ہیں۔

۱۔ اولین تقاضے کے طور پر دینی تعلیم کی ضرورت مساجد کے لیے تربیت یافتہ امام حضرات کی فراہمی ہے جس کے بارے میں درس نظامی کو جوں کا توں پڑھانے کی ضرورت سے انکار کرتے ہوئے انہوں نے بہت تفصیل کے ساتھ مختلف اصلاحات، تبدیلیوں اور اضافی امور کا ذکر کیا ہے۔

اس ضمن میں اہل علم وفکر کو اس زمینی حقیقت کی جانب یوں توجہ دلائی ہے کہ ”آج ہمارا امام جب معاشرے میں جا کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے تو اکثر صورتوں میں وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ سب اس معاشرے میں (Irrelevant) ہے اور یہاں جو لوگ سوال کر رہے ہیں، اس کا میرے پاس جواب نہیں۔ یوں وہ اس قسم کے سوالات کا جواب نہ دینے کی وجہ سے فرقہ واریت اور فروعی مباحث کو فروغ دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ اسے دوران تعلیم اسی قسم کے فروعی سوالات کے بارے میں پڑھایا جاتا رہا تھا۔ پاکستان کے موجودہ حالات اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہیں جن سے امت دو چار ہے!

۲۔ دینی تعلیم کا دوسرا درجہ وہ ہے جو دینی علوم کے مدرس یا معلم (سکولوں، کالجوں میں) بننا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ ایم اے اسلامیات کر کے مدرس تو بن جاتے ہیں لیکن بقول غازی مرحوم ”ان میں سے بہت سے قرآن پاک ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ جنہیں اگر نماز پڑھانے کا کیا جائے تو وہ نماز بھی نہیں پڑھا سکتے اور قرآن کی شاید چار سورتیں بھی ان کو حفظ نہ ہوں۔“ اس حالت زار کی اصلاح کی تدابیر بھی انہوں نے بیان کی ہیں۔

۳۔ دینی مدارس میں تیسری ضرورت ان اصحاب علم کی تیاری ہے جو خود دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم کے اعلیٰ درجے کے ماہرین (Specialists) ہوں۔ اونچے درجے کے مضامین اور اعلیٰ علم کی کتب پڑھا سکیں اور اعلیٰ درجے کے علوم وفنون کی تدریس کر سکیں۔ ہمیں فقہاء درکار ہیں، محدثین درکار ہیں، مفسرین درکار ہیں، مفتی درکار ہیں، جو اپنے اپنے علم میں Specialist ہوں۔

دینی تعلیم کے ان تین درجوں کے بعد، جن کی ملک وملت کو ہر وقت ضرورت ہے، ایک چوتھا درجہ اُن جید ماہرین ومفکرین کی تیاری اور تربیت کا ہے جو مغربی علوم وفنون کی تنقید وتنقیح کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ اس ضمن میں قانون، معاشیات اور دیگر معاشرتی اور سائنسی علوم کا ہے جن کی تیاری اگرچہ نہایت ہی ضروری اور اہم ہے، تاہم ایسے ایک نہیں بلکہ متعدد اداروں کی تشکیل کب اور کیسے ہوتی ہے؟ــــــ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہم اس پر از سرنو غور کرتے اور یہ طے کرتے کہ اس آزاد اسلامی ریاست میں تعلیمی ضروریات کیا ہوں گی لیکن غور وفکر کا یہ کام نہ حکومتوں نے کیا اور نہ ہی اہل علم نے اس پر توجہ دی۔

آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

اس مختصر تذکرے سے کسی کے ذہن میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ مختلف کتب اور اتنے زیادہ مضامین ایک بہت ہی مشکل (بلکہ ناممکن) عمل ہے، تاہم اس مشکل پسندی سے ملا نظام الدین کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو اتنی مشق کرائی جائے کہ جب وہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہوں تو مشکل ترین کتاب/مضمون سے استفادہ کرنا ان کے لیے مشکل نہ ہو۔ (غازی: ۲۰۱۶)۔ یاد رہے کہ وہی نصاب کسی حد تک اور بہت کچھ تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی ہمارے مدارس میں مروج ہے۔ یہ بات بھی بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ماضی قریب میں برصغیر کے جتنے دینی قائدین اور اہل علم پیدا ہوئے، ان میں سے ۹۵ فیصد کا تعلق اسی نظام تعلیم سے رہا۔ اگر دس بارہ سال کی عمر کا طالب علم اس میں داخل ہو تو وہ بیس سال (۸ / ۱۰ سال بعد) کی عمر میں فارغ التحصیل ہو سکتا ہے۔ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی چودہ سال

کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے اور صاحب تصنیف بھی! (مولانا قاسم نانوتوی اور ان کے استاد مولانا مملوک علی نے بھی اسی درسِ نظامی کے تحت تعلیم حاصل کی)۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب اس ملک کا اقتدار، انگریز کے قبضے میں آیا تو اس نظام تعلیم کا تیاپانچہ کر دیا گیا، (جس کی تفصیل ہم نے اس کتاب کے اولین ابواب میں بہت حد تک کر دی ہے)۔ بعد ازاں اس نصاب کو جاری رکھنے کی سعادت مولانا قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کے حصے میں آئی جنہوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی۔ تاہم حالاتِ زمانہ بدلنے سے مولانا نانوتویؒ نیز مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اس میں چند تبدیلیاں کیں اور یوں یہ تبدیل شدہ درس نظامی دارالعلوم دیوبند میں اختیار کیا گیا۔ دیوبند کے قیام ۲۵ / ۳۰ سال بعد اس میں مزید تبدیلیوں کا احساس ہوا تو اس میں ان مضامین کو بھی شامل کیا گیا جن کی بناء پر اسلام پر اعتراضات کیے جا رہے تھے۔ اس قسم کی متعدد وجوہات کی بناء پر مختلف ادارے وجود میں آئے جن میں ندوۃ العلماء (مولانا شبلی نعمانی / سید سلمان ندوی) جیسے اصحاب علم نے دیوبند کے نصاب میں تبدیلیاں کیں اور بعد میں دیوبند کے تعلیمی نصاب کی قدامت پسندی (شدت پسندی بقول غازی مرحوم) کے باعث علی گڑھ کا قیام وجود پذیر ہوا۔

درج بالا صفحات میں جو گفتگو اب تک کی گئی، اسے منطقی انداز میں جاری رکھنے سے قبل یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ نہایت ہی مختصر انداز میں ان حالات و واقعات کو ایک مرتبہ دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیا جائے جس کے نتیجے میں وطن عزیز میں تعلیمی نظام میں جو ترقیٔ معکوس ہوئی، اسے سمجھنا آسان ہو جائے (اگرچہ اس بارے میں گزشتہ ابواب میں بھی معروضات پیش کی جا چکی ہیں تاہم حکایت لذیذ کا دراز تر ہونا عیب شمار نہیں کیا جاتا بلکہ اسے ذوق و شوق سے کہا جانا اور سننا بھی ضروری ہوتا ہے!

گاہے گاہے بازخواں ایں قصہ پارینہ را

یہ بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح انگریز نے تجارت کے لیے مراعات حاصل کیں تاہم اپنی ریشہ دوانیوں اور سیاسی عزائم کی بناء پر اورنگزیب عالمگیرؒ نے وہ مراعات واپس لے

لیں لیکن انہوں نے منت سماجت کر کے وہ تمام سہولتیں دوبارہ حاصل کر لیں لیکن تاریخ کا المیہ ہے کہ ابھی اورنگزیبؒ کی وفات کو ڈیڑھ سو سال بھی نہ گزرے تھے کہ اسی اورنگزیبؒ کے جانشین پر اس الزام میں مقدمہ چل رہا تھا کہ اس نے بدیسی/غیر ملکی تاجروں کے تسلط سے آزاد ہونے کی کوشش کی تھی۔

ملت اسلامیہ کی بدقسمتی کہ ۱۷۴۰ء سے ۱۷۶۵ء تک بنگال پر انگریزوں کا قبضہ، احمد شاہ ابدالی کا پانچ مرتبہ مرہٹوں کو شکست دینا۔ ◆ ادھر مشرق میں بنگال کے حکمران سراج الدولہ کی شہادت اور جنوبی ہندوستان میں حیدر علی (م ۱۷۸۲) اور سلطان ٹیپو (والئ میسور) کی شہادت (۱۷۹۹ء) نیز روہیل کھنڈ کے بہادر حکمران حافظ رحمت خان کی ۱۷۷۴ء میں شہادت (یہ بھی شاہ ولی اللہ کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے) ۱۸۰۳ء میں شاہ عالم ثانی کے آخری دور میں انگریزوں نے سندھ اور پنجاب کے علاوہ سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ موجودہ پاکستان کے صوبہ سندھ کے تمام باسی امت مسلمہ کے شکریہ اور تعریف کے مستحق ہیں کہ سندھ کا تالپور خاندان انگریزوں سے لڑتا رہا تاہم ۱۸۴۳ء میں جنگ میں شکست کے بعد انگریز نے سندھ پر بھی قبضہ کر لیا اور ۱۸۴۹ء میں انگریز نے سکھوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ یوں انگریز کی عمل داری رنگون سے کراچی تک اور کشمیر سے جزائر لنکا تک وسیع ہوگئی۔ اس طریق پر ''وہ تاجر'' جنہوں نے ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی کمپنی قائم کی تھی وہ برصغیر کے حکمران بن گئے تاہم دو اہم ابواب کا ذکر کیے بغیر اس ''حکایت لذیذ'' کا ذکر تشنہ رہے گا۔ ان میں سے پہلا ذکر اس قافلہ سخت جاں کا ہے یعنی سرگذشت مجاہدین کے سرخیل سیّد احمد شہیدؒ اور حضرت اسمٰعیل شہیدؒ سے ہے جن کا تعلق بھی خانوادۂ ولی اللہ سے ہے کہ اسی ''سلسلۂ شوق جہاد'' کی ایک کڑی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء بھی ہے۔

◆ یاد رہے کہ مرہٹوں کے استحصال کے لیے ابدالی کو دعوت دینے والوں میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا نام سرفہرست ہے جن کی ساعی کے نتیجے میں آج ہندو پاک / بنگلہ دیش / میں رہنے والی امت مسلمہ، قرآن و حدیث سے بہرہ مند ہوئی۔

برصغیر کے یہ حالات تھے جب یہاں ایسی ہمہ گیر اثرات کی حامل دو شخصیات پیدا ہوئیں جن میں اولاً حضرت مجدد الف ثانیؒ (شیخ احمد سرہندی ۱۶۶۴ء۔ ۱۵۶۳) اور بعد ازاں حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۷۶۲ء۔ ۱۷۰۴) کی شخصیت ہے۔

یہاں قارئین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرانا باعث دلچسپی ہوگا کہ علامہ اقبال نے شیخ سرہندیؒ کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ''پنجاب کے پیرزادوں سے'' نامی نظم میں کیا ہے جب وہ ان کے مزار پر حاضر ہوئے۔ضروری ہے کہ قارئین کو بھی اس ذہنی اور روحانی لذت کی حالت میں شریک کیا جائے جو اس نظم کے پڑھنے سے ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا براہ راست تعلق ہمارے موضوع گفتگو سے نہیں تاہم اقبالؒ کے تعلیمی افکار (جن کا ذکر بار بار آئے گا) کو سمجھنے میں اس کا ذکر مفید اور ضروری ہے۔اور یہ وہ خیالات ہیں جو آج بھی اسی طرح تروتازہ اور صورت حال کے عکاس ہیں جتنے آج سے ۱۰۰ سال قبل تھے۔

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں میری بینا ہیں و لیکن نہیں بیدار
آئی یہ سدا سلسلہ فقر ہوا بند
ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانہ نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلہ فقر سے ہو طرہ دستار

باقی کلہ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا ''نشہ خدمت سرکار!''

یاد رہے کہ موجودہ پاکستان میں پیر صاحبان کے تمام خانوادوں کی اولاد ''خدمت سرکار کے نشہ'' میں دھت آج جس طریق پر مختلف حکومتوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں، وہ صاحبانِ علم ونظر سے مخفی نہیں!

یاد رہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ جو حضرت مجددؒ الف ثانی کی وفات کے بعد اور عالمگیر اورنگزیبؒ کی وفات سے چار سال قبل (۱۷۰۳ء۔ ۱۷۶۳ء) نواح دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ کے طالب علم کی نگاہوں سے ان ہر دو حضرات کے تعلیمی اور تحقیقی افکار ونظریات کسی صورت بھی اوجھل نہیں رہ سکتے۔ موجودہ زمانے میں اسلامی تعلیمات کی جو کچھ صحیح اور اصل شکل موجود ہے وہ ان ہر دو حضرات کا فیض ہے۔ یہ شاہ ولیؒ اللہ کے افکار وخیالات ہی تھے جنہوں نے ان کی وفات کے نصف صدی گزرنے سے پہلے ہی سوسائٹی کے صالح عناصر کو چھانٹ کر ایک جماعت کی شکل میں منظم کیا جسے آج ہم سید احمد شہیدؒ اور شاہ ولی اللہ کی تحریک جہاد ورد بدعات کی شکل میں ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' کی شکل میں ظہور پذیر ہوئے دیکھتے ہیں۔ (مسعود عالم ندوی ۱۹۷۵ء)

اسی ضمن میں علامہ اقبال نے بانگ درا میں ''تضمین بر شعر انیسی شاملو'' میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ اشعار بھی علامہ اقبال نے نظام الدین اولیاء کے مرقد پر حاضری کے موقعہ پر کہے تھے۔ بظاہر ان اشعار کا کوئی تعلق بھی تعلیمی نظام سے محسوس نہیں ہوتا لیکن بنظر غائر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزی دور میں رائج ہر دو نظام ہائے تعلیم (دینی اور دنیوی) جو آج بھی نہ صرف رائج ہیں بلکہ ان کے دوررس مضمرات نے پاکستان میں رہنے والی امت مسلمہ کو ایک ایسی گھمبیر صورت میں مبتلا کر دیا ہے کہ اگر اس کا جلد مداوا نہ کیا گیا تو ہماری دو سو سالہ آزادی کی جنگ کے نتیجے میں خدانخواستہ یہ اعزاز، ہماری اپنی کوتاہیوں کی بناء پر ہم سے واپس نہ لے لیا جائے!

تضمین بر شعر انیسی شاملو کے عنوان سے یہ چند اشعار بہت ہی قابل غور ہیں۔ علامہ

اقبالؒ نے یہ اشعار پیر سنجرؒ کی قبر پر حاضری کے موقعہ پر کہے

ہمیشہ صورتِ بادِسحر آوارہ رہتا ہوں
محبت میں ہے منزل سے بھی خوشتر جادہ پیمائی
دل بیتاب جا پہنچا دیارِ پیر سنجرؒ میں
میسر ہے جہاں درمانِ دارِ ناشکیبائی
ابھی نا آشنائے لب تھا حرفِ مدعا میرا
زباں ہونے کو تھی منتِ پذیر تاب گویائی
یہ مرقد سے صدا آئی، حرم کے رہنے والوں کو
شکایت تجھ سے ہے اے تارکِ آئین آبائی
ترا اے قیس کیونکر ہو گیا سوزِدروں ٹھنڈا
کہ لیلیٰ میں تو ہیں اب تک وہی انداز لیلائی
نہ تخم لا الہ تیری زمین شور سے پھوٹا
زمانے بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی
تجھے معلوم ہے غافل کہ تیری زندگی کیا ہے
کنشتی ساز، معمورِ نواہائے کلیسائی
ہوئی ہے تربیت آغوش بیت اللہ میں تیری
دل شوریدہ ہے لیکن صنم خانے کا سودائی
وفا آموختی ازما، بکارِ دیگراں کردی
ربو دے گوہر ازما، نثارِ دیگراں کردی

آخری فارسی شعر کا ترجمہ یہ ہے:

◆ تاہم ان ہر دو انتہائی اہم تاریخی واقعات جن کا ذکر ملی احیاء کے لیے ضروری ہے، صرفِ نظر کرتے ہوئے، ہم اپنے موضوع کتاب کی جانب آتے ہیں۔ (تفصیلات کیلئے دیکھئے مولانا غلام رسول کی کتاب تحریکِ مجاہدین)

(کہ تو نے اپنی تمام تر تعلیم و تربیت ہم (اسلام) سے حاصل کی لیکن خدمت تو غیروں/ فرنگیوں کی کر رہا ہے۔ تو نے ہم سے لعل و گوہر (علم و ہنر) حاصل کیے لیکن تو انہیں طاغوت (غیر اللہ نظاموں) پر نچھاور کر رہا ہے۔)

یہاں مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر کہی گئی نظم کا آخری شعر بھی اگر تازہ کر لیا جائے تو لطف دو آتشہ ہو جاتا ہے۔

باقی کلّہ فقر سے تھا ولولۂ حق
طروں نے چڑھایا نشۂ خدمت سرکار

اور تضمین بر شعر انیسی شاملو کا آخری شعر:

وفا آموختی ازما، بکارِ دیگراں کردی
ربو دے گوہرِ ازما ، نثارِ دیگراں کردی

کو ملا کر پڑھا جائے تو ہر دو متوازی نظامہائے تعلیم کے ساتھ چمٹے رہنے کے طرز عمل نے امت مسلمہ کو جن موجودہ بیشتر مسائل و مصائب کے گرداب میں پھنسا دیا ہے، اس سے نکلنے کے لیے جن انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے، وہ آسانی کے ساتھ نہیں اٹھائے جا سکتے کہ:

عزمِ سفرِ کعبہ و رُو در مشرق
اے رہرو پشت بمنزل ہشیار!

’’(زیارتِ کعبہ کا عزم) رکھنے والے اے مسافر تیرا رخ مشرق کی جانب ہے۔ اے وہ شخص جو اپنی منزل کی مخالف سمت میں سرگرداں ہے، آگاہ ہو جا (کہ تیرا ہر قدم تجھے منزل سے دور لے جا رہا ہے)۔‘‘

ان تمام اشعار میں نظام تعلیم کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان پر غور و فکر سے متعدد مقالہ جات لکھے جا سکتے ہیں تاہم آخری شعر تو اس قابل ہے کہ ہمارے تمام تعلیمی اداروں میں جلی اور نمایاں صورت میں نہ صرف لگایا جائے بلکہ طلبہ اور سب سے زیادہ اساتذہ بشمول وائس چانسلر اور دیگر کو اس شعر کے مضمرات کا ’’سبق‘‘ یاد دلایا جائے کہ:

''تعلیم'' فروختند، چہ ارزاں فروختند!

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۸۷۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام تر اختیارات حکومت برطانیہ نے سنبھال لیے اور یوں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور حکومت ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک (ایک صدی سے زائد) کے بعد ختم ہو گیا___ ادھر قدرتِ خداوندی کا کمال دیکھئے کہ ۱۸۷۷ء میں ملکۂ برطانیہ کی تاج پوشی کے لیے دہلی میں شاہی دربار منعقد ہوا جس میں **''جنگ آزادی میں انگریز کے ساتھ تعاون کرنے والوں کو خلعت، جاگیریں اور مناصب عطا ہوئے۔''** موجودہ پاکستان میں بیشتر وڈیرے، خوانین، چودھری، سردار اور بڑے بڑے سیاستدان انہی لوگوں کی ''باقیات ناصالحہ'' ہیں جنہوں نے آزادی کی سرگرمیوں کو سبوتاژ کرنے میں اس وقت انگریز کا ساتھ دیا تھا اور یوں انگریز سے جاگیریں حاصل کی تھیں۔ **یہ تمام لوگ پاکستان بننے کے بعد سے آج تک ملک میں یکساں نظام تعلیم کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔(انجم پرویز)**___ کسی ایک کا نام ہو تو ماتم کر لیا جائے یہاں تو بلا چند استثناء سبھی اس حمام میں ننگے ہیں!

اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے انداز بہت نرالے ہیں___ ادھر دہلی میں ۱۸۷۷ء میں شاہی دربار لگا اور اس سے ایک سال قبل ۱۸۷۶ء میں کراچی کے ایک فلیٹ میں ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام ان کے والد نے محمد علی جناح رکھا___ کسے معلوم تھا کہ یہ ننھا بچہ برصغیر میں برطانوی حکومت کے سورج کو غروب کرنے کی نوید لے کر آیا ہے!

سید احمد شہید کے بعد بھی ان کے ماننے والوں کی جانب سے جہاد کی مہم جاری رہی۔ جنوبی وزیرستان میں ملا پاوندہ (۱۸۹۳ء تا ۱۹۱۶ء) نے انگریز کو اپنے علاقوں تک آنے سے روکے رکھا (ڈاکٹر محمد خان محسود ۲۰۰۰ء)۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں ان کے نمائندوں نے وہ جہادی کوششیں ختم کیں۔ اسلام آباد میں ایک سڑک بھی ملا پاوندہ کے نام سے موسوم ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر برطانوی حکومت کے تحت ظلم و ستم کا وہ پہاڑ ٹوٹا جس کی نظیر دنیا میں شاید ہلاکو خان کے بعد دوسری ہو۔ مسلمانوں کو درختوں پر لٹکا کر

پھانسی دی گئی۔ بڑے بڑے اہل علم مولانا جعفر تھانیسریؒ اور دیگر کو کالے پانی (جزائر انڈیمان) کی سزا دی گئی۔ کروڑوں روپے کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔خونِ مسلم کی ارزانی تو شاید ایک رسمی بات سمجھی جاتی ہے!

ملکہ وکٹوریہ کی حکومت نے اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے لیے برصغیر میں متعدد اصلاحات کرنی شروع کیں۔ان تمام اصلاحات میں سے ''تعلیمی اصلاحات'' اہم ترین ہیں۔ لارڈ میکالے نے ہندوستان میں رائج مسلم تعلیمی نظام کو تبدیل کرتے ہوئے جو اصلاحات کیں ان کے اہم ترین نکات درج ذیل ہیں کہ اس تعلیمی نظام کے متعدد پہلو مستقبل بعید میں ہماری آئندہ گفتگو میں بہت زیادہ زیر بحث آئیں گے۔وہ چند نکات درج ذیل ہیں:

☆......انگریز زبان کی تعلیم کو سرکاری نوکری کے لیے شرط اول قرار دینا۔

☆......عربی فارسی کی تعلیم کا بالجبر خاتمہ، ریڈمشن ایکٹ کے تحت تمام تعلیمی اوقاف (زمینی جاگیر وغیرہ) کی ضبطی۔

☆......اس ایک اقدام سے تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان شاگرد اور اساتذہ لاکھوں کی تعداد میں بے کار ہو گئے۔

☆......اسلامیان ہند عالم اسلام سے کٹ گئے۔

☆......مسلمان اپنے ماضی کے شاندار علمی ورثے سے بھی محروم ہو گئے۔

یہاں ہم اپنی اس گفتگو کو ایک ایسی حقیقت کے تذکرے کے بعد ختم کرتے ہیں جس کا تعلق بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی ذات سے ہے کہ قیام پاکستان سے سات سال قبل (۱۹۴۰ء میں) قائداعظم نے مسلم لیگ کے تحت ایک کمیٹی ماہرین کی قائم تھی جس کے ذمے یہی کام تھا کہ مستقبل قریب میں وہ معرضِ وجود میں آنے والی ریاست کے لیے تعلیم کا ایک ایسا نظام وضع کریں جو ان اسلامی تقاضوں کو پورا کرے اور اس مملکت کی بنیاد بنے۔اس کمیٹی میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر ذاکر حسین خان شامل تھے اور اس کے چیئر مین سید سلیمان ندوی تھے ___ تاریخ کے صفحات اس امر سے خالی ہیں کہ اس کمیٹی کے کتنے اجلاس ہوئے اور

انہوں نے کیا کچھ خدمت سرانجام دیں۔تاہم قیام پاکستان میں انگریزی دور کے پس منظر کے اس ذکر کے بعد مملکت خداداد پاکستان کے تعلیمی نظام کے پیش منظر کا آغاز بھی ہم اس راہ نمائی سے کرنا چاہتے ہیں جو بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ نے اپنی وفات سے قبل تعلیمی نظام کی اہمیت کے پیش نظر دیا تھا۔ پاکستان بننے کے صرف تین مہینے کے اندر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائداعظم کے کہنے پر پاکستان میں پہلی تعلیمی کانفرنس بلائی گئی جس میں مشرقی و مغربی پاکستان کے ماہرین تعلیم کو دعوت دی گئی۔قائد نے اس کانفرنس کے نام ایک پیغام بھیجا جس میں انہوں نے لکھا کہ موجودہ نظام تعلیم ہماری ضروریات کی تکمیل نہیں کرسکتا اور ہمیں ''رائٹ ٹائپ آف ایجوکیشن'' (مثبت نظام تعلیم) کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔ اس کانفرنس کی سفارشات آئندہ صفحات میں نہ صرف درج کی گئی ہیں بلکہ ان پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ان سے واضح ہوتا ہے کہ بانی پاکستان کے دل میں نظام تعلیم کے بارے میں کس قدر اہمیت تھی؟ پھر اس میں اہم ترین وہ امر ہے کہ اپنی وفات پر قائداعظم نے اپنی کروڑوں روپے کی جائیداد اسلامیہ کالج پشاور (موجودہ پشاور یونیورسٹی کی اولین حیثیت)، اسلامیہ کالج لاہور، علی گڑھ یونیورسٹی اور سندھ مدرسۃ الاسلام کو دے دی۔

مملکت خداداد پاکستان کے تعلیمی نظام کے پیش منظر کا تذکرہ ابھی ختم نہیں ہوا جب تک کہ ان مسائل و آلام کا جائزہ نہ لیا جائے جو گزشتہ سات دہائیوں میں پیش آئے اور جن کے مضمرات کی بناء پر قائد کا پاکستان دولخت ہوا اور خدانخواستہ، ہزار مرتبہ خدانخواستہ رہے سہے پاکستان میں ''امن کی فاختہ'' اڑانے اور ''مصنوعی لکیروں'' کو مٹانے کا عزم رکھنے والے نام نہاد اخبار نویس، سیاستدان، پڑھے لکھے لوگ، بیرونی طاقتیں، این جی اوز (NGOs) کے بھیس میں مختلف تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے دن رات یہ ''خدمت'' سرانجام دے رہے ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت کے بعد سیاسی انتشار نے ایسی ایسی کروٹیں لیں کہ ''ایک مسلم لیگ'' کے بطن سے دو درجن سیاسی جماعتوں نے جنم لیا۔اس اکھاڑ پچھاڑ کے تین اہم ترین عناصر سیاستدان، بیوروکریسی اور براکریسی ہیں جنہوں نے مل جل کر اس

مملکت کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں اپنا حصہ ڈالا۔

☆......حالیہ دور میں اربوں/کھربوں روپے کی چوری اب کوئی ایسی حقیقت نہیں رہی جسے جھٹلایا جا سکے۔ ان تمام عناصر نے مذہبی، نیم مذہبی، صوبائیت، لسانیت کے نام پر ''کوڑھ کی کاشت'' کو پروان چڑھایا (ڈاکٹر حق حقی، ۱۹۹۹) گزشتہ ۷۰ سالوں میں ایوب خان سے لے کر ۲۰۱۸ء تک رشوت کے نام پر ہزاروں ایکڑ زمین اور اربوں روپے کی **''مدد برائے غربائے ملت''** کی دلدوز حقائق کے لیے دیکھئے کتاب درج بالا کوڑھ کی کاشت۔

☆......ایک درجن سے زائد تعلیمی نظاموں کا اجراء کیا اور یوں معاشرے کو مختلف النوع طبقوں میں تقسیم کر دیا کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، محبت اور دکھ درد بٹانے کا جذبہ بہت حد تک ختم ہو گیا! (باب ہفتم)

قیام پاکستان کی سات دہائیوں کے بعد آج جب ہم ان مسائل کے گرداب کا جائزہ لیتے ہیں جن سے ملک و ملت موجودہ دور میں دو چار ہے اس کے بارے میں حال ہی میں ملک و ملت کے ایک دردمند (ڈاکٹر انیس احمد 2017) نے واضح کیا کہ **''سرکاری یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے طلبہ میں تشدد پسندی اور دہشت گردی کے ذمہ دار دینی مدارس کے فارغ علماء کے بعض فتاوی نہیں ہو سکتے بلکہ یہ ہمارے درآمد (امریکن/ یورپین اضافہ از مصنف) نظام تعلیم کی ناکامی کی علامتیں ہیں۔ اس نظام میں تعلیم پانے والے اپنی اصل شخصیت گم کر بیٹھے ہیں۔ اخلاقی اقدار سے خالی تعلیم اور بالخصوص گزشتہ تین عشروں میں لبرلزم کی تحریک نے انہیں اپنی معاشرتی شناخت سے محروم کر دیا ہے''**

گزشتہ صفحات میں ہم نے بانئ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے ان اقدامات کا ذکر کیا ہے جو موصوف کو تعلیمی نظام کی افادیت، اہمیت اور اسے صحیح خطوط پر استوار کرنے کے بارے میں تھے، تاہم ان کی وفات کے بعد سے لے کر گزشتہ ۵۰/۶۰ سالوں میں جو دھما چوکڑی اور اندھیر گردی سیاسی گماشتوں اور بیوروکریسی نیز براکریسی کے منشاء و مرضی سے کی گئی اور جس نے تعلیمی نظام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور ہمارے درج بالا ''ممدوحین'' (بیوروکریسی) جس

طریق پر ''امریکی گوروں'' کے سامنے سجدہ گزار ہو کر اپنی ہی قوم اور ملک سے غداری/ بے وفائی کے مرتکب ہوئے، اس کا بھی ایک اجمالی جائزہ لینا از حد ضروری ہے! ملت کے ہر سہ عناصر بالخصوص بیوروکریسی دراصل ''بروکریسی'' جسے اپنی تعلیمی و انتظامی قابلیت پر بہت زیادہ ''فخر'' تھا اس نے بھی امریکی گوروں کے سامنے اس انداز میں ''سجدہ سہو'' کیا ہے کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اسی طرح ''براکریسی'' نے بھی جس انداز میں ماضی کے طالع آزما نام نہاد سیاسی لیڈروں کو کھل کھیلنے میں مدد فراہم کی وہ بھی اب کوئی راز نہیں رہا۔ اس کی تصدیق نہ صرف سپریم کورٹ کر چکی ہے بلکہ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ مرحوم جنرل حمید گل نے اپنی وفات سے پہلے خود کہا کہ وہ الطاف حسین (اور نمعلوم دیگر کن کن سیاسی شعبدہ بازوں) کے کردار سے نہ صرف واقف تھے بلکہ الطاف حسین کو تو انہوں نے خود (حکومت کے ایما پر) پیش کش بھی کی تھی کہ وہ ہندوستان سے امداد لینے کی بجائے ''ہم'' سے امداد لے کر اپنا مذموم کاروبار چھوڑ دے جس نے ہزاروں گھروں کے چشم و چراغوں کو ہمیشہ کے لئے مار دیا۔ نیز حال ہی میں جنرل اسلم بیگ کی کتاب ۲۰۲۱ء نے بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

اگرچہ ان گزارشات نیز ذیل کی معروضات کا بظاہر کوئی تعلق نظام تعلیم سے نظر نہیں آتا تاہم، ہم اپنی ایک کتاب **''یہودیوں کے تاریخی جرائم قرآن کے بیانئے میں (۲۰۲۰)''** سے دو اقتباس لکھنے پر مجبور ہیں کہ ''گزشتہ ادوار (برطانوی دور سے لے کر آج تک) جس قسم کا نظام تعلیم اس قوم کے سیاست دانوں، لبرل طبقے اور اس کے مقابلے میں دینی علوم کے شناساؤں نے چلایا ہے، وہ مخالفانہ اور محاربانہ نوعیت کا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن کا جو مطمح نظر ہے اور جسے غالب کرنے کی ذمہ داری امت محمدیہ ﷺ کو دی گئی ہے'' وہ پوری نہ ہو سکی۔ اس ضمن میں ہم درج بالا کتاب کے ایک حصے کو اختصار کے

ساتھ بیان کرنا چاہیں گے۔

☆......''سورۂ القصص میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرعون کے زمانے کے قارون (جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کزن تھا) کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی قوم سے غداری کا مرتکب ہوا اور فرعون کا مصاحب خاص بن گیا۔ اس ضمن میں جہاں یہ بتایا گیا کہ ''امت مسلمہ کی تاریخ میں اس قسم کے گٹھ جوڑ اور منافقانہ طرز عمل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں ــــــ تاہم موجودہ دور میں بھی ایسے بہت سے ''شریف اور حسین چہرے'' فراوانی کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان چہروں کی روشنی میں درج ذیل سوالات کے جواب تاریخ کے طالب علم کے لئے ہنوز تشنۂ گوش ہیں کہ

☆...... بھارت کے ساتھ بنگلہ دیش بنانے کا منصوبہ کن دو شخصیات کے درمیان اور کہاں اور کیا طے ہوا؟

☆...... ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں کن دو پارٹیوں نے صرف ایک ہی صوبے میں اپنے لوگ کھڑے کئے اور الیکشن میں جیتنے والی پارٹی کو حکومت بنانے کی دعوت کیوں نہ دی گئی اور جنرل یحییٰ خان کو لاڑکانہ بلا کر ''دعوتِ خاص'' کے بعد ڈھاکہ جانے والوں کی ٹانگیں توڑنے کا اعلان ''جمہوریت کے کس چیمپئن'' نے کیا تھا؟

☆......نزلے/ زکام کا بہانہ بنا کر UNO میں پولینڈ کی قرارداد کس نے پھاڑی جب کہ نیویارک شہر میں دنیا بھر کے علاج کی سہولتیں میسر تھیں۔

☆...... ایک تازہ ترین کتاب جس کے مسلمان بنگالی مصنف نے اپنی کتاب میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ جنرل نیازی نے کس ''نیازمندانہ انداز'' میں جنرل اروڑہ کا استقبال کیا؟ جب کہ پاکستانی افواج مشرقی پاکستان کے چپے چپے کی حفاظت کر سکتی تھیں (سید ابوالحسن 2020) اس امر کی گواہی ہمیں ایک تازہ ترین کتاب'' From Pakistan to BanglaDesh (2021) سے بھی ملتی ہے! جو پاکستانی فوج کے ایک ایسے غازی بریگیڈیئر کی آنکھوں دیکھا حال ہے جو خود اس جہاد میں شریک تھے!

☆...... پھر اس سانحۂ فاجعۂ کے ایک دوسرے پہلو پر بھی تاریخ کی گواہی کو نظر انداز نہیں کیا

جا سکتا اور وہ یہ کہ نظریۂ پاکستان اور مملکت خداداد پاکستان کے ساتھ غداری کا ارتکاب کرنے والوں کا کیا حشر ہوا۔

حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

☆......اندرا گاندھی کا کیا حشر ہوا جس نے نظریہ پاکستان کو خلیج بنگال میں دفن کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ نیز اس کے دیگر افرادِ خانہ کا کیا ہوا؟

☆......وہ بنگالی میجر (ضیاء الرحمٰن) جس نے بنگلہ دیش کا جھنڈا بلند کیا تھا، بعد ازاں میجر جنرل بن کر کس کے ہاتھوں، کب کہاں اور کیوں قتل ہوا؟

☆...... بنگلہ بندھو کا کیا حشر ہوا جسے خود اس کی فوج کے غیرت مند اور ایماندار نوجوان افسروں نے قتل کیا اور اس کی لاش کتنے دن تک بغیر دفنائے پڑی رہی۔ اس کا تمام خاندان سوائے بیٹی (جو بنگلہ دیش سے باہر گئی ہوئی تھی) کیونکر قتل ہوا؟

☆......ادھر وطن عزیز میں جمہوریت، سوشلزم کا نعرہ لگانے والے اور سینکڑوں/ ہزاروں (مشرقی پاکستان میں) کے قاتل بشمول نواب احمد یار خان اور ڈاکٹر نذیر شہید کے قاتل کا کیا حشر ہوا۔

☆......بھٹو کی صاحبزادی اور بیٹوں کا کیا حشر ہوا؟ وہ کس کے ایماء اور اشارہ پر قتل ہوئیں جس کے قتل کا سراغ کس کے اشارہ ابرو پر غیر ملکی ماہرین تک بھی نہ لگا سکے؟

☆......پنجاب کے ایک لینڈ لارڈ (مینڈا سائیں) کو کس شریف زادی کی آہیں لے بیٹھیں جس نے اسے پہلے خاوند سے طلاق دلوائی اور بعد ازاں اس کے ساتھ تشدد کا جو سلوک کیا، اس کی مثال تاریخ عالم میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی ـــــ نیز شادی شدہ حالت میں اس کی چھوٹی بہن پر بھی ڈورے ڈالے!◆

☆......اس فہرست جرائم میں اگر گزشتہ پچاس سالوں کے وزرائے اعظم، صدرِ مملکت اور الطاف حسین جیسے اور دیگر سیاسی زعماء کا اضافہ بھی کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں؟

☆......دین و دنیا کی ثانویت سے مرکب نظام تعلیم کی قہرمانیوں کا ایک اور پہلو بھی بہت

◆ کہ غیرت نام تھا جس کا گئی ''وڈیرے'' (مینڈا سائیں) کے گھر سے!'' (تہمینہ درانی)

عبرت انگیز ہے کہ زمانے بھر کے ''شرفائے قدیم اور جدید'' بھی غیرت نامی جذبے سے عاری ہو گئے ہیں اور آج وطن عزیز کے خلاف گٹھ جوڑ کے ذریعے اس مملکت کے ہی وجود کو مٹانے کے لئے سرگرداں ـــــ ذرا ان کی بھی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں کہ ان تمام لوگوں نے اپنے آباؤاجداد کی غیرت کا بھی سودا کر لیا ہے۔ سیاسی بازیگروں کا یہ طائفہ جو ایک ایسے بھان متی کے کنبے پر مشتمل ہے جن کے بزرگوں پر بلاول کے ''نانا'' نے کیا کچھ ظلم نہیں ڈھائے تھے۔ آج مولانا فضل الرحمٰن کو جو تھپکی کبھی شریفین کی جانب سے اور کبھی زرداری کی جانب سے دی جاتی ہے، کوئی اینکر پرسن ان سے پوچھے کہ سیکورٹی گارڈ کے ذریعے انہیں مفتی مرحوم کا قومی اسمبلی سے ''ڈنڈا ڈولی'' کے ذریعے باہر پھنکوانا یاد نہیں؟

☆ ......تاریخ کے طالب علم کو یہ امر بھی نہیں بھولا کہ ''جمہوریت ہماری سیاست کے داعی'' نے اپنے دور میں۔ ''یہ کس کے لئے کہا تھا کہ ''اس کی تقریریں میں برداشت نہیں کر سکتا'' اور اس کے ایک بدزمانہ گورنر نے ایک پالتو غنڈے'' کے ہاتھوں کلینک میں بیٹھے ایک بہادر اور جری انسان (ڈاکٹر نذیر) کی جان لے لی؟

☆ ......کس کے حکم پر میاں طفیل محمد پر جیل میں جو ''ناروا اور غیر مہذب سلوک'' کیا گیا جس کے لکھنے سے قلم بھی شرماتا ہے اور اس روئداد کو سن کر سید مودودی جیسے شخص نے اپنی زندگی میں پہلی بار بددعا دی تھی؟

☆ ......روزنامہ جسارت کے ایڈیٹر صلاح الدین کے ساتھ بدسلوکی اور قید کس کے حکم پر کی گئی تھی۔

☆ ...... پاکستان کی سیاست کے ایک غیور اور وضعدار شخص پر کس کے حکم پر بھینس کی چوری کا مقدمہ بنایا گیا ـــــ جب جج نے ایک الزام سے بری کر دیا تو عدالت کے باہر ایک دوسرا تھانیدار شاملاتِ دیہہ سے ریت/مٹی چوری پر گرفتار کرنے کھڑا تھا۔ اس الزام سے بریت پر سندھ حکومت کا اہلکار ڈی پی آر کی خلاف ورزی پر گرفتاری کے وارنٹ لیے منتظر تھا ـــــ عدالت کا پیمانۂ صبر و انصاف شاید ایک وقت میں دو

''الزامات'' سے بری کرنے کے بعد مزید صبر کا متحمل نہ ہو سکا۔ گرفتاری کی اجازت دیتے ہوئے یہ حکم دیا کہ چوہدری ظہور الٰہی صاحب کو پنجاب کی حدود سے باہر نہ لے جایا جائے ___ لیکن پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس نے اس عدالتی حکم کا نوٹس اس وقت لیا جب چوہدری صاحب سکھر پہنچ گئے تھے ___ تاہم کراچی سے انہیں بدنام ترین جیل کولہو نامی میں نظر بند کرنے کا فیصلہ ہی نہیں ہوا بلکہ نواب اکبر بگٹی (گورنر/ چیف منسٹر بلوچستان) کو ''حکم نادر شاہی'' ہوا کہ مجرم کو راستے ہی میں مار دیا جائے ___ وہ تو اللہ درجات بلند کرے نواب صاحب (مرحوم) کے جنہوں نے جواباً کہا کہ **''سائیں کیا پنجاب اور سندھ کی سرزمین اس ''حکم ناروا'' کے لئے مناسب نہیں تھی جو بلوچستان کے سر اس قتل ناحق کا وبال ڈالا جا رہا ہے؟''** اور بھٹو کے ان عزائم کو بھانپتے ہوئے، اپنے ذاتی گارڈز کو چوہدری صاحب کی حفاظت کے لئے متعین کر دیا تا کہ بھٹو کے اشارے پر کوئی شخص انہیں قتل نہ کر دے۔

☆ ...... بھان متی کے اس کنبے میں شامل باچا خان کے صاحبزادے، عبدالولی خان، شیر بخش مزاری، غوث بخش بزنجو اور عطاء اللہ مینگل کے بارے میں کبر و نخوت پر مبنی یہ بیان کس نے دیا کہ **''میری زندگی میں یہ رہائی نہ پا سکیں گے۔''** یہ تمام حضرات حیدر آباد جیل میں جس کسمپرسی کے عالم میں رہے، وہ بھی آج ان کے ''بے غیرت'' وارثین کے دل سے محو ہو گیا ہے کہ وہ ''نانا'' کے نواسے کی معیت میں آج وطن عزیز اور افواجِ پاکستان کے خلاف زہر اگلنے میں لگے ہوئے ہیں جب کہ ان تمام لوگوں کو رہا کرنے والا شخص بھی ایک فوجی تھا!

ہمیں افسوس ہے کہ ہم کسی حد تک اپنے موضوع سے ہٹ گئے ہیں لیکن دراصل یہ وہ تلخ اور کڑوے پھل ہیں جو گزشتہ پانچ چھ دہائیوں میں نظامِ تعلیم کے نتیجے میں ''سرفراز'' ہونے والے سیاسی، مذہبی اور لبرل لوگوں کے افکار و اعمال کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں اور جن کا ایک اجمالی جائزہ تعلیمی نظام کے تشکیل جدید کے لئے بہت ضروری ہے کہ

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام!

باب ہفتم

نظام تعلیم ـــــ دو رنگی کے اثرات

''نظام تعلیم ـــــ دو رنگی کے اثرات'' کے موضوع پر اپنے مقالہ میں محمد صلاح الدین صاحب نے ہمارے مروجہ نظام تعلیم کے مختلف النوع رنگوں کا ذکر کرتے ہوئے نہایت دلچسپ اور حیران کن انکشاف کیا ہے ـــــ بقول مقالہ نگار ''ملک کے تعلیمی اداروں کو ہم چھ بڑے گروپوں میں تقسیم کر سکتے ہیں'' ـــــ ان گروپوں میں عام تعلیم کے ادارے شامل ہیں۔طبی، فنی، زرعی اور دیگر پیشہ ورادارے اس کے علاوہ ہیں۔ان کے بارے میں ہم نے اس کتاب کے پہلے حصے میں کس قدر تفصیل کے ساتھ اپنی معروضات پیش کی ہیں۔

گوشوارہ نمبر ①: پاکستان میں طبقاتی نظام تعلیم

I	II	III	IV	V	VI
حکومت کے زیر انتظام تعلیمی ادارے	مشنری سکول/ کالجز	مشنری اداروں کی طرز پر قائم کردہ لیکن مقامی افراد/ تنظیموں کے تحت چلنے والے ادارے	انگریزی ذریعۂ تعلیم کے ادارے جو بڑے شہروں میں حشرات الارض کی طرح ابھر آئے ہیں	کمیونٹی سکول/ کالجز	دینی مدارس

گوشوارہ نمبر I (الف) حکومت کے زیر انتظام تعلیمی ادارے

قومی اداروں کی رنگارنگی ____ مختلف امور میں حیرت انگریز تفاوت
(جدا نصاب، تعلیمی سہولتوں میں فرق، مختلف تنخواہیں، طلبہ کی طبقاتی تقسیم)

(i) اردو ذریعۂ تعلیم کے عام پرائمری اور ہائی اسکول
(ii) انگریزی ذریعہ تعلیم کے ماڈل پرائمری اور ہائی اسکول
(iii) انگریزی ذریعہ تعلیم کے پبلک پرائمری اور ہائی اسکول
(iv) لارنس کالج (موجودہ پائینز اسکول اور کالج) گھوڑا گلی جیسے خصوصی ادارے
(v) کیڈٹ اسکول اور کالج (مری، پٹارو، کوہاٹ اور حسن ابدال جیسے خصوصی ادارے)
(vi) اردو ذریعہ تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے جداگانہ کالج

گوشوارہ نمبر I (ب) مشنری سکول/کالجز

(اس کے تحت بھی مختلف اقسام کے تعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں)

(i) غریب لوگوں کے لیے۔ مفت یا برائے نام فیس۔
(ii) متوسط طبقے کے بچوں کے لیے سکول
(iii) امراء اور روساء، اعلیٰ عہدیداران اور وڈیروں کی اولاد کے لیے کیمبرج نظام تعلیم کے ادارے از قسم کراچی کے سینٹ لارنس، سینٹ پیٹرک، سینٹ جوزف، گرائمر، امریکن، ایچی سن وغیرہ

نوٹ: ان سب سکولوں میں نصابِ تعلیم، فیس سٹرکچر، اساتذہ کی تنخواہیں اور طلبہ کے لئے علیحدہ سہولتیں میسر ہیں۔

گوشوارہ نمبر I (ج) مشنری اداروں کی طرز پر قائم لیکن مقامی افراد اور تنظیموں کے تحت چلنے والے تعلیمی ادارے

اس کے تحت بھی متعدد سکول سسٹم ہیں۔ مشن اداروں سے علیحدہ تاہم مشن ہی کے طرز پر قائم صنعت کاروں اور قانون پیشہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے زیر انتظام ذاتی / پرائیویٹ سکول از قسم بیکن سکولز وغیرہ۔ اس قسم کے تمام سکولوں میں تمام تر نصاب تعلیم اور دیگر معاملات امریکن/ یورپین انداز کے ہیں۔

گوشوارہ نمبر I (د) انگریزی ذریعہ تعلیم کے ادارے جو بڑے بڑے شہروں میں قائم ہیں

چوتھے گروپ میں انگریزی ناموں کے ساتھ اور انگریزی ذریعہ تعلیم پر مبنی وہ اسکول ہیں جو گزشتہ چند سال کے اندر کراچی، لاہور، فیصل آباد، اسلام آباد، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، حیدرآباد اور دوسرے شہروں کے رہائشی علاقوں میں تجارتی دکانوں کی طرح تیزی سے کھلے ہیں اور تجارت ہی کے اصولوں پر چل رہے ہیں۔ ان کا اپنا مخصوص اور جداگانہ رنگ ہے۔ **سنگاپور کی چھپی کتابیں پڑھانا اور والدین کی جیبوں کا بار ہلکا کرنا ان کا امتیازی وصف ہے**___ یہ لوگ بھی اپنے طور پر مستقبل کی لیڈر شپ تیار کرنے والے ہیں جن کا دین یا اپنی تہذیب سے اس قدر تعلق ہی ہوگا کہ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہوتے ہیں!

گوشوارہ نمبر I (ر) کمیونٹی سکول/کالجز

اس گروپ میں مختلف کمیونٹیز کے مخصوص ادارے مثلاً
آغا خان کمیونٹی،
بوہرہ اور
ربوہ اور قادیانی کمیونٹی کے سکول اور کالج۔

گوشوارہ نمبر I (ز) دینی مدارس/مسالک پر مبنی ادارے

حنفی بریلوی مدارس	حنفی دیوبندی مدارس	اہل حدیث مدارس	فقہ جعفریہ شیعہ مدارس

ان مسلکی مدارس میں بھی ہر مسلک کے تعلیمی اداروں کا نصاب، ماحول اور رنگ مشترک نہیں، مختلف النوع ہے ان میں مخصوص مسلک کا رنگ بہت گہرا اور پختہ ہے! اس صورت حال سے اتنی بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہمارے ملک میں اس وقت کوئی ایک قومی نظام تعلیم نہیں، پورا نظام تعلیم طبقاتی، گروہی، فرقہ وارانہ اور ملکی وغیر ملکی اثرات کی زنجیروں اور حد بندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ڈیڑھ درجن سے زائد ان مختلف النوع تعلیمی نظاموں/ اداروں سے نکلنے والی نسل کس طریق پر ایک نظریاتی اسلامی مملکت میں اس اتحاد، تنظیم اور ایمان کا مظاہرہ کرسکتی ہے جو قائداعظم نے اس مملکت میں رہنے والی امت مسلمہ کے لیے تجویز کیے تھے؟

''صاحب مقالہ نے وضاحت کی کہ درج بالا تعلیمی نظاموں کے مطالعے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آزادی سے قبل اور عہد غلامی میں لارڈ میکالے کی تیار کردہ تعلیمی پالیسی کی بنیادوں پر جو نظام استوار کیا گیا تھا، اس کے پانچ مقاصد تھے۔

(ا) انتظامی مشینری کے لیے کلرکوں سے لے کر آئی سی ایس (حالیہ CSP) افسروں

تک تاج برطانیہ کے وفادار اور سستے ملازمین کی کھیپ تیار کرنا۔

(۲) مغربی تہذیب اور افکار کے غلبے کے لیے انگریزی زبان کو وسیلہ بنانا اور اس کے ذریعے مغرب کے سرچشمہ علم واقتدار سے قلب ونظر کا رشتہ اس طرح جوڑے رکھنا کہ نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد بھی یہ لاسلکی ربط وتعلق اپنی جگہ قائم رہ سکے۔

(۳) غیر پیداواری افرادی قوت فراہم کرنا جو ایک طرف انتظامی مشینری کے علاوہ فوج، زرعی معیشت اور تجارتی سرگرمیوں کی ضروریات پوری کر سکے اور دوسری طرف برطانیہ کی صنعتوں کے لیے صارفین کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جائے، صارفین کے اس معاشرے (Consumer Society) کو تنخواہ کی صورت میں جو رقم ادا کی جائے وہ مصنوعات کی منہ مانگی قیمتوں کی صورت واپس وصول کر کے برطانیہ پہنچادی جائے۔

(۴) عیسائیت کو فروغ دیا جائے اور مقامی لوگوں کی بڑی سے بڑی تعداد کو اپنا ہم مذہب بنا کر ان کا رشتہ وفاداری برطانیہ اور اس کے سرپرست کلیسائے روم سے جوڑ کر سیاسی اثر ورسوخ میں اضافہ کیا جائے۔ اور بعد ازاں

(۵) معاشرتی زندگی کا مربوط ڈھانچہ توڑ کر مختلف طبقات وجود میں لا کر انہیں باہم متصادم کر دیا جائے تا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے رہیں اور ان کا رخ ہماری طرف نہ ہو۔ وفادار امراء، روساء، راجوں مہاراجوں اور مسلمان حکمرانوں کو تہذیب مغرب اور عیسائیت کا درس دیا جائے جو عیسائی نہ بن سکیں، ان کا کم سے کم ذہنی پستمہ (Baptisim) ضرور ہو جائے وہ ''اینگلو محمڈن اور اینگلو انڈین بن جائیں''

درج بالا مقاصد کے برعکس، **صاحب مقالہ نے مدینہ کی ریاست میں صفہ نامی پہلی اقامتی درس گاہ کے بارے میں درج ذیل آٹھ خصوصیات کا ذکر کیا۔**

(۱) صفہ کا مدرسہ، اسلام کی اقامتی درسگاہ کا مسجد نبویؐ میں قیام، اس امر کا غماز ہے کہ اسلام میں مسجد ومدرسہ ایک مربوط ادارہ ہیں جو علم وعمل کی وحدت اور یک جائی کا مظہر ہے۔

(۲) اس مدرسہ/ یونیورسٹی کی دوسری خصوصیت معلم ومتعلم کے درمیان ۲۴ گھنٹے کی رفاقت تھی ـــــ یہاں اصولوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کی تعلیم دی جاتی تھی۔

(۳) صفہ کے مدرسہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے ہوااور پانی کی طرح علم کو بھی نہ صرف بنیادی ضروریات میں شامل کیا بلکہ انہی کی طرح بلا قیمت اور سہل الحصول بنا دیا۔۔۔ علم غرباء کی میراث بن گیا۔اس غیر طبقاتی نظام کی بدولت متعدد علوم کے ماہرین اور اہل علم پسماندہ اور متوسط طبقے سے ابھرے اور آسمانِ علم پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

(۴) حصول علم کے لئے اس مدرسہ نے مفت تعلیم کا بندوبست کیا۔ ریاست، طبقۂ امراحتیٰ کہ غریب مزدور/کسان بھی اس کی کفالت کے لیے چندہ/ اعانت دیتے تھے۔ یوں یہ سلسلہ تعلیم، ریاست اور افراد معاشرہ کی ذمہ داری بن گئی۔۔۔ یہ سلسلہ ہمارے دور تک جاری رہا جو انگریز نے Redumption Act کے تحت ایسی تمام جاگیریں/عطیات ضبط کرنے سے ختم کیا۔

(۵) کفالت عامہ کی بناء پر استاد کسی کا ملازم نہ تھا اور شاگرد کسی کے وظیفہ خوار نہ تھے۔۔۔ یوں تعلیم دینے والوں اور شاگردوں میں حریت فکر، آزادانہ علمی تحقیق اور بے خوف و خطر اظہار رائے کی روح میسر آ گئی۔

(۶) اس نظام تعلیم کا بنیادی وصف اخلاق حسنہ کا پیدا کرنا تھا جس کا اظہار یوں ہوا کہ نصف صدی میں اسلامی ریاست ایک عظیم اخلاقی انقلاب سے روشناس ہوئی کہ انسان کو پہلی بار حقیقی امن وسکون اور اطمینان کی لذت نصیب ہوئی۔

(۷) اس نظام تعلیم کا دائرہ کار مدرسہ/ مسجد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کا دائرہ خاندانی، معاشرت اور اس کے ہر دائیرے تک وسیع ہو گیا جس کے تحت نہ صرف مفسرین، محدثین، فقہاء کا ایک بہت بڑا طبقہ وجود میں آیا بلکہ ریاضی دان، سائنس دان، حکماء اور دیگر علوم کے ماہرین نے ثبت است بر جریدہ عالم دوامِ ماست کی کیفیت پیدا کر دی۔

(۸) اس نظام تعلیم کے ذریعے تمام قسم کے گروہی، مذہبی، نسلی اور قومی تعصّبات ہی ختم نہ ہوئے بلکہ مسلمانوں نے یونانی، رومی، فرانسیسی ماہرین کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے سینکڑوں نئے علوم کی بنیاد رکھی۔

شعاعِ امید:

درج بالا گزارشات کے علاوہ، یہ امر باعث اطمینان ہے کہ تعلیمی ثنویت کے جو برے اثرات ماضی قریب میں تعلیمی معیار کے پست ہونے، اخلاقی بے راہ روی، جنسی تشدد اور وطن عزیز کے مختلف خطوں/صوبوں میں لسانی، مذہبی، فرقہ واریت کے ایک طوفان بے محابہ کی شکل میں رونما ہوئے ہیں، اس سے اس ملک کا ذہین اور دردِ دل رکھنے والا طبقہ غافل نہیں رہا۔ اللہ کا فضل ہے کہ وطن عزیز میں اسی قسم کا ذہن رکھنے والوں کی ایک معتد بہ تعداد موجود ہے جو اپنے طور پر ایسے تجربات کر رہے ہیں اور ان تجربات کو میڈیا (پرنٹ اور الیکٹرانک) کے ذریعے فروغ دینے کے لئے بھی کوشاں ہیں۔ ذیل میں ہم ایسے چند نمونہ کے اقدامات کا ایک سرسری جائزہ لے کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قسم کی تمام کوششوں کو باہم مربوط کیا جائے تا کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر تعلیمی اور اخلاقی تنزل کے اس طوفان کا مقابلہ کیا جا سکے جس نے ملت اسلامیہ پاکستان کو بالخصوص اور عالمی پیمانے پر ملت کو خطرناک اور مہیب ترین مسائل سے دو چار کر دیا ہے!

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تندِ جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہہ و بالا

(۱) ہم نے آفاق نامی (Association For Acadmic Quality) ایک تنظیم کا گزشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے۔ اس ادارے نے گزشتہ چند سالوں میں متعدد ایسی کوششیں کی ہیں اور جس قسم کا تعلیمی لٹریچر تیار کیا ہے، وہ بہت حیرت انگیز ہے۔ ان کوششوں سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ ملت اسلامیہ میں ایسی چنگاری بھی اپنے خاکستر میں ہے، وہاں اس سے یہ امید بھی بندھتی ہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

آفاق کے مختلف النوع مقاصد میں ان کے ریسرچ ڈویژن نے سکول کے بچوں کے لئے نصابی کتب کی تیاری کا جو منصوبہ بنایا ہے وہ نہ صرف قومی نصابی گائیڈ لائن (National Curriculum Gauidlines) کے عین مطابق ہے بلکہ وہ ان بنیادی نصابی کتب کے بین الاقوامی (امریکہ، برطانیہ، سنگاپور) علمی اور طباعتی معیار سے بھی کسی طرح کم نہیں

ہوتے۔ ◆ اس طریق پر یہ درسی اور اس سے متعلقہ ضروری مواد نہ صرف ہمارے ملکی/ملی سماجی وثقافتی ضروریات کو پورا کرتے ہیں بلکہ عالمی سطح کے معیار کے مطابق بھی ہیں۔آفاق کی ان درسی کتب/مواد کا ایک مزید پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ درسی اسباق کے ذریعے ہماری دینی روایات اور تعلیمات کو بھی اس مواد میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ وہ علمی طور پر جدید زمانے میں نوجوان نسل کی ضروریات کو پورا کرنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ مند ہیں۔

آفاق ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ ٹیم (R & D) نے اب تک 1000 سے زائد تین موضوعات پر کتب/تدریسی مواد جو ''نخلہ سیریز''، ''طلوع آفتاب سیریز (New Sun Series)'' اور ''اقبال سیریز'' کے نام سے تیار کیا ہے۔ جو ابتدائی تعلیم سے لے کر میٹرک تک کے طلبہ کی ضروریات باحسن پوری کرتا ہے! مزید براں، اس ادارے نے عام مطالعے کے لیے پڑھنے کا مواد ریڈرز (Readers)، انسائیکلوپیڈیا اور گرائمر سیریز کہلاتا ہے جو انگریزی اور اردو ہر دو زبانوں میں ہے، بھی بنائے ہیں۔

یہاں ہم آفاق کے اس شہرہ آفاق بچوں کے لئے انسائیکلوپیڈیا کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو از خود ایک بہت عظیم الشان حیثیت کا حامل ہے ''آفاق انسائیکلوپیڈیا'' کے نام سے اردو اور انگریزی میں چار موضوعات از قسم حیوانات (چیونٹی سے لے کر وہیل مچھلی)، شخصیات (تمام دنیا بالخصوص عالم اسلام کی مشہور شخصیات) پر مشتمل حالاتِ زندگی، تمام دنیا کے ممالک کا محل وقوع، تاریخی پس منظر اور موجودہ حالات پر مشتمل ہے۔اس کے علاوہ چوتھا موضوع ایجادات (سوئی سے لے کر ایٹم بم اور زمانۂ حال کی جدید ترین ایجادات) پر مشتمل مواد تیار کیا گیا۔آٹھ صفحات پر مشتمل یہ علمی، تحقیقی مواد چہار رنگوں میں بہترین کاغذ پر اس قدر نفیس اور جاذب نظر انداز میں طبع کیا گیا ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔اور اس کی قیمت صرف ۲۵ روپے فی رسالہ ہے (جس پر رعایت بھی مل جاتی ہے)۔

◆ اگر اسے مبالغے پر محمول نہ کیا جائے تو اولیول، اے لیول کی کتب سے بہتر ہے جو سنگاپور/امریکہ وغیرہ سے درآمد کی جاتی ہیں جو نہ صرف کتب کا حجم/وزن بڑھانے کے لیے ہر قسم کے رطب و یابس سے بھری ہوتی ہیں بلکہ قیمتی زرمبادلہ بھی خریدنے پر خرچ ہوتا ہے۔

ذاتی طور پر راقم الحروف آفاق کے اس پروگرام سے اس قدر متاثر ہوا ہے کہ نہ صرف اپنے بچوں کے لیے بلکہ دیگر احباب، ملنے جلنے والوں کے بچوں کو ایک بڑی تعداد میں یہ رسائل تحفے کے طور پر دینا شروع کر دیا ہے!____

(۲) آئندہ صفحات میں ہم نے ملت کا درد رکھنے والے ایک استاد (اشتیاق احمد ۲۰۱۷ء) کا تجویز کردہ نصاب تعلیم درج کیا ہے اور جس کی ایک بہت عمدہ خصوصیت یہ ہے کہ سائنسی مضامین کو اردو میں پڑھانے پر نہ صرف زور دیا گیا ہے بلکہ ان کا تیار کردہ مواد بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے، اس کو بھی ان کوششوں میں بدرجۂ اتم شامل کیا جا سکتا ہے۔

(۳) تعلیمی زبوں حالی کی ایک زخم خوردہ لیکن دردِ دل رکھنے والی ایک خاتون ڈاکٹر صاحبہ (ثمینہ معراج) نے اپنی ذاتی کوششوں اور تعلیم و تعلم کے ذوق کے پیش نظر بچوں کے لیے نصابی تعلیم کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کی جھلک انٹرنیٹ پر دیکھی جا سکتی ہے بلکہ ان کے لیکچر بھی سنے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے بالخصوص چھوٹے بچوں کو دینی اصطلاحات کے استعمال سے اوائل عمر میں ہی متعارف کرانے کا ایک بہت نادر طریقہ استعمال کیا ہے ◆ جو وہ اپنی میڈیکل پروفیشن کی ذمہ داریوں کے علی الرغم چند سکولوں میں جا کر بچوں کو پڑھاتی بھی ہیں۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ ان کے شغف اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

(۴) اسی ضمن میں کراچی میں عثمان پبلک سکولز کے نام سے ایک ادارے کا قیام عمل میں آیا تھا جس نے ''افق'' کے نام سے اپنے سکولوں کے لئے ایک نصاب تیار کیا ہے جو اول جماعت سے لے کر دسویں تک کے لئے ہے اور ہماری معلومات کی حد تک وہ ایک کامیاب سسٹم کے طور پر کراچی میں چل رہا ہے۔

درج بالا چند مختصر (شاید نامکمل بھی) معلومات سے یہ اندازہ کرنا شاید ناممکن نہیں کہ

◆ دیکھئے ویب سائٹ Pakistan Home School.com یہ کتب اور اسباق U ٹیوب پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

بقول علامہ اقبالؒ

مغرب زتو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی!

ضرورت اس امر کی ہے کہ ''نقش دگر'' کی ان تمام کوششوں کو باہم مربوط کیا جائے اور ہم خیال اہل علم اکٹھے بیٹھ کر ایک متفقہ کوشش کریں۔

اس ضمن میں ہم اپنے عالم و فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کی اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں وطن عزیز کی کسی بھی سیاسی حکومت (جو اپنے تمام تر اعمال واحوال کے لئے) بیوروکریسی کی مرہونِ منت ہوتی ہے، نیز اپنی حکومتوں کے قیام اور تسلسل کے لئے وہ جس انداز میں ''سیاسی جکڑ بندیوں'' میں محبوس و مقید ہوتی ہیں نیز وطن عزیز میں نام نہاد مذہبی راہ نماؤں کی ''ذاتی اور فقہی وابستگی'' کی بناء پر یہ کام نہیں کیا جا سکتا۔ **جہاں تک حکومتی اداروں کا تعلق ہے تو اول قدم پر اس امر کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ موجودہ تمام تر تعلیمی زبوں حالی اور مسائل کے کوہ ہمالیہ کے ذمہ دار یہ بیوروکریسی ہی ہے۔ ایں ہمہ آوردۂ تست کے تحت اگر اس بیوروکریسی اور اس کے تحت جاری نظام نے ملک وملت سے وفاداری کے طور پر آنکھیں کھول کر حکومتوں کی مدد کی ہوتی تو آج وطن عزیز کو یہ برا وقت دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد جس طرح قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ایک کمیشن کے ذریعے تعلیمی نظام کی ''طرح نو اور نقش دگر'' کے لیے کوششیں شروع کی تھیں اگر وہ جاری رہتیں تو ان سطور کے لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔**

امر واقعہ یہ ہے کہ حکومتی پالیسیاں اور معاملات ''دفتری کلرکوں'' کا وہ نظام ہی چلاتا ہے جو لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ اسی نظام میں اہم ترین حیثیت صاحب بہادر/ گورے حاکم کو ہوتی تھی کہ وہ جو پالیسی اور احکامات دیتا تھا، اس کے ماتحت عملہ اس کو نافذ کرنے میں جان جوکھوں کی بازی لگا دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ گورا حاکم تجارتی مفادات اور بعد ازاں تاجِ برطانیہ کا سچا اور کھرا وفادار تھا۔ دورِ غلامی میں

مغربی تعلیم وتہذیب کے زیر اثر جو''اینگلو محمڈن'' بیوروکریسی بن گئی تھی، اس میں پھر بھی کسی حد تک آزادوطن اور ملت کا کچھ نہ کچھ درد ضرور تھا۔ اس لیے آزادی کے فوراً بعد کچھ عرصے تک حالات کا رخ بلندی اور ترقی کی جانب رہا (جس کی تفصیل حصہ اوّل میں کی گئی ہے) تاہم بعدازاں جس انداز میں سیاسی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی اور تعلیمی نظام کا جو حلیہ بگاڑا گیا، اس میں دو پہلو بہت قابل ذکر ہیں جن کی جانب ''نقش دگر'' بنانے والوں کو بہت توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اولاً......نام نہاد بیوروکریسی/ صاحب بہادروں کا ایک ایسا ٹولہ عملاً اس ملک پر قابض ہوگیا جن کا تعلق نام کی حد تک تو مسلمانوں کا سا ہے لیکن ان کی سوچ مغرب کی مرہون منت ہے۔ انہیں اس ملک اور ملت سے صرف اس قدر اور اس حد تک دلچسپی ہے کہ ان کا اقتدار قائم رہے۔ انہوں نے اپنے دماغ سے کام لینا چھوڑ دیا۔ (یوں انہوں نے قدیم لاہور کے ایک حکیم طاہر الدین کے بنائے ہوئے ''امرت دھارا'' کا روپ دھار لیا جو بیک وقت ہمہ اقسام درد از قسم سر درد، کان/ دانت درد، جسمانی درد/ چوٹ کا علاج، معدہ کے جملہ امراض اور سانس کی تکالیف نزلہ/ زکام کے علاج میں یکساں اور فوری طور پر کام آتا تھا)____ کچھ نے فوجی ڈکٹیٹروں کے احکامات بطور ''بٹ مین'' بجالانے شروع کردیئے اور کچھ نے تمام تر انحصار اس ''چھوٹے دفتری کلرک'' پر کرنا شروع کردیا جو ان کے احکامات کے لئے نہایت خوبصورت تحریر میں ''سمری'' بنا کر پیش کر دیا کرتے ہیں اور ''صاحب بہادر/ سیکرٹری محکمہ'' اسے متعلقہ وزیر کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے ہیں۔ جو از خود ''وزیر ناتدبیر'' کے زمرے میں آتے ہیں۔ ہمیں ایسے ایسے ''CSP بیوروکریٹ'' کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شرف حاصل ہے جو نہ صرف یہ کہ روش بندہ پروری سے ہی محروم تھے بلکہ ایسے احکامات پر بھی آنکھیں بند کر کے INITIAL کر دیتے تھے (دفتری اصطلاح میں اسے ''گھگی مارنا'' کہتے ہیں یعنی مختصر دستخط کرنا بطور منظوری) جس پر انہیں اپنے ایسے احمقانہ اقدامات پر بڑے سیکرٹری سے جھاڑ بھی کھانی پڑی تھی!

ثانیاً ...... درج بالا صورت حال کے ساتھ ایک اور امر جس پر اغیار (بالخصوص

امریکہ) گہری نظر رکھتے تھے کہ انہوں نے نہ صرف مرکزی سیاسی قیادت بلکہ بیوروکریسی حتیٰ کہ صوبوں کے ''بڑے لوگوں'' کے کوائف بھی اس دقتِ نظر کے ساتھ جمع کیے ہوئے تھے کہ ان تمام کے ذاتی کوائف/ کمزوریوں تک کے بارے میں انہیں معلومات حاصل ہوتی تھیں جس سے انہوں نے فائدہ اٹھایا۔ آزادی کے ابتدائی چند سالوں میں تعلیمی اور تربیتی دوروں کی اس قدر بھرمار ہوتی تھی کہ ہر بڑے افسر کے لئے امریکہ یاترا بہت ضروری سمجھی جاتی تھی اور وہاں سے وہ اس قدر ریشہ خطمی ہو کر آتے تھے کہ انہیں کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ تاہم بعد ازاں جب کسی حد تک ''حجاب'' ختم ہوا اور گوروں کے ساتھ یگانگت بڑھی، ادھر سیاسی حالات اس قدر دگرگوں ہوتے چلے گئے کہ سیاسی لوگ صرف اپنی کرسی کا دفاع کرنے کی تدبیریں ہی کرتے رہتے تھے تو بیوروکریسی نے ''امریکن گوروں/ گوریوں'' کے سامنے اس انداز میں ''سجدہ سہوٗ'' ادا کرنے کی ریت اپنا لی کہ نام نہاد ماہرین کے وفود جو کچھ ''احکامات اور سفارشات'' لے کر آتے تھے، چائے کے کپ یا لنچ/ ڈنر کے موقع پر وہ زیر بحث آتے اور ان کی سمری بنا کر سیکرٹری محکمہ اپنے وزیر کو پیش کر دیتے جو اسے کابینہ کی میٹنگ میں پیش کر کے (ماضی میں اور شاید اب بھی) احکامات جاری کر دیتے رہے ہیں۔ یوں صاحب بہادر اور ان کے ماتحت دفتری کلرکوں کو بھی آسانی ہوگئی کہ کسی کو بھی اپنے دماغ سے کام لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور رنگ بھی چوکھا ہوتا ہے کہ خالص امریکی زبان میں گورا اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جاتا تھا!

استعارے کی زبان کو چھوڑتے ہوئے کہ اب اس قسم کی باتیں ہم جیسے گرم و سرد چشیدہ لوگوں ہی کو سمجھ آتی ہیں، جہاں تک موجودہ نسل کا تعلق ہے تو ان کے لئے تو اب اس قسم کی باتیں چیستان کی حیثیت رکھتی ہیں ـــــ ملکی حالات کے چلانے میں بیوروکریسی کا جو کردار ہونا چاہیے وہ تو ایک قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ اب تو بڑے سے بڑا بیوروکریٹ (از قسم صوبائی چیف سیکرٹری اور وفاق کی سطح پر پرنسپل سیکرٹری ٹو وزیر اعظم) کا حال وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کے سامنے بالترتیب ایک چپڑاسی یا کلرک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جس کا کام چیف صاحب کے احکامات کی آنکھیں بند کر کے تعمیل کرنا ہو بالکل اسی طرح

جس انداز میں ایک دفتری ان کے لیے پینے کے لئے پانی یا چائے کا کپ پیش کرتا ہے۔ جس کا مظاہرہ حالیہ دور میں ٹی وی کے ذریعے دکھایا گیا۔ **سیکرٹریٹ میں بسنے والی یہ قوم دل و دماغ کو استعمال نہیں کرتی (سوائے ذاتی مفادات کے)۔ ان کے دل میں ملت ملک وملت نامی کس چیز کی کوئی حیثیت نہیں اور دین سے وہ ملاں، پیر اور فقیر کی پیروی کرنے کی وجہ سے بیگانہ اور لاتعلق ہو گئے۔ نماز، روزہ کی حد تک کبھی کبھار ادائیگی ہو جاتی ہے لیکن وہ ایک سجدہ جو ہزار سجدوں سے نجات دینے والا تھا وہ اہل حرم کی تعلیمات کے نتیجے میں، اس کی لذت سے نا آشنا ہو گئے ہیں۔ ایسے میں کہاں سے آئے صدا الا الہ الا اللہ!◆**

اس ضمن میں ایک تیسرا فریق جو تعلیم و تعلم سے براہ راست تعلق رکھتا ہے، وہ استاد کا تھا جو ایک عرصہ سے ''مرحوم'' ہو چکا ہے کہ وہ اکبرالہ آبادی کے بقول صرف ماہانہ تنخواہ ''بطور پنشن'' وصول کرتا ہے اور طلبہ سے ماہانہ ٹیوشن کا بل لفافے کی صورت میں وصول کر لیتا ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ ہم کسی قدر اپنے موضوع سخن سے دور ہو گئے ہیں اور شاید کسی حد تک جذباتیت کا شکار بھی تاہم ملک وملت کے ان ''نامہربانوں'' نے جس انداز میں وطن عزیز کو جن گھمبیر مسائل سے دوچار کر کے مستقبل کو تاریک تر کر دیا ہے، ان کا ذکر، تشخیص مرض اور علاج کے لئے از حد ضروری تھا کہ اس کے بغیر شفائے کاملہ کی امید نہیں کی جا سکتی!____ یہاں ہم ایک بار دوبارہ اس امر کی صراحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سیاسی حکومتوں کے تحت

◆ ہمیں اپنے پروفیشن کی حد تک ایک مثال اچھی طرح یاد ہے کہ وطن عزیز میں بھیڑوں کی ترقی و اصلاح کے لئے ایک ''گورا صاحب'' امریکہ سے آئے تھے جن کا مبلغ علم یہ تھا کہ وہ ہزاروں بھیڑوں کے فارم کو چلانے کا تجربہ رکھتے تھے۔ جب کہ ۱۹۵۵ء کے اواخر میں ان کی تنخواہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں میں تھی اور ان کی مشہور شیور لیٹ کار لاہور سے جابہ فارم (ایبٹ آباد سے آگے ایک فارم) پر آیا کرتے تھے۔ یہ انکشاف ان ماہر صاحب نے ہم طلبہ کے استفسار پر کیا جب ہم نے ان سے **ان کی تعلیمی حیثیت پر سوال کیا تو پتہ چلا کہ وہ ''چٹا ان پڑھ'' تھا____ تاہم بجلی سے چلنے والی اون کاٹنے کی مشین سے اون کاٹنے کا عملاً تجربہ رکھتا تھا)۔**

بیوروکریسی کا نظام (**سیکرٹری سے لے کر ڈپٹی سیکرٹری، سیکشن آفیسر، کلریکل سٹاف**) **کسی بھی ملک کے تعلیمی نظام کی تشکیل و ترتیب میں کوئی خدمت سرانجام دے ہی نہیں سکتے۔ یہ کام تو برسہا برس کا تعلیمی تجربہ رکھنے والے ایسے استاد (پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک)** ہی سرانجام دے سکتے ہیں جو اس شعبہ کے شناور ہوتے ہیں۔

مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

وطن عزیز میں سینکڑوں ایسی تنظیمیں ہیں جو اساتذہ کے معمولی مسائل کے لیے ہڑتالیں اور احتجاج کرتے رہتے ہیں، خدا کرے کہ ان میں سے کسی ایک کو یہ توفیق نصیب ہو کہ وہ مستقبل کے اس نہایت ضروری امر کی جانب بھی توجہ کریں ___ ہمارے خیال میں تنظیم اساتذہ پاکستان ایک ایسی N.G.O. ہے جس کے ارکان پرائمری سے لے کر اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں کے یکساں طور پر ممبر ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اس کا بیڑہ اٹھائیں اور **اپنی ''معمول بہ سرگرمیوں'' کو چھوڑ کر کوشش کریں۔** مختلف درجات/ کلاسز کے طلبہ کے لئے موضوعات (ادب، سائنس، پروفیشنل و دیگر مضامین) کی کمیٹیاں بنائیں جو رات دن محنت کر کے تعلیمی ثنویت کی باقیات ناصالحہ کا تدارک کر سکیں اور ماضی (قریب و بعید) کے تجربات کو سامنے رکھ کر ایک تفصیلی ڈھانچہ کھڑا کریں۔ مزید اپنے اس کام کے ساتھ ساتھ درسی مضامین کی کتب کی تیاری کا کام بھی جاری رکھیں۔ ان تمام تر اقدامات کو سامنے رکھتے ہوئے بلکہ اس قسم کے ان تمام اداروں (NGO's) کے بھرپور تعاون واشتراک کے ذریعے یہ خدمت سر انجام دیں۔ وطن عزیز میں طاغوتی نظام کے ''زخم خوردہ اساتذہ اور ماہرین'' کی اس قدر تعداد ابھی موجود ہے جو اس کام میں تمام تر تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ آج ضرورت اس تمام کام کو ایک تدریج اور ترتیب کے ساتھ سرانجام دینے کے لیے ہمت سے کام لیا جائے!

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

درج بالا تمام تر گزارشات کو تقویت دینے والا ایک بہت اہم فیکٹر امت مسلمہ کا ماضی

میں وہ شاندار کردار بھی ہے کہ یہ ملت اس وقت بہت سرعت اور آسانی کے ساتھ اپنی دینی روایات کو برقرار رکھنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ مند ہو جاتی ہے جب وہ گھمبیر مسائل سے دوچار ہوتی ہے۔ ماضی بعید کی بات نہیں کرتے (کہ پڑھے لکھے اور اکثر متدین طبقے کے لوگ بھی ماضی کو قصۂ پارینہ سمجھنے لگے ہیں۔ اور تاریخی حوالے سے ان سے سبق لینے کے روادار نہیں)۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہو یا ۱۹۷۱ میں سانحۂ مشرقی پاکستان کا سقوط___ ہر دو واقعات قیادت (سیاسی/ بیوروکریسی/ ملٹری) کی نااہلی کا تو ایک بین ثبوت ضرور ہے لیکن عوامی طرز عمل نے کیا کچھ ثابت نہیں کیا؟ آخر وہ کس کے بیٹے/ بھائی/ شوہر تھے جنہوں نے چونڈہ کے محاذ پر بم باندھ کر ہندوستانی ٹینکوں کو رسوا اور پسپا کیا تھا؟___ سیاچن کی خون کو منجمد کرنے والی برفانی ہواؤں میں آخر کن لوگوں نے جام شہادت نوش کیا تھا یا تمام عمر کے لئے ''برف گزیدہ'' ہو گئے تھے؟___ سانحۂ مشرقی پاکستان کے برپا ہونے سے لے کر آج تک عوام الناس ہی ہیں جو اب بھی اپنے سینوں میں متحدہ پاکستان کا درد رکھتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں___ واضح رہے کہ فیض احمد فیض کی وہ غزل تو کم از کم عوام کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے جس کے چند بول یہ ہیں۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی کتنی مدارتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

اپنی درج بالا گزارشات کے اثبات میں یہ چند مثالیں ہی کافی ہیں کہ مسائل کے پیدا کرنے میں قیادت (ہمہ اقسام بشمول مذہبی قیادت) ہی آج تک کی تعلیمی، اخلاقی، دینی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور صوبائیت/ لسانی و مذہبی فرقہ واریت جیسے مسائل کی ذمہ دار ہے۔ رہے عوام الناس تو قرآن سے بڑھ کر سچی اور محکم گواہی کس کی ہو سکتی ہے کہ رسولؐ آخرین کے ہاتھوں بھی جو کایا کلپ انسانی معاشرے کی ہوئی اس میں بھی یدخلون فی دین اللہ افواجاً کی خوشخبری اس وقت دی گئی جب تیئس سالہ جاں گسل محنت (وہ بھی اللہ کے رسول

کی قیادت اور صحابہ کرامؓ کی بے لوث رفاقت) کے نتیجے میں حاصل ہوئی ___ موجودہ امت مسلمہ یا مستقبل میں اس شرف سے بہرہ یاب ہونے والی امت) بھی اس سنت خداوندی کے تحت ہی دین میں مکمل طور پر داخل ہوگی جب اخلاص عمل کے ساتھ امت کے کچھ لوگ (کہ اکثریت تو آنکھوں دیکھے محسوس اور مشہود اسلام پر ایمان لایا کرتی ہے) اپنا سب کچھ لٹا کر دین کی ترویج واشاعت کے کام میں لگ جائیں گے۔

ہم نے درج بالا صفحات میں جو گزارشات، تعلیمی پالیسیوں کی تشکیل میں بیوروکریسی کی نااہلی، تعلیمی امور سے عدم آگہی اور ملک وملت کا درد نہ رکھنے کی بناء پر کی ہیں، اس کا ایک نادر شاہکار ہمیں موجودہ حکومت کی یکساں نظامِ تعلیم کی کوششوں کی شکل میں ملا ہے۔ اگرچہ ہم عقلی دلائل کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ ۷۰ سالوں کے ''عظیم الشان ہمالیہ سے بہت زیادہ بڑے اور گھمبیر مسائل کا حل ۲ / ۳ سالوں میں ممکن نہیں تاہم موجودہ وزیر تعلیم (جو بظاہر بہت معقول، پڑھے لکھے اور ایک شریف خاندان کے فرد ہیں) کے ایماء (اور شاید لبرل خیالات کے تحت) کلیر وکریسی (بیوروکریسی جو سیکشن آفیسرز/کلرکوں کا ملغوبہ) کی مدد سے جس قسم کی تعلیمی اقدامات گزشتہ دو اڑھائی سالوں میں کئے ہیں، وہ ان کی ناتدبیری کا بین ثبوت ہیں کہ

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

انہوں نے بھی جلد بازی میں وزیراعظم پاکستان کو ''متاثر'' کرنے کے لئے متعدد ایسے اقدامات کیے جن کا پول وطن عزیز کے مختلف طبقات بالخصوص تعلیم وتعلم سے گہرا، دیرینہ اور عملی تجربہ رکھنے والے اہل علم نے کھولا۔ دوسری جانب وطن عزیز کے ان محب اور مخلص دینی راہ نماؤں کا تعلق ہے، وہ بھی ان کی ان تدبیروں سے نالاں نظر آتے ہیں اور تیسری جانب، جو امر ہمارے درج بالا موقف کی سب سے بڑی دلیل ہے، وہ یہ کہ اس ملک کی ایک نہایت قلیل تعداد یعنی لبرل طبقہ کی وہ ہلہ شیری اور تائید ہے جو ان تمام موجودہ تدابیر

کی نہایت شد و مد کے ساتھ تائید وحمایت کر رہے ہیں____ یہ وہی طبقہ ہے جسے قائداعظم کے بنائے ہوئے کمیشن کی سفارشات کو سبوتاژ کرنے کا فخر حاصل ہے اور نہ صرف یہ بلکہ گزشتہ ۷۰ سالوں میں امریکن/مغربی طاقتوں کی جانب سے جو تدابیر اور سفارشات پیش کی گئیں، اس طبقے نے اس کی دل وجان سے نہ صرف تائید کی بلکہ اس کے نفاذ میں بھی اگلی صفوں میں شامل رہے۔اب اگر اس لبرل طبقے کی بات ہی کو ہمارے وفاقی وزیر تعلیم نے پذیرائی بخشنی تھی تو اس پر شاید یہ کہنا مناسب ہے کہ

بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی بھلا!

اپنے اس موقف کی تائید میں گزشتہ دو سالوں کے نہایت ہی موقر جریدوں/ رسائل سے چند اقتباسات نقل کر رہے ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

عزمِ سفر کعبہ و رو در مشرق
اے راہرو پشت بمنزل ہشیار! ◆

◆ حالیہ وزیر اعظم پاکستان جناب عمران خان صاحب سے ہمیں امید ہے کہ وہ ان گزارشات پر ''ذاتی طور'' پر توجہ فرمائیں گے۔علامہ اقبالؒ کے ایک شعر میں تبدیلی کی جسارت پر معذرت کے ساتھ

مقامِ شوق تیری ''بیوروکریسی'' کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد!

باب ہشتم

پاکستان میں نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل نو

سورہ توبہ (122:9) کی تشریح میں سید مودودیؒ نے وضاحت کی کہ ''ان آیات کا اصل مقصد واضح طور پر یہ متعین کیا گیا ہے کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار اور خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ رویۂ زندگی سے بچنے لگیں۔ یہ مسلمانوں کی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے اور ہر تعلیمی نظام کو اسی لحاظ سے جانچا جائے گا کہ وہ اس مقصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اسلام لوگوں میں ایسی تعلیم پھیلانا چاہتا ہے جو اس مقصد کو پورا کرتی ہو۔ ورنہ ایک ایک شخص اگر اپنے وقت کا آئن سٹائن اور فرائڈ ہو جائے لیکن دین کے فہم سے عاری اور غیر مسلمانہ رویۂ زندگی میں بھٹکا ہوا ہو تو اسلام ایسی تعلیم پہ لعنت بھیجتا ہے''

گزشتہ صفحات میں نظام تعلیم کی ثنویت کے حوالے سے جن تاریخی حوالوں سے گزارشات پیش کی گئی ہیں، کیا ان سے آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں؟ سر سید علی گڑھ یونیورسٹی کے بارے میں خود سر سید احمد خان کا یہ تبصرہ زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہا ہے کہ ''یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ جن کو تعلیم دی جا رہی ہے اور جن پر قومی بہبود کے لیے اعتماد کیا جا سکتا ہے، وہی قوم میں شیطان کی طرح بدترین ہو گئے ہیں'' (شیخ محمد اکرم 1958)۔ اسی طرح دیوبند کی دینی علوم تک محدودیت اور علی گڑھ کے علوم جدیدہ کی ناکامی کے نتیجے میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا لیکن دونوں ادارے ہی یکساں نظام تعلیم کے قابل تقلید نمونے پیش کرنے سے قاصر رہے۔ ہر دو اداروں کی ناکامی کے بعد چند دوسرے ادارے (جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) مختلف مدرسۃ الاصلاح کی کوششیں بھی مثبت نتائج نہ دکھا

سکے۔''(خالد سیف اللہ ۲۰۱۲)

تقسیم ہند سے قبل 1940 میں قائداعظم کی قائم کردہ ایک کمیٹی کا ذکر کیا گیا چکا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے چند ماہ بعد ہی قائداعظم کی بصیرت نے وطن عزیز کے لئے رائٹ ٹائپ آف ایجوکیشن کے لئے کمیشن بنایا۔جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جاچکا ہے۔تاہم قیام پاکستان کے بعد آج تک متعدد کانفرنسیں اور کمیشن مختلف حکومتوں کے ادوار میں منعقد ہوتی رہیں جن پر تفصیلی تبصرہ خالد سیف نے اپنے مقالے 2012ء میں کیا ہے۔اس تمام تر تفصیل کا حاصل سوائے اس کے اور کچھ نہیں نکلا کہ اسلامی نظام کے ساتھ وابستگی کے اظہار میں ایک سے ایک کمیشن نے سبقت لے جانے کی کوشش کی لیکن

آہ وہ تیر نیم کش، جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

ضروری ہے کہ ہم پاکستان میں تعلیم کی نظریاتی بنیادوں پر تشکیل نو کے حوالے سے چند ضروری معروضات پیش کریں۔ ذیل میں قیام پاکستان کے بعد کی جانے والی ان کوششوں کا ایک جائزہ پیش کریں گے جو مختلف اہل علم نے گزشتہ چند دہائیوں میں نظامِ تعلیم کے ڈھانچے کو ملی اور قومی دھارے میں ڈالنے کے لیے وقتاً فوقتاً پیش کیے ہیں۔ یہاں اس امر کی صراحت بھی شاید ضروری ہو کر قائداعظمؒ کی راہ نمائی کے تسلسل کو جاری رکھنے کے لئے پاکستان کے اہل علم حضرات نے جس قدر کام کیا ہے، اس کا جائزہ حوالہ جات میں درج کتب/لٹریچر کی وسعت سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے، کہ یہ موضوع کسی قوم کے جسد خاکی میں روح کی حیثیت کا حامل ہے!

درج ذیل سطور میں ہم ایک ایسے مقالے کی تلخیص پیش کر رہے ہیں جو **مجلہ تعلیم و تحقیق** اسلام آباد میں شائع ہوا تھا۔(خالد سیف اللہ ۲۰۱۲)۔صاحب مقالہ نے واضح کیا کہ

☆ ...... قیام پاکستان کے بعد عملاً لارڈ میکالے کا وضع کردہ نظام تعلیم ہی رائج رہا جب کہ دینی مدارس میں دین کے محدود تصور (عبادات/فرائض وغیرہ) کی تعلیم دی جاتی تھی۔

☆ ...... بدقسمتی سے تعلیم کبھی بھی اربابِ اختیار اقتدار (ماسوا قائداعظم کے مختصر ابتدائی دور) کی ترجیحات میں شامل نہیں رہی۔

اب ہم ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ ان چند تعلیمی کمیشنوں کا جائزہ لیں گے جو قیام پاکستان سے لے کر اب تک قائم کیے گئے۔

پہلی تعلیمی کانفرنس 1947

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا کہ پاکستان کے قیام کے فوراً (چار ماہ بعد) جب کہ قائداعظم مہاجرین کی آبادی اور نوخیز مملکت کی بنیادوں کو استوار کرنے میں بری طرح سے مصروف تھے اور جب کہ ان کا سینہ بیماری کی وجہ سے چھلنی ہو چکا تھا ان کی نظر سے تعلیم کا موضوع اوجھل نہ ہوا اور یوں ۲۷ نومبر تا یکم دسمبر 1947 میں پہلی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ قائداعظم نے اپنے پیغام میں واضح کیا کہ

> ''ایک صدی سے زائد عرصے تک ہم غیر ملکی تسلط کے تحت رہے۔ اس دوران ہمارے عوام کی تعلیم پر مناسب توجہ نہ دی جا سکی۔ اگر ہم حقیقی، تیز رفتار اور ٹھوس ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں تعلیم کے مسئلے پر فوری توجہ دینا ہوگی اور تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو عوامی امنگوں، اسلامی تاریخ وتہذیب سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ، عالمی سطح پر ہونے والی جدید تبدیلیوں اور تقاضوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا ___ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری مملکت کا دارومدار تعلیم کی ماہیت اور نوعیت پر ہے جو ہم اپنے بچوں کو دیں تا کہ وہ صحیح معنوں میں مستقبل کے پاکستانی شہری بن جائیں ___ نیز مختلف شعبۂ ہائے علوم میں قابلیت اور فضیلت حاصل کر کے اپنے وطن کے وقار کو بلند کر سکیں''
>
> (حکومت پاکستان ۱۹۴۷)

اس کانفرنس کے اختتام پر پاکستان کے نظام تعلیم پر اسلامی ونظریاتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے والی 24 قراردادوں میں سے دو نظام تعلیم کو اسلامی نظریۂ حیات سے مربوط کرنے پر زور دیتی ہیں جو یہ ہیں

☆ ......''فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کا نظام تعلیم اسلامی نظریۂ حیات سے ہم آہنگ ہوگا جو اخوت، مساوات، رواداری اور عدل جیسی خصوصیات کا آئینہ دار ہوگا''

☆ ......فیصلہ کیا گیا کہ مدارس میں مسلمان طلبا کے لئے دینی تعلیم لازمی ہوگی۔اسی طرح کالج کے مسلمان طلبہ کے لئے بھی دینی تعلیم کے پیریڈ میں حاضری لازمی ہوگی۔نیز دوسرے مذاہب کے طلبہ کو مذہبی تعلیم کے لئے ایسی ہی مراعات حاصل ہوں گی''

☆ ......قائداعظم کی حیات میں قیام پاکستان کے چند ماہ بعد جس تعلیمی کمیشن کی تشکیل کی گئی تھی اگر ان سفارشات پر عمل کیا جاتا اور وقتاً فوقتاً انہیں حالات کے تحت update کیا جاتا تو آج ہم اس زبوں حالی کا شکار نہ ہوتے جس کا تفصیلاً ذکر ہم نے اس کتاب کے حصہ اول اور گزشتہ صفحات میں کیا ہے اور یوں ملک وملت ان مختلف النوع تعلیمی نظاموں سے دوچار نہ ہوتی جس کے نتیجے میں تعلیمی نظام کی موجودہ شکل وہ بن گئی جس کا ذکر گوشوارہ نمبر I میں صلاح الدین (مرحوم) کے مقالے کے حوالے میں کیا گیا کہ تعلیمی نظام چھ بڑے گروپوں میں تقسیم ہو کر تین درجن سے زائد ذیلی نظاموں میں تبدیل ہو گیا ہے۔

پہلی تعلیمی کانفرنس (1947) کے بعد درج ذیل متعدد تعلیمی کانفرنسیں/تعلیمی پالیسی کمیشن قائم ہوئے

1- قومی تعلیمی کمیشن 1959ء
2- تعلیمی پالیسی 1969ء
3- تعلیمی پالیسی 80-1972ء
4- قومی تعلیمی پالیسی 1978ء
5- قومی تعلیمی پالیسی 2002-1992ء
6- مدرسہ آرڈیننس 2001ء

درج بالا تمام کمیشنوں/ پالیسیوں میں ایوب خان کے دور میں قائم ہونے والا قومی تعلیمی کمیشن (1959) اس لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے کہ اس کی تشکیل میں اہل علم و ہنر کی ایک بہت بڑی تعداد شامل تھی جنہوں نے اپنے طور پر وطن عزیز میں مختلف شعبۂ ہائے علوم وفنون، زرعی، علم حیوانات، میڈیکل، قانون، انجینئرنگ وغیرہ کے حوالے سے

بہت اہم سفارشات کیں۔ اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ماہرین تعلیم نے ملک کی ضروریات کومحسوس کرتے ہوئے پہلی مرتبہ مکمل تعلیمی لائحہ عمل تجویز کیا۔ نیز کمیشن نے اسلامی اقدار اور تہذیب وثقافت کی ضرورت کومحسوس کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کی لازمی تدریس پر زور دیا۔ نیز اعلیٰ تعلیم بشمول دینی علوم کے فروغ کے لئے وظائف اور دیگر اچھے اقدامات تجویز کیے۔ ظاہری طور پر پہلی تعلیمی کانفرنس کے بعد قومی تعلیمی کمیشن 1959ء کا قیام نظام تعلیم کو از سر نو مرتب کرنے کی طرف اہم پیش رفت تھی۔___ پہلی تعلیمی کانفرنس کی سفارشات اور اس تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر نظام تعلیم کو مکمل طور پر اسلامی نہ سہی بہت حد تک نظریاتی دینی تقاضوں کے مطابق بنایا جاسکتا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیمی لائحہ عمل اسلام اخلاقیات، اقدار، تہذیب وتمدن اور ریاستی تقاضوں اور عوامی امنگوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے طے کیا گیا تھا۔

1972ـ80ء کی تعلیمی پالیسی جو ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں وضع کی گئی اس میں بھی دعویٰ کیا گیا کہ ''ہمیں تعلیم کو امتیازی درجے سے نکال کر مساوی درجے پر لانا ہے اور ہر فرد کو بلاامتیاز وتفریق حصولِ علم کا حق دینا ہے۔

سابقہ تعلیمی پالیسی کے برعکس اس میں دینی ومذہبی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس میں اسلامیات کے نصاب اور اس کی تدریس کو جزو بنانے اور نظام تعلیم سے الگ تھلگ رکھنے کی بجائے پورے تعلیمی ڈھانچے میں سمونے کی تجویز دی گئی۔ دینی تعلیم اداروں کو آزادانہ فضا میں کام کرنے کا حق دیا گیا۔ مدارس میں معاصر علوم کی تدریس کے ساتھ ضروری تبدیلیوں کی سفارش کی گئی تاہم اس تعلیمی پالیسی کا یہ پہلو بہت ہی خوفناک نتائج کی شکل میں ظاہر ہوا کہ بعد کے دور یعنی پیپلز پارٹی/بھٹو کی حکومت نے اس شعبے کو نیشنلائز کرلیا جس کے نتیجے میں تعلیمی معیار بہت گر گیا جو آنے والے ادوار میں قیام پاکستان کے فوراً بعد والے معیار تک کبھی بھی نہ پہنچ سکا بلکہ ہر آنے والے دور میں معیار میں تنزل ہوتا چلا گیا۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ ایک درجن سے زائد تعلیمی نظاموں کی وجہ سے نہ صرف نوجوان نسل مختلف گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے بلکہ ملی اور قومی سطح پر بھی کسی قسم کی نظریاتی ہم آہنگی پیدا نہ

ہوسکی۔ضیاء الحق نے بھٹوحکومت کا تختہ الٹا تو اس دور کی تمام پالیسیاں بھی غیر اطمینان بخش قرار دی گئیں بالخصوص نظریاتی طور پر سوشلزم کی جانب جس تیزی سے اقدامات کیے جا رہے تھے،نصابِ تعلیم سے ایسے تمام موادکو خارج کر دیا گیا۔

وفاقی وزیر تعلیم نے نظریہ پاکستان کوتعلیم کے ساتھ مربوط کرنے کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

''پاکستان کی تخلیق برصغیر کے مسلمانوں کے لیےعمل میں آئی تا کہ وہ اپنی زندگیوں کوبغیر کسی مداخلت کے قرآن وسنت کے مطابق بسر کرسکیں۔اپنے تہذیبی ورثے کو روشن تر بنا سکیں اور اپنی نظریاتی آرزوؤں کی تکمیل کر سکیں____ میرادعویٰ ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس تعلیمی پالیسی کے وسیلے سے تعلیم کے قومی مقاصد کو اسلامی اصولوں،مسلمانوں کے تہذیبی ورثے اور ملک کی سماجی ومعاشی ضروریات سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔''

بلاشبہ الفاظ اور سفارشات کی حد تک ضیاء دور کی تعلیمی پالیسی بہت حد تک اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔حکومت نے جن چار تعلیمی مقاصد کو اوّلیت دی ان میں سے آخری براہ راست اسلامی نظریہ حیات اور فلسفہ تعلیم کی بنیاد پر تشکیل دیا گیا۔قرآن وسنت کے مطابق طلبہ کے کردار کی تعمیر وتشکیل اس طرح کرنا کہ وہ سچے مسلمان بن جائیں۔مجموعی طور پر تعلیمی پالیسی کی فضا کوقومی اور نظریاتی تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا گیا۔گزشتہ ادوار کی طرح اسلامیات کی لازمی تدریس،تمام درجوں کے نصاب کو اسلامی نظریہ حیات اورنظریہ پاکستان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش،مسجد کومسلم معاشرے کا اہم مقام دلانے، طالبات کی تعلیم،دینی مدارس کے طلبہ کووظائف دیے جانے کی تجاویز پیش کی گئیں۔

قومی تعلیمی پالیسی1992-2002ء

اس تعلیمی پالیسی میں نظام تعلیم کو اسلامی تعلیمات کے تقاضوں اور ضابطوں کے مطابق ڈھالنے کی سفارش کی گئی تا کہ پاکستانی معاشرے کو اسلامی معاشرہ بنایا جا سکے۔ گزشتہ ادوار کی پالیسیوں کی طرح اس میں بھی عمرانی علوم کو اسلامی نظریہ حیات کو مدنظر رکھتے

ہوئے پڑھانے اور تعلیم کے ذریعے اسلامی تہذیب وثقافت کی اشاعت وترویج کی سفارش کی گئی۔تمام درجات میں اسلامیات کو بطور لازمی مضمون نصاب کا حصہ بنانے اور پہلی بار پاکستان ٹیلی ویژن کے ذریعے اسلامی اقدار کے متعلق معلومات نشر کیے جانے کی تجویز دی گئی ہے۔

مدرسہ آرڈیننس 2001ء

یوں تو ہر تعلیمی پالیسی میں اسلامی نظریہ حیات، تہذیب وثقافت، ریاستی تقاضوں اور قومی امنگوں کو زیر بحث لاتے ہوئے تعلیم کی اسلامی تشکیل کی سفارشات پیش کی گئیں۔ دینی مدارس بھی کم وبیش تمام پالیسیوں کا موضوع رہے، مگر جنرل پرویز مشرف کے دور میں دینی مدارس اور مذہبی تعلیم کے حوالے سے خصوصی آرڈیننس جاری کیا گیا۔اس میں ماڈل دینی مدارس کا تصور پیش کرنے کے ساتھ ساتھ وزارتِ مذہبی امور اور وزارت تعلیم کے شعبہ نصاب سازی نے ماڈل دینی مدارس کا مجوزہ نصاب بھی تیار کیا۔ماڈل دینی مدارس کے مجوزہ نصاب میں سرکاری تعلیمی اداروں کا نصاب تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ دینی مدارس کے روایتی نصاب میں شامل کرکے دینی وعصری علوم کے غیر فطری امتزاج کا ایک اور تجربہ کیا گیا پروفیسر منصور خالد اس نصاب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''حکومت کے اعلان کردہ ماڈل دینی مدارس کے نصاب (2001ء) میں درس نظامی کے ساتھ اسکولوں اور کالجوں کے مضامین انگریزی، جنرل سائنس، ریاضی، معاشیات، سیاسیات وغیرہ، شروع کرنے کا عمل کیا گیا ہے اور حکومت نے اس سلسلے میں مراعات دینے کا اعلان بھی کیا۔اس سے دکھائی دیتا ہے کہ گزشتہ پچپن سالہ تجربات سے کوئی سبق نہیں سیکھا گیا جس طرح نام نہاد جدید اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کا مضمون لازمی کرنے سے ہم ان اداروں کو اسلامائز (Islamize) نہیں کرسکے۔اسی طرح ہم اسکولوں اور کالجوں کے مضامین، دینی تعلیمی کے اداروں میں نافذ کرکے انہیں جدید کاری (Modernization) سے ہم کنار نہیں کرسکیں گے۔'' (سلیم منصور خالد ۲۰۰۵)

دینی مدارس کے پانچوں متفقہ بورڈز ابتداء سے ہی مدرسہ آرڈیننس سے متفق نہیں تھے۔ علماء کے خیال میں دینی مدارس کے نظام و نصاب میں کوئی تبدیلی ان کی مرضی اور مشاورت کے بغیر نہیں ہونی چاہیے۔ اس وقت کے ملکی حالات جس میں حکومت کا امریکہ کی طرف جھکاؤ اور خود امریکہ کا مدارس کے بارے میں بے بنیاد الزامات کے پروپیگنڈہ نے اہل دینی مدارس کا حکومت سے نہ صرف اعتبار اٹھادیا بلکہ علماء اور دینی مدارس کے طلبا اور اساتذہ نے اس کی بھرپور مخالفت کی۔ یوں یہ منصوبہ مجموعی طور پر ختم ہو گیا۔ پاکستان میں حکومتی سطح پر اس سے ملتی جلتی جزوی کوششیں تقریباً تمام ادوار میں ہوئیں۔ نظام تعلیم کو اسلامی نظریۂ حیات اور پاکستان کی نظریاتی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا نعرہ لگایا گیا، پروفیسر متین الرحمان پاکستان میں تعلیم کی اسلامائزیشن کو ایک خاص تناظر میں دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''پہلی تعلیمی کانفرنس سے تاحال سرکاری سطح پر نظام تعلیم کو بدلنے کے لیے کانفرنسوں، کمیٹیوں، بورڈوں، منصوبوں اور پالیسیوں کے ذریعے جو کچھ بھی ہوا ہے، اس میں حقیقتاً ہمارے نظام تعلیم کی کوئی نظریاتی حیثیت متعین نہیں ہو سکی۔ دین اور لادینی کی تقسیم ہنوز قائم ہے۔ ڈگری کی سطح تک دینیات یا نظریہ پاکستان کی تدریس ایک الگ مضمون کے طور پر ضرور ہونے لگی ہے لیکن پورے نصابی لٹریچر کا مجموعی مزاج آج بھی لادینی ہی ہے۔ اس داخلی تضاد سے قطع نظر مکاتب و مدارس اور عام تعلیمی اداروں کی تقسیم اب بھی قائم ہے۔'' (متین الرحمٰن مرتضٰی ۱۹۹۵)

ہم جب اس مسئلے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سوائے اس ان دو کوششوں کے جو قائداعظم کے ایماء پر قیامِ پاکستان سے قبل اور فوراً بعد کی گئی تھیں (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی تمام کمیٹیوں/کمیشن کی تشکیل میں ایک بنیادی نقص رہا ہے۔ حکومتی ڈھانچے میں اس قسم کے کاموں کے لئے بالعموم کلریکل ذہنیت کے حامل سیکشن آفیسر، ڈپٹی سیکرٹری اور ان سب پر مستزاد ''صاحب بہادر'' (سیکرٹری محکمہ یا وزیر

با تدبیر) اس نہایت دور رس پالیسی کے خدو خال اور تفصیلات طے کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔اس اتحادِ ثلاثہ (Trinity) کے بارے میں گزشتہ صفحات میں ہم نے حقائق بیان کیے ہیں،ان کی موجودگی میں ان اصحاب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مستقبل کی ضروریات (وہ بھی آئندہ سوسالوں) کا ادراک کر سکیں گے،ایک احمقانہ خیال سے زیادہ نہیں۔ بیوروکریسی کا ایک گلاسٹرا/ ڈھانچہ ''فاروقی وسلمانی'' جیسے کردار پیدا کرنے کے بنیادی تصور سے ہی آشنا نہیں کجا کہ یہ ایسے دوررس اقدامات تجویز کر سکے اور حالی، اکبرالٰہ آبادی، اقبال، قائداعظم اور سیّد مودودی کے افکار وخیالات کے مطابق امت مسلمہ کی نوجوان نسل کے لئے کوئی لائحہ عمل تجویز کر سکے۔ (اس موضوع پر مزید بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے) تاہم دوسری جانب جب ہم دیکھتے ہیں تو اہل مدرسہ کے رویے کو بھی بہت زیادہ خوشگوار نہیں کہا جا سکتا ــــــ دینی مدارس نے بھی اپنی اپنی فقہ (دراصل انا) کے نام پر امت مسلمہ کو پانچ مختلف بورڈوں کی شکل میں استوار کرنے میں جس ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے نوجوان نسل یہ تاثر لینے میں بہت حد تک حق بجانب ہے کہ قرآن و حدیث اور سیرت کے مقابلے میں ان سب کو اپنی اپنی فقہ عزیز تر ہی نہیں عزیز ترین ہے۔ اس پر علامہ اقبال یوں گویا ہوئے

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ!

یاد رہے کہ جنرل پرویز مشرف کے دور میں پروفیسر ڈاکٹر محمود غازی مشیر مذہبی امور کے طور پر کام کر رہے تھے اور مدرسہ آرڈیننس 2001ء اور اس سے متعلقہ مسائل کے حل کے لئے طبقۂ علماء سے بات چیت کرنے میں اپنی ذاتی حیثیت سے بھی کوشاں رہتے تھے لیکن 2009ء میں انہوں نے ''پاکستان میں دینی تعلیم، پس منظر و پیش منظر'' کے تحت انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد میں ایک لیکچر میں یوں فرمایا: **''مدارسِ (دینی) کی خدمات کے حوالے سے مکمل اتفاق کے باوجود میں بڑے دکھ کے ساتھ کہتا ہوں کہ ان میں بہت سے ادارے فرقہ واریت کے حوالے سے عدم توازن کا**

شکار ہو رہے ہیں۔ جب طالب علم یہاں سے نکلتا ہے تو وہ اسلام کا سپاہی بن کر نہیں نکلتا بلکہ اپنے مسلک کے مفاد سے زیادہ وابستہ ہوتا ہے۔" ___ "اس وقت بہت سی مسجدیں اور مدرسے فرقوں کی مسجدیں اور فرقوں کے مدرسے ہیں۔ اللہ کی مسجدیں اور اللہ کے مدرسے، دین کی مسجدیں اور دین کے مدرسے بہت تھوڑے ہیں۔ یہ بات ممکن ہے سخت ہو لیکن امر واقعی یہی ہے"

روایتی دینی قیادت، جس کو علامہ اقبالؒ نے یوں خطاب کیا تھا کہ

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم، نقش دگر انگیزی

اور ایک دوسری جگہ انہیں یوں توجہ دلائی تھی

افرنگ ز خود بے خبرت کرد و گرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری، تو نذیری!

لیکن یہ تمام بزرگانِ دین اُن آیات کو بھول گئے جو اسے امت محمدیہ ﷺ کے منصب جلیل پر فائز کرتے وقت بندۂ بشیر و نذیر کے طور پر اس کا مقصد زندگی تجویز کیا گیا تھا ___ اسی ضمن میں ہم مرحوم ڈاکٹر محمود غازی کے ایک اور لیکچر کا حوالہ دینا چاہتے ہیں جو موصوف نے ۲۰۰۶ میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد کے لیکچر "دینی مدارس میں تعلیم، کیفیت، مسائل، امکانات" کے موضوع پر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے دیرینہ موقف یعنی تعلیم کی دوئی، سیکولرازم کے فروغ میں مدد و معاون ثابت ہو رہی ہے، کو دہراتے ہوئے کہا کہ "ملک کی دینی قیادت میں بعض انتہائی قابل احترام بزرگ ابھی تک ایک مختلف تصور پر سختی سے قائم ہیں۔ مجھے ان میں سے بعض کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے جنہوں نے ہر ایسے موضوع پر کسی قسم کی گفتگو میں حصہ لینے سے یا گفتگو میں شریک ہونے سے صاف صاف انکار فرمایا جس کا مقصد یہ ہو کہ دینی مدارس کی پیداوار یا دینی مدارس کے طلبہ کا معاشرے میں مسجد کی خدمت کے علاوہ بھی کوئی اور رول یا کردار ہو سکتا ہے۔ ایک بزرگ نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ

''ہم تو مسجد کے ٹکڑوں پر پلنے والے کٹھ ملا ہی تیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں۔ دینی مدارس اس وقت تک ہی قائم رہ سکتے ہیں جب تک ان کو صرف مسیتے پیدا کرنے ہوں'' ❶

غازی مرحوم نے مزید وضاحت فرمائی کہ ''یہ الفاظ انہوں نے خود اپنی زبانِ مبارک سے ادا فرمائے۔'' درج بالا صورت حال، اگرچہ کس حد تک مایوس کن ضرور ہے تاہم یہ امر باعث اطمینان بھی ہے کہ دینی طاقتیں بالکل ہی اس عظیم الشان کام سے بے بہرہ نہیں۔ نجی سطح پر مختلف ادارے اپنے طور پر کوشاں ہیں۔ خالد سیف اللہ (۲۰۱۲) نے ان کوششوں کا بھی ایک جائزہ اپنے مقالے میں پیش کیا ہے۔ جو بہت حوصلہ افزا ہے۔

درج بالا دو گروپوں کے علی الرغم گزشتہ ۷۰ سالوں میں مختلف رفاہی اور دینی تنظیموں (NGO) نے بھی اپنے طور پر یکساں نظام تعلیم کے تجربات کیے جن میں دارالعلوم کراچی، مدرسۂ بنوری۔ جماعت اسلامی کے تحت رابطۃ المدارس اسلامیہ پاکستان، جامع العلوم ملتان، ❷ آفاق، غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، ریڈ فاؤنڈیشن دار ارقم، عثمان پبلک سکول سسٹم

❶ علامہ اقبال کی نگاہ مردم شناس اور دور اندیشی کی داد دیجئے کہ بانگ درا میں انہوں نے اس طرز عمل کی کیا خوب پیشین گوئی کی

منددر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے ''بدری''
مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے ''مسیتا''!

❷ اس سکول/کالج میں جماعت ششم سے لے کر بی اے تک (ادیب عربی، عالم عربی اور فاضل عربی) کر کے قرآن و حدیث سمجھ لے اور جدید علوم سے کسی بھی مضمون کا امتحان (ایم اے انگریزی/ وغیرہ) کا امتحان دے کر CSS کا امتحان دے سکے۔ اس مدرسے سے فارغ ہونے والے ایک ہونہار طالبعلم نے CSS امتحان میں کامیاب ہو کر جوائنٹ سیکرٹری وفاقی حکومت اسلام آباد سے ریٹائر ہوئے! مزید برآں اسی کالج کے ایک طالب علم ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی بنے___ تاہم افسوس ناک صورت یہ بنی کہ بھٹو نے اپنی حکومت میں اسے ''قومیا'' لیا اور میٹرک تک تعلیم کا مربوط نظام گورنمنٹ نے لے کر صرف دینی تعلیم کا مختصر سا حصہ اس کالج کے لئے چھوڑ دیا اور ایک بہت عظیم نقصان یہ ہوا کہ یہ حادثہ ایک نہایت ہی قابل اور دین دار، اعلیٰ ترین تعلیم افتہ شخصیت (چوہدری نذیر احد) کی دفاع کی شریان پھٹ جانے سے ان کی وفات پر رنج ہوا۔

کراچی، سیّد مودودی انسٹی ٹیوٹ لاہور، منہاج یونیورسٹی اور انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز کے نام قابل ذکر ہیں۔

درجِ بالا سطور میں جن مدارس اور فلاحی تنظیموں (NGOs) کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اپنے اپنے محدود ذرائع سے علمی وفکری کام سرانجام دے رہے ہیں۔لیکن چونکہ یہ تمام کام انفرادی سطح پر ہورہا ہے، ان میں باہمی اشتراکِ عمل نہیں اس لیے ملکی یا ریاستی سطح پر ان کا اثر رسوخ (Impact) محسوس نہیں ہو پا رہا۔ **تعلیمی نظام کے مختلف طریقوں کی وجہ سے اب پوری قوم مسلمان ہوتے ہوئے بھی عملی طور پر وہ سب کچھ کررہی ہے جو بے خدا تہذیب کے حواری بھی نہیں کرتے** ___ امت مسلمہ بحیثیت مجموعی آج یہود و نصاریٰ کی پیروی ہی نہیں بلکہ اپنے احوال کے لحاظ سے ان سے ہزار درجے بدتر صورت میں گرفتار ہے (ابو انس وام انس 2020)۔ تاہم یکساں نظام تعلیم کی ترویج کے لئے کی جانے والی کوششوں کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کا مسئلہ زندہ رہا۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اور

دلِ مردہ دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

واضح رہے کہ آزادی سے قبل اور بعد میں استعمار کی چالوں اور ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں آج اس ملک میں کوئی شخص بھی اسلامی نظام تعلیم کا نام لیوا نہ ہوتا اگر یہ مختلف النوع کوششیں اہل علم و دل کی جانب سے نہ کی جاتیں! ___ تاہم یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلم اہل علم کسی ایک بات پر متفق نہ ہو سکے اور اپنے فقہی اختلافات کی بناء پر ایک دوسرے سے اس قدر کشیدہ خاطر رہے کہ امت مسلمہ آج اغیار کے ہاتھوں مسائل کے ایک گھمبیر چکر میں پھنسی ہوئی ہے اور حالت یہ ہے کہ

لیکن نگاہ نکتہ بیں دیکھے زبوں بختی مری

''رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہ ہم دور شد

(لیکن جب میں نے اپنے پاؤں سے کانٹا نکالنے کے بعد سفر شروع کیا تو اس وقت تک قافلہ نظروں سے دور ہو چکا تھا___ میری ایک لحظہ کی غفلت نے مجھے سو سال پیچھے دھکیل کر رکھ دیا)۔

دیکھئے مرقد اقبال سے کیا صدا آ رہی ہے

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ منزل بہ یک آہے گاہے
در طلب کوش مدہ دامن امید ز دست
دولتِ ہست کہ یابی سر راہے گاہے!

(اگرچہ وادیٔ عشق بہت دور دراز واقع ہے تاہم ایک صدی کا سفر ایک آہِ دل سوز کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ منزل مقصود کی طلب میں امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں کہ یہ ایک ایسی دولت ہے کہ کبھی کبھی اچانک راہ چلتے بھی مل جاتی ہے!)

آئندہ صفحات میں ہم ان کوششوں کا ایک مسبوط جائزہ لیں گے جو یکساں نظامِ تعلیم کے ضمن میں گزشتہ چند سالوں میں وطن عزیز میں کی گئی ہیں تاہم یکساں نظامِ تعلیم کی وجوہات اور آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں بھی چند مزید حقائق ہم خالد سیف اللہ سے مستعار لیں گے۔

یکساں نظامِ تعلیم کی ناکامی کی وجوہات اور آئندہ کا لائحہ عمل

خالد سیف اللہ (۲۰۱۲) نے اس موضوع پر بہت فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ

''یکساں نظامِ تعلیم کے تجربات مجموعی طور پر ناکام کیوں ہوئے اور وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا؟ یہ انتہائی اہم سوال

ہے، اس کی ایک بہت بڑی وجہ یکساں نظام تعلیم جیسے انتہائی اہم مسئلے پر علمائے کرام کا متفق نہ ہونا ہے، اور یہ اختلاف تا ہنوز قائم ہے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد، دارالعلوم دیوبند برطانوی استعمار کے خلاف بننے والا مسلمانوں کا پہلا مرکز تھا۔ اس میں اگرچہ عصری علوم کو شامل نصاب کیا گیا مگر ان پر توجہ نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ استفادے سے محروم رہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور اس تحریک کا پورا تصور دیوبند سے یکسر مختلف تھا اس لیے بذات خود یہ دو ادارے متصادم سوچ کے حامل تھے۔ پھر ندوۃ العلماء کے قیام اور اس میں تیار کیے جانے والے یکساں نصاب تعلیم پر بھی علمائے کرام نے اعتراض کیا اور اسے مدارس میں پڑھانے کے لیے غیر موزوں قرار دے دیا۔ لہٰذا خود مسلم مفکرین تعلیم اور علمائے کرام کا یہ اختلاف ناکامی کا سبب بنا۔''

''☆...... کوئی بھی نظام تعلیم (۱) فلسفہ تعلیم، (۲) نصاب، (۳) استاد اور (۴) تعلیمی اداروں کے ماحول کو نظر انداز کر کے کامیاب نہیں ہوسکتا ____ یکساں نظام تعلیم کی ناکامی کی وجوہات میں یہ سبب بھی سرفہرست نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے کیے جانے والے تجربات میں مذکورہ بالا چار عناصر کو اجتماعی حیثیت سے روبہ عمل نہیں لایا گیا۔ کہیں فلسفہ تعلیم ہی جامعیت کی نفی کرتا نظر آتا ہے اور کہیں نصاب تعلیم دینی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے اور کہیں تعلیمی ادارے کا ماحول اور اساتذہ اسلامی نظریہ حیات اور فلسفہ تعلیم سے متصادم نظر آتے ہیں۔ ماہرین تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ناکامی کے بنیادی اسباب میں ایک سبب مغربی فکر کے حامل اساتذہ اور افرنگی تہذیب وثقافت پر مبنی ماحول کو قرار دیتے ہیں۔

☆......حکومتی اور بھرپور عوامی سرپرستی سے محرومیت بھی یکساں نظام تعلیم کی ناکامی کا باعث ہے۔ نظام تعلیم کی تشکیل اور پھر اس کی تمام مادی و انسانی ضروریات کا پورا کرنا چند افراد کے بس کا کام نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ابتداء سے تا حال یکساں نظام تعلیم کی کوششیں حکومتی سرپرستی سے محروم رہی ہیں، استعماری قوتیں کبھی بھی نہیں چاہتیں کہ امت مسلمہ دینی و

دنیاوی میدان میں ترقی کر سکے، مسلمانوں کو غیر ترقی یافتہ رکھنے کے لیے ہر دور میں سازشیں کی گئیں۔ مسلم دنیا کے حکمران بھی اغیار کے کاسہ لیس ثابت ہوئے اور وہ بھی انہیں کی زبان بولنے کو ترجیح دیتے رہے۔ عام معاشرے کے سامنے چوں کہ یکساں نظام تعلیم کے افادی پہلو کبھی وضاحت کے ساتھ پیش ہی نہیں کیے گئے اس لیے اکثر اس نظام کے فوائد سے بے خبر مروجہ نظام تعلیم کو ہی نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں۔"

لائحہ عمل:

صاحب مقالہ نے مزید واضح کیا کہ

"☆...... یکساں نظام تعلیم کی تشکیل اور اس کے نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مرحلے پر تمام علمائے کرام اس بات پر متفق ہوں اور اس نظام کے بنیادی خدوخال کا تعین کیا جائے، ان خطوط کی نشاندہی کی جائے جن کی بنیاد پر ایک انسان دین اور دنیا میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ مدارس کے نصاب کا نہ صرف کھلے دل کے ساتھ جائزہ لیا جائے بلکہ اسے ضروری اور مفید تبدیلیوں کے ساتھ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے، اس سلسلے میں درد دل رکھنے والے ماہرین تعلیم سے تکنیکی اور فنی معاونت بھی خاصی مفید ہو سکتی ہے۔ اگر مدارس کے تمام بورڈز متفقہ طور پر نظر ثانی کے بعد مدارس کے لیے یکساں نصاب کا اجراء کریں تو یہ یکساں نظام تعلیم کی طرف بہت بڑی پیش رفت ہو گی۔ یہاں ہمیں اپنے اپنے مسالک اور فقہی اختلافات کو خیر باد کہنا ہو گا۔ تاہم اگر کسی وجہ سے تمام بورڈز اکٹھے نہ ہو سکیں تو کم از کم اہل سنت کے تین فرقے (بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث) تو اپنا ایک نظام وضع کریں تا کہ ملت اسلامیہ کی ایک بڑی تعداد/ ان کے تجربہ سے بہرہ مند ہو سکے۔

☆......عوام الناس میں یکساں نظام تعلیم کے حوالے سے شعور اجاگر کیا جائے، تعلیم کے روحانی، نظریاتی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔ متوازی نظام تعلیم کے نقصانات اور اس کے نتیجے میں محروم ہونے والے طبقات کو یکساں نظام تعلیم کے فوائد سے آگاہ کیا جائے۔ پرنٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے یہ کام بڑی

آسانی کے ساتھ سرانجام دیا جا سکتا ہے، ملک بھر میں دینی اداروں کے تحت سینکڑوں رسائل اور جرائد شائع ہوتے ہیں۔ یہ عمل معاشرے میں یکساں نظام تعلیم کی تفہیم اور قبولیت کے رجحان میں اہم کردار ادا کرے گا۔''

''☆...... اگلے مرحلے پر دینی اداروں کے تمام بورڈز کو ایک جامعہ کی حیثیت دلوانے کا کام کیا جائے تاکہ ان میں پڑھنے والے طلبہ معاشرے میں احساس محرومی کا شکار نہ ہوں اور ان کی اسناد کو بھی سرکاری یا نیم سرکاری تعلیمی اداروں سے جاری ہونے والی اسناد کے برابر اہمیت دی جائے۔''

''☆......حکومت سے یہ توقع عبث ہے کہ وہ یکساں نظام تعلیم کے لیے مثبت اقدامات کرے گی کیوں کہ تعلیم حکمرانوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہے۔قومی بجٹ کا ۴ فیصد تعلیم پر خرچ کیا جانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے جب کہ حقیقت میں ۲.۵ فیصد بھی خرچ نہیں ہوتا۔حکمرانی کے منصب پر فائز چند خاندانوں کا مفاد اسی میں ہے کہ ان کی قوم تعلیمی اعتبار سے پسماندگی کا شکار رہے۔اس لیے یکساں نظام تعلیم کے خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے علمائے کرام کو ایک بار پھر تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے متحد ہو کر میدان عمل میں آنا ہوگا اور اسلامی ذہن رکھنے والے تعلیمی ماہرین اور معاشرے کی مدد سے اس کام کا آغاز کرنا ہوگا۔تفصیل آگے آرہی ہے۔''

''☆...... ملت اسلامیہ کی تاریخ میں مسلم مفکرین تعلیم اور علمائے کرام نے فقید المثال کارنامے سرانجام دیے ہیں۔موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم گزشتہ تجربات سے سبق سیکھتے ہوئے ماضی اور حال کو سامنے رکھتے ہوئے آنے والے کل کی منصوبہ بندی کریں۔کیونکہ موجودہ صدی کو اسلام کی صدی سے تعبیر کیا جارہا ہے اور ہمیں تعلیم کے دینی وعصری میدان میں افراد کار تیار کرنا ہوں گے تاکہ امت کی زمام کار دینی اعتبار سے معتبر شخصیات کے ہاتھوں تھما سکیں۔''

باب نہم

وطن عزیز میں نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل: چند تصورات اور خاکے

گزشتہ ابواب میں وطن عزیز میں نظام تعلیم کا تاریخی تاہم تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی طرح ماضی میں کی گئی مختلف کوششوں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ یہ تمام امور اب اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان کوششوں اور مساعی کا بھی ایک بھرپور جائزہ لیا جائے جو نجی/ انفرادی نیز کسی حد تک مختلف اجتماعی اداروں کی جانب سے کی گئیں لیکن ماضی قریب کے نااہل، ان پڑھ تاہم مالی مفادات کے اسیر حکمران اس شعبہ کو وہ توجہ نہ دے سکے، ملک وملت کے لیے جس کا کردار حال بلکہ مستقبل کی بہتر اور قابل فخر صورت گری کے لئے ضروری تھا۔ بحیثیت مجموعی وفاق اور صوبائی سطح پر بجٹ میں بہت ہی کم رقوم مختص کی گئیں اور ان میں سے بھی کس قدر حصہ عوام الناس کے بچوں کے حصے میں آیا (یہ از خود ایک علیحدہ موضوع ہے جس پر وطن عزیز کے ایک قابل فخر سپوت نیز چند دیگر حضرات نے کوششیں کی ہیں)[1]

گزشتہ صفحات میں ہم نے مرحوم ڈاکٹر محمود غازی کی ایک تقریر (2000) کا ذکر کیا ہے۔ وطن عزیز میں عوام الناس کے بچوں کے لئے تعلیمی سہولیات کے فقدان اور ایک ''مخصوص طبقۂ علیا'' کے لئے تعلیمی سہولتوں کی فراوانی پر، انہوں نے اپنے جس دلی دکھ درد کا اظہار فرمایا وہ درج ذیل الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہوں نے فرمایا ''کہ آج (2000) میں قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں ہے وہ طبقہ ایک خاص انداز کا تربیت یافتہ ہے۔ لارڈ میکالے کے زمانے سے آج تک چار پانچ نسلیں اس طبقے کے زیر اثر ایک خاص

[1] مرزا محمد الیاس ۲۰۱۲، پاکستان کا تعلیمی منظر نامہ، ہفت روزہ ایشیا اشاعت خاص جلد ۶۱، شمارہ ۳، لاہور

ماحول میں پرورش پا چکی ہیں۔ اس کے اپنے ادارے ہیں جن کا مخصوص ماحول ہے، وہ طبقہ اپنے قرب و جوار میں سڑک بھی نہیں بننے دیتا لیکن اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے اس نے خصوصی ادارے بنا رکھے ہیں۔ ان کے آپس کے سیاسی اور دیگر طرح طرح کے دوسرے اختلافات تو موجود ہیں مگر اس کے باوجود جس تعلیمی ادارے میں ان کے بچے پڑھتے ہیں وہاں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ وہ سب مل جل کر انہیں مضبوط، موثر اور ترقی یافتہ بنانے کے لئے پوری دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ گویا یہ مفادات کی جنگ ہے۔ اس کے بعد جب یہاں تعلیم مکمل ہو جاتی ہے تو وہ اپنے بچوں کو انگلستان اور امریکہ کے تعلیمی اداروں میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں سے اعلیٰ تربیت پا کے وہ یہاں آتے ہیں اور ہم پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ پچھلے ڈیڑھ دوسو برس سے ہو رہا ہے ___ اب ایک صورت تو یہ ہے کہ جیسے یہ سلسلہ چل رہا ہے اس کو آپ چلنے دیں۔ وہ طبقہ ہم پر حکومت کرتا رہے اور اسلامی تعلیم اور اسلامی ماحول کا یہ جزیرہ سمٹتا جائے اور سمٹتے سمٹتے نامعلوم کہاں تک پہنچ جائے اور کتنا رہ جائے۔''

''دوسری شکل یہ ہے کہ اس طبقے کے اسلحے سے اس کا مقابلہ کریں اور جس اسلحے سے کام لے کر وہ طبقہ اسلام کا راستہ دانستہ یا نادانستہ طور پر روک رہا ہے (اکثر لوگ نادانستہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں) اس طبقے کے ہتھیار لے کر اسلام کا دفاع کریں''

درج بالا معروضات سے یہ واضح ہے کہ مستقبل کی صورت گری کے لئے اس کام کا بیڑہ بھی اسلامی ذہن اور درد رکھنے والوں کو خود ہی اٹھانا پڑے گا ___ اب ہم ان چند تصورات اور خاکوں کا ذکر کریں گے جو گزشتہ چند سالوں میں مختلف اہل علم کی جانب سے نظام تعلیم کی تشکیل جدید کے بارے میں زیر بحث آئے ہیں۔ اس موضوع پر جس قدر کام فرنگی تسلط سے لے کر آج تک صرف ہندو پاکستان میں سرانجام پایا ہے، اس کا ذکر کرنے کے لئے تو شاید عمر نوحؑ کی ضرورت ہوتا ہم اس کا مختصر سا اندازہ ان حوالہ جات/کتب کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جو کتاب کے آخر میں درج ہے۔ اگرچہ اس فہرست میں مزید بہت کچھ اضافہ کرنے کی ضرورت ہے اور اگر اس بارے میں ہم ان تمام مخارج اور فہرستوں کا احاطہ کرنا چاہیں جو عالم اسلام میں گزشتہ چودہ سو سالوں میں کی گئی ہیں تو شاید ایسی

فہرست نہ صرف یہ کہ بنانی ممکن ہو بلکہ مختلف زمانوں/ ادوار، زبانوں اور مما لک کے لحاظ سے ممکن ہی نہ ہو۔ یہاں ہم اپنی اس کوشش کو قیام پاکستان کے بعد کی گئی کوششوں تک محدود رکھیں گے۔ تاہم اگر ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہیں جو فرنگی دور میں حالی، اکبرالہ آبادی و دیگر اہل علم وفضل کی تحریروں اور خیالات پر مبنی ہیں تو ہمیں اس اعتراف کرنے میں عافیت محسوس ہوتی ہے کہ یہ امر ہماری بساط سے باہر ہے!

ڈاکٹر اکرام الحق یاسین (۲۰۱۲) نے **''مسلم معاشرے میں نظامِ تعلیم) (تصور اور خاکہ)** نامی مقالے میں چند بہت فکر انگیز ایسے امور کی جانب توجہ دلائی ہے جن کا تعلق اسلامی نظام تعلیم کی مبادیات، مقاصد اور طریق کار سے ہے۔ آیئے اب ہم ان کے خیالات سے آگاہ ہوتے ہیں!

نظام تعلیم میں یکسانیت:

''مسلم معاشرے کی یہ خوبی رہی ہے کہ اس نے اپنی سیاسی خودمختاری کے دور میں مسلسل بارہ سو سال تک یکساں نظامِ تعلیم کا عملی نمونہ پیش کیا۔ تاریخ کے اس طویل دور میں تعلیم کے شعبے تو بہت رہے مگر نظام تعلیم ایک ہی رہا۔ وہ ایک مربوط اور وحدتی (Integrated) نظام تھا۔ اگرچہ علوم کی بڑھتے بڑھتے تعداد بہت زیادہ ہوگئی تھی مگر ابتدائی تعلیم قرآن مجید اور عربی زبان پر مشتمل تھی۔ جس کا اثر ہر علم میں نمایاں نظر آتا تھا۔ دین و دنیا کی تفریق کیے بغیر انسان کی فلاح کا پورا پروگرام اس تعلیم کا موضوع تھا۔''

''مسلم معاشرے میں نظام تعلیم کا بنیادی تصور'' کے تحت انہوں نے لکھا ''مسلم معاشرے میں ایسے نظام تعلیم کی ضرورت ہے جو لوگوں کو اچھا مسلمان بھی بنائے اور معاشرے کی روزمرہ ضروریات کو پورا کرنے کے قابل بھی بنا دے'' ''اسلام کے عہد خودمختاری کا نظام تعلیم'' کے تحت لکھا کہ ''نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں ہی نظام تعلیم کی بنیاد قرآن مجید کو بنا دیا گیا تھا۔ یہی مرکزی نقطہ تھا اور باقی تمام علوم کی تعلیم اس کے گرد گھومتی تھی''

نبی کریمؐ نے جہاں قرآن کی تعلیمات کو اہتمام کے ساتھ حاصل کرنے کی ہدایت فرمائی وہاں قرآن کریم کو نصابی رنگ بھی دیا۔ اس نصابی تعلیم کے نمایاں خدوخال یوں بن سکتے ہیں۔

(۱)''اسباق کا نظام''

سورہ بنی اسرائیل (۱۷:۱۰۶) سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کو جزو جزو کر کے اتارا گیا تا کہ لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھایا جائے___ موجودہ نظام تعلیم میں بھی نصاب تعلیم کو اس طرح ڈھالا گیا ہے کہ آسانی سے مشکل مراحل کو مرحلہ وار اسباق میں تقسیم کر دیا جائے۔

(۲)''مقصد تعلیم''

اسی مقصد تعلیم کے ضمن میں لکھا کہ ''قرون اولیٰ میں تعلیم حاصل کرنے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی منشاء کو پہچاننا تھا، ملازمت حاصل کرنا نہ تھا کہ حصولِ علم کے بعد یہ امر آسان بن جاتا ہے۔''

(۳)اساتذہ:

''نظام تعلیم کا دوسرا بڑا رکن اساتذہ کی فراہمی ہے۔ حضورؐ نے چار صحابہؓ کو یہ خدمت سرانجام دینے کو فرمایا: (۱)عبداللہ بن مسعودؓ (۲)حذیفہؓ کے غلام سالمؓ (۳)معاذ بن جبلؓ اور (۴)ابی بن کعبؓ''

درج بالا چند اساتذہ کے مقابلے میں موجودہ زمانے کے ماہرین مضمون (Subject Specialists) کے بارے میں تو بہتر ہے کہ کچھ کہا ہی نہ جائے۔

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

(۴)طریق تدریس:

''اسی طرح ''طریق تدریس'' کے ضمن میں صاحب مقالہ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں بتایا کہ وہ حضورؐ کے محبوب مدرس تھے۔ ان کا طریق تدریس انفرادی اور شخصی توجہ والا تھا نہ کہ آج کل کا مروجہ طریقہ لیکچر۔

(۵) تعلیمی ادارے:

مسجد نبویؐ، آپؐ کے عہد میں، سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا ــــ اس میں بھی مقامِ صفہ بالخصوص بیرونی طلبا کے لیے مخصوص تھا ــــ یہ سلسلہ بعد میں صحابہؓ و تابعین کے دور تک چلتا رہا ــــ آج بھی اس جگہ رکوع و سجود کرنے والوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے۔

(۶) علمی ماحول سے استفادہ:

صحابہ کرامؓ، قرآن کے علاوہ ہر اس علم کو بھی حاصل کرتے تھے جو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہوتا تھا۔ مثلاً اسلامی ریاست کا دستور ہجرت مدینہ کے فوراً بعد آمد پر۔ نیز حضرت اسامہؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم نبویؐ وغیرہ۔

(۷) جدید علوم کی تشکیل:

قرآن کی تعلیمات کے زیر اثر متعدد دیگر علوم از قسم علم حدیث، تفسیر و تجوید اور نحو اور آیاتِ قرآنی پر نقطے اور اعراب وغیرہ ــــ اسی طرح قرآنی تعلیمات از قسم قوانین میراث کے لئے حساب کا علم وغیرہ۔

درج بالا علوم از قسم علم الحدیث کے بعد علوم نحو کی تشکیل ہوئی۔ اس ضمن میں مختلف علوم، ضرورتِ زمانہ کے تحت وجود میں آتے رہے۔ علم اشیا یا علم ماحول کے تحت صاحب مقالہ نے فلکیات، ہوا میں اڑنے کی کوشش کرنا، گھر گھر آب رسانی کا انتظام جو آج تک سپین میں قائم ہے، ٹھیک وقت بتانے والی گھڑیوں کی ایجاد، روئی سے کاغذ بنانا یہ سب مسلمانوں کے کارنامے ہیں ــــ یہاں ہم ان سب آراء اور تبصروں کے تحریر کرنے سے گریز کرتے ہوئے جو موجودہ زمانے کے مختلف غیر ملکی/غیر مسلم محققین نے اسلامی ممالک کی ترقی کے بارے میں لکھے، صرف ایک فقرہ لکھنے پر اکتفا کریں گے کہ ''یورپ کے امراء بھی اپنا نام تک لکھنا نہ جانتے تھے جب کہ قرطبہ کے بچے بھی سکول جاتے تھے۔'' ◆

◆ ڈاکٹر اکرام الحق نے بہت تفصیل کے ساتھ لارڈ میکالے کی تقاریر و تحریروں سے اقتباسات نقل کیے ہیں جنہیں پڑھنے سے ''گوروں کی چالاکی'' اور اپنوں (بالعموم پڑھے لکھے اور **بالخصوص ''بیوروکریسی''**) ☜

(۸) تعلیمی تنزل:

ان تمام تفصیلات میں (جو بہت اختصار کے ساتھ درج کی گئی ہیں) صاحب مقالہ نے اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی کہ ''جوں ہی علوم کا رشتہ وحی سے کمزور پڑا، مسلم قوم کا تنزل شروع ہوا'' غیر مسلموں نے مسلمانوں کی علمی میراث پر قبضہ جما کر ترقی کی گاڑی اپنے ہاتھ میں کر لی۔ اندلس کے علاوہ عرب علاقوں میں چونکہ عربی زبان باقی رہی اس لیے سیاسی طور پر شکست کھانے کے باوجود ان علاقوں کا دین کے ساتھ تعلیمی رشتہ بھی قائم رہا۔ برصغیر پاک و ہند کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ یہاں کی مقامی زبان عربی نہیں تھی۔ اسلام کے علمی ورثے کی تعلیم فارسی اور مقامی زبانوں میں ہوتی تھی مگر چوں کہ تعلیمی نصاب قرآن وسنت اور فقہ کے ساتھ ساتھ عربی میں لکھی ہوئی دیگر اسلامی کتب پر مشتمل تھا اس لیے عربی و فارسی سیکھنے کی ضرورت الگ سے ہوتی تھی گو کہ یہاں کے مسلمانوں کی دین کے ساتھ وابستگی عربوں کی وابستگی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ جب یہاں انگریز کا سیاسی غلبہ ہوا تو دیگر شعبہ ہائے زندگی کا حلیہ تو انہوں نے بگاڑ ہی دیا، یہاں کا نظامِ تعلیم ان کا خصوصی ہدف بنا۔ جب یہاں انگریز قابض ہوا، اس وقت یہاں تعلیم کا تناسب سو فیصد تھا مگر لارڈ میکالے کی سکیم کے تحت جب نظامِ تعلیم بدل دیا گیا تو ان تمام پڑھے لکھے لوگوں کو بیک جنبش قلم اَن پڑھ قرار دے دیا گیا۔ لارڈ میکالے نے ۱۸۳۸ء میں اردو کی جگہ انگریزی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنا دیا۔

صاحب مقالہ نے لارڈ میکالے کی تقریر، جو اس نے ۲ فروری ۱۸۳۳ کو برطانوی پارلیمنٹ میں کی، کا بڑا حصہ انگریزی ہی میں پیش کیا ہے **(نمعلوم ہماری بیوروکریسی میں سے کسی کی نظر سے وہ تحریر گرزی ہے یا نہیں اور کیا اس کے مضمرات اور عواقب کا انہیں شعور ہوا ___ کیونکہ اس کھلی اور لگی لپٹی تحریر کے پڑھنے کے بعد**

☜ **کی غفلت یا جہالت'' کا علم ہوتا ہے** کہ ان تمام تر تحریروں سے وہ گوروں کی حکمت عملی کا جائزہ/ اندازہ نہ کر سکے اور قیام پاکستان کے ۷۰ سالوں تک انگریزی زبان اور تعلیم کو ملک وقوم پر مسلط رکھا!

کوئی ذی ہوش وہ کچھ نہیں کر سکتا جو قیام پاکستان کے بعد بیوروکریسی اور ان پڑھ سیاستدانوں نے کیا) تاہم اس تقریر کا جو اردو ترجمہ صاحب مقالہ نے دیا ہے، **ہم اسے من و عن نقل کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ موجودہ وزیر اعظم سے درخواست کرتے ہیں کہ اس تقریر کا انگریزی متن بذاتِ خود ایک مرتبہ ضرور دیکھ لیں۔**

لارڈ میکالے نے کہا

> **''میں نے ہندوستان کے چپے چپے کو چھان مارا ہے، لیکن میں نے ایک بھی بھکاری نہیں دیکھا، ایک چور نہیں دیکھا، بلکہ بے پناہ دولت دیکھی۔ اس ملک کے لوگ بھی اتنے سمجھدار، قابل اور باصلاحیت ہیں کہ ان تمام خصوصیات کے ساتھ ہم کبھی بھی اِن پر حکومت نہیں کر سکیں گے جب تک ہم ان کی ریڑھ کی ہڈی کو نہ توڑ ڈالیں، جو کہ دراصل اُن کی روحانی اور ثقافتی روایات ہیں اور جن کو تبدیل کرنے کے لیے میرا مشورہ ہے کہ اُن کا قدیم اور روایتی تعلیمی نظام اور ثقافتی اقدار کو بدل دیا جائے۔ اگر انڈیا کے لوگوں کو ہم نے یہ سمجھا دیا کہ ہمارا یعنی انگریزی نظام اور روایات اُن سے بہتر ہیں تو وہ اپنی عزتِ نفس کھو دیں گے اور اپنی ثقافت کو بھول کے ہماری مرضی کے مطابق ایک غلام قوم میں تبدیل ہو جائیں گے۔''**

اسی بناء پر ۱۹۳۸ میں لارڈ میکالے نے اپنی حکومت کو جو نوٹ لکھا وہ یہ ہے کہ

> **''اس وقت ہمیں انتہائی کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ایسے لوگ تیار کریں جو نسل اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں لیکن ذوق، خیالات، اخلاقیات اور جملہ ذہنی میلانات کے لحاظ سے انگریز ہوں''**

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو انگریزی سکھانے سے لارڈ میکالے کا مقصد انہیں تعلیم یافتہ بنانا اور اپنی اعلیٰ تہذیب کا حامل بنانا نہیں تھا بلکہ پوری قوم کو تعلیم سے محروم کرنا اور ان سے رابطے کے لیے کچھ مقامی مترجم تیار کرنا تھا۔

دراصل یہ وہی نتیجہ ہے جسے علامہ اقبال نے شعر کی زبان میں یوں ادا کیا

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا **الحاد** بھی ساتھ

نیز اقبال نے کہا

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلم شوریدہ سر
لازم ہے راہرو کے لئے دنیا میں سامان سفر
شیدائی غائب نہ رہ، **دیوانہ، موجود** ہو
غالب ہے اب اقوام پر **معبود حاضر** کا اثر

یاد رہے کہ خط کشیدہ/ نمایاں الفاظ ''شیدائی غائب'' (اللہ/ رسول کا نظام)، دیوانۂ موجود اور معبود حاضر'' (جدید نظام تعلیم/ سائنس ٹیکنالوجی وغیرہ) کا صحیح مفہوم اس وقت تک سمجھا نہیں جا سکتا جب تک کہ برصغیر میں انگریز کی آمد اور مکمل تسلط کے تحت ہونے والی ''لارڈ میکالے کی تعلیمی اصلاحات'' کی تفصیل معلوم نہ ہو۔ اقبالؒ نے اس نظم میں سرسید احمد خان اور ان جیسی سوچ رکھنے والوں متعدد دیگر اصحابِ علم کے خیالات پر اس قدر جامع تنقید کی ہے کہ گویا یہ الفاظ/ مفہوم ان پر القاء ہوئے ہیں ــــ اس نظم کا یہ شعر پڑھئے اور داد دیجئے اس دقتِ نظر کی جس کی جانب ہم نے گزشتہ صفحات میں ڈاکٹر محمود غازی کے ''دینی تعلیم'' کے بارے میں خیالات درج کیے ہیں۔

ممکن نہیں اس باغ میں کوشش ہو بار آور تیری
فرسودہ ہے پھندہ تیرا، زیرک ہے مرغِ تیز تر!

اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد ازاں حکومت برطانیہ کے تحت جو نظام تعلیم اس ملک میں رائج رہا اور جس کے تحت مملکت بادشاہانِ مسلم کا تمام تر عدالتی، مالیاتی، معاشی، امن عامہ، قانون کی عملداری و دینی تعلیمات کا نظام وغیرہ چل رہا تھا، اس کے بارے میں بہت

تفصیل کے ساتھ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں تاہم ایک بھارتی اہل علم (دیپک کمار ۲۰۰۳) کے چند خیالات سے بھی آگاہی مفید ہو جو صاحب مقالہ نے درج کیے ہیں۔

''اٹھارھویں صدی کے ہندوستان میں ان تعلیمی مراکز سے ایک دہلی کا مدرسہ رحیمیہ تھا جو شاہ ولی اللہ کی زیر نگرانی چل رہا تھا۔**شاہ ولی اللہ ایک ایسے معلم تھے جو اسلامی عبادات اور سائنس میں توازن پیدا کرنے کے حامی تھے**۔ مدرسہ رحیمیہ کے تعلیمی نصاب میں دو کتابیں گرامر کی، ایک کتاب فلسفے کی، دو کتابیں منطق کی، دو کتابیں فلکیات اور ریاضیات کی اور پانچ کتابیں دینی تعلیمات کی شامل تھیں۔ دوسری طرف ملا نظام الدین سہالویؒ کے زیر انتظام ایک اور قابل ذکر تعلیمی مرکز لکھنو میں قائم ہوا، جو خود فرنگی محل کے تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے ایک نصابِ تعلیم مرتب کیا جو ''درسِ نظامی'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نصاب میں روایتی تعلیم کو معاصر تعلیم کے ساتھ مخلوط کر کے پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں منطق پر زیادہ زور دیا گیا''

(Kumar, Deepak, 2003)

درج بالا گفتگو سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ

☆ ...... انگریز نے جب برصغیر ہندوستان پر قبضہ کیا، اس وقت وہاں کے نظامِ تعلیم میں جدید علوم کی کوئی کمی نہ تھی۔

☆ ...... آج کل کی انتہا پسندی کا بھی کہیں نام ونشان نہ تھا۔

☆ ...... وہ ایک ترقی یافتہ قوم کا نصابِ تعلیم تھا۔ تاہم

☆ ...... اس میں اگر کوئی نقص تھا تو صرف یہ کہ وہ غلامی کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا تھا۔ لہٰذا

☆ ...... لارڈ میکالے نے اپنی قوم کے مفاد کے لئے اسے بدل دیا جس کے پیش نظر فرنگی قوم کی اقدار کو اس مملکت میں رائج کرنا اور استحصالی نظام کو برقرار رکھنا تھا۔

☆ ...... اس کا نتیجہ ان کے ذہن کے مطابق یہ نکلا کہ وہ قوم انگریزی سے گھبرا کر تعلیم کو چھوڑ دیں گے ___ اور

☆......دوسری طرف وہ باوسیلہ لوگ جو ان مشکلات کو اپنے وسائل کے زور سے دور کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے، وہ انگریز کے محتاج ہو جائیں گے صرف انہیں ہی نوکریاں ملیں گی___ وہ انگریزی (ٹوٹی پھوٹی) کے ذریعے ان پڑھ عوام پر حکومت کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

☆......اس نئے نظام تعلیم کے اجراء سے جو لوگ سو فی صد پڑھے لکھے تھے بیک جنبش قلم ان پڑھ قرار پائے۔

اس دور میں اہل علم کو خاص طور پر ظلم و جبر کا نشانہ بنایا گیا۔ جن علماء کے پاس وسائل تھے ان کو نئی حکومت (انگریز حکومت) نے پکڑ کر کالا پانی بھیج دیا، جیلوں میں ڈال دیا، یا قتل کر دیا۔ ان حالات میں علماء نے دینی علوم کے ہر حال میں تحفظ کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگ گھروں اور شہروں کو چھوڑ کر دور بستیوں میں نکل گئے اور آبادیوں سے دور جا کر مدارس قائم کیے۔ جو کل تک جائیدادوں والے تھے انہوں نے دین کا علمی ورثہ محفوظ رکھنے کے لیے کسمپرسی کے عالم میں مدارس قائم کیے اور قریبی بستیوں سے کھانا مانگ کر طلبہ کو کھلاتے رہے۔ انہیں حالات میں دیوبند کی دور دراز بستی میں مولانا قاسم نانوتویؒ نے دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ اس کی کوئی عمارت نہیں تھی۔ صرف ایک انار کا درخت تھا جس کے نیچے بیٹھ کر درس و تدریس کا کام شروع ہوا۔ دارالعلوم دیوبند کی پہلی کلاس میں دو آدمی تھے، جن میں سے ایک استاد تھا اور دوسرا طالب علم۔ ❶

---

❶ ''یہ مدارس چونکہ ایسے حالات میں قائم ہوئے تھے جب تعلیم اسلام کو بزور طاقت ختم کیا گیا تھا، اس لیے مدارس کے متعلقین کو یہ دھڑکا مسلسل لگا رہتا ہے کہ کہیں کسی سازش کے ذریعے اس نظامِ تعلیم کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس والے اب تک اس نصاب کو بچانے کے لیے ان علوم کے تحفظ کے لیے ہر وقت جذباتی ہو جاتے ہیں اور اگر حکومت کی طرف سے نصاب تبدیل کرنے کی بات آتی ہے تو مرغی کی طرح وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو مدمقابل کی طاقت کا اندازہ لگائے بغیر اپنے چوزوں کو بچانے کے لیے جھپٹ پڑتی ہے۔ علمائے کرام نے اس کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں، اور وہ بہت مشکل وقت دیکھ چکے ہیں۔''

(۹) تعلیمی نظام میں تبدیلی کے بعد وجود ملی رکھنے کی کاوشیں:

اس ضمنی موضوع کے تحت صاحب مقالہ نے وضاحت کی کہ ''نظامِ دنیا چلانے کے لئے دوطرح کے علم کی ضرورت ہے۔ایک علم وحی یا شریعت اور دوسرا علم اشیاء یا علم ماحول''____ ''اب سوال یہ ہے کہ یہ دونوں علوم دور حاضر میں یکجا کر کے کیسے پڑھائے جا سکتے ہیں''؟ موجودہ دور میں علوم اور تخصصات اس قدر وسیع ہو چکے ہیں کہ تمام علوم کا حصول کسی ایک فرد کے لئے ناممکن الحصول بن گیا ہے____ یہ معاملہ فی الحال اہل علم کے درمیان ایک مسلسل تنازعہ بن گیا ہے____ ''دینی اور دنیوی کے نام سے دو نصاب تعلیم کو ساتھ ساتھ چلانے کی کوششیں ایک عرصہ سے جاری ہیں۔اپنے طور پر دنیوی علوم کے ماہرین، مدارس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے نصاب میں سائنس اور دیگر معاصر علوم شامل کریں تا کہ یہاں سے فارغ ہونے والے لوگ معاشرے پر بوجھ نہ بنیں جب کہ مدرسہ والوں کا کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ، اللہ تعالیٰ کی تعلیمات انسانوں تک پہنچانے آئے تھے۔آپؐ کی تعلیمات کا مقصد ڈاکٹر، انجینئر، وکیل اور سائنس دان وغیرہ پیدا کرنا نہیں تھا۔ایسے حالات میں ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کے مصداق مدارس والے ان تمام تر کوششوں کے بارے میں ان شکوک اور شبہات کا اظہار کرتے ہیں جن کا گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

دینی علوم حاصل کیے بغیر مسلمانی کا تصور واضح نہیں ہوتا اور سکول، کالج، یونیورسٹی گئے بغیر دنیا کی زندگی اجیرن نظر آتی ہے۔برطانوی دور سے لے کر آج تک دینی اور دنیوی کے نام سے دو نصاب ساتھ ساتھ چلانے کی کوششیں بھی باوجود متعدد ادارے (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے) کام کر رہے ہیں لیکن ان میں سے کسی ادارے سے مقصدیت پر مشتمل نتائج کے حصول کی شرح اکاون فی صد سے آگے نہیں جا سکی۔گزشتہ ایک سو سالوں میں متعدد اقدامات تجویز کیے گئے لیکن کامیابی نہ ہو سکی تاہم گزشتہ ۶۰ / ۵۰ سالوں میں کھمبی کی طرح اگنے والی سرکاری اور پرائیویٹ یونیورسٹیوں نے تو دھڑا دھڑ پیسوں کے حصول کے لئے ڈگریاں بانٹنی شروع کر دی ہیں کہ اب تو کسی ڈگری کا وقار باقی

ہی نہیں رہا ــــــ پرائیویٹ طور پر امتحانات دینے نیز غیر سرکاری یونیورسٹیوں سے ڈگری جاری کرنے کی سہولت نے ایم اے/ ایم فل کی ڈگریوں کا حصول اس قدر سہل بنا دیا ہے کہ اس سہولت نے ڈاکٹرز/ انجینئرز و دیگر علوم میں ڈگری لینے والوں کی تعداد میں ایک محیرالعقول اضافہ کر دیا ہے۔ اس ضمن میں مرحوم محمود غازی نے دینی تعلیم کے مدرس یا معلم (سکولوں/ کالجوں میں) بننے کے لئے جو لوگ درج بالا پرائیویٹ یا سرکاری یونیورسٹیوں سے ایم اے/ ایم فل کی ڈگری حاصل کر لیتے ہیں، کے بارے میں لکھا کہ ''ان میں سے بہت سے لوگ قرآن پاک ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ جنہیں اگر نماز پڑھانے کا کہا جائے تو وہ نماز بھی نہیں پڑھا سکتے اور قرآن پاک کی شاید چار پانچ سورتیں بھی ان کو حفظ نہ ہوں'' ــــــ یہاں اس تبصرے کو صرف اسلامیات کے مضمون تک محدود نہ سمجھا جائے بلکہ یہ صورت حال دیگر سائنسی اور فنی مضامین (از قسم فزکس/ کیمسٹری/ ڈاکٹری/ انجینئرنگ اور وٹرنری کے تمام شعبوں تک وسیع ہے!)۔ ایک ڈاکٹر ایم بی بی ایس کی ڈگری کے حصول کے بعد بچوں/ بوڑھوں کو انٹراوینس انجکشن نہیں لگا سکتا کہ آخری امتحان ختم ہونے تک اسے اس کی تربیت ہی حاصل نہیں ہوئی۔ جناب اکرام الحق صاحب نے گزشتہ صفحات کی تمام تر گفتگو کو نظام تعلیم کے ایک معروضی خاکہ (Scheme of Study) کے تحت یوں سمیٹا ہے۔

نظام تعلیم کا معروضی خاکہ (Scheme of Study)

''اب مسئلے کا حل کیا ہو؟ تو اس سلسلے میں راقم (صاحب مقالہ) کی محدود سوچ میں دینی دنیوی علوم کی سوچ ہی سرے سے درست نہیں۔ علوم کی تقسیم نافع اور غیر نافع کے لحاظ سے جا سکتی ہے۔ اور جہاں تک دو نصاب ساتھ ساتھ چلانے کا تعلق ہے تو یہ بچوں پر نامناسب بوجھ ہے۔ **شریعت نے تو بچوں کو نماز روزے سے بھی مستثنٰی کیا ہے، اگر ہم اس سے بھی کئی گنا زیادہ بوجھ ان پر ڈال دیں تو ان کے ساتھ کیا اچھا کریں گے۔** طلبہ و طالبات سے کتابوں کا بوجھ کم کر کے انہیں سمجھ بوجھ کی فرصت بہم پہنچا کر اچھی تربیت کے ماحول میں ہی اچھے انسان بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں ایک ایسے تعلیمی نصاب کی ضرورت ہے جو ہماری دینی اور معاشرتی ضروریات کو پورا کرتا ہو۔ اسمیں دینی دنیوی کی

تفریق نہ ہو کہ ملا اور مسٹر وادی کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے کے برابر دوڑ لگا رہے ہوں اور کوئی بھی معاشرے کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے۔ اس کے لئے ایک نصابی خاکے کے چند نکات ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

ا۔ مقصدیت:

اسلامی معاشرے کا وجود دین کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے (جو توحید، رسالت اور آخرت نیز دیگر عقائد پر مشتمل ہے) اور جو عبادات، معاملات، اخلاقیات کا مجموعہ ہے۔ یہ امور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور دنیا کے تمام انسانوں کو امن اور شانتی کا پیغام دیتے ہیں۔

آج آپ کسی بڑی سے بڑی یونیورسٹی، مدرسے کے طلبہ بلکہ اساتذہ سے بھی یہ سوال کریں کہ اس تمام تعلیم کا مقصد کیا ہے تو وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھے گا گویا اسے آپ کی دماغی صحت پر کوئی شک ہو۔ بیشتر طلبہ (بشمول اساتذہ) کا یہ خیال ہوتا ہے کہ عمر عزیز کا ایک طویل دور اور لامتناہی اخراجات کے بعد اعلیٰ ترین نوکری/ پیشے کے حصول کے علاوہ کوئی اور مقصد تعلیم بھی ہو سکتا ہے؟ (اور اس میں بھی حلال کی بہ نسبت حرام ذرائع آمدنی کا ترجیحاً حصول بیشتر لوگوں کے ذہن میں ہوتا جس کا وہ اظہار نہیں کرتے)۔

2۔ مربوطیت اور وحدت:

ایک نصابی تعلیمی نظام کی دوسری اہم ترین خصوصیت جسے ڈاکٹر اکرام الحق یاسین نے واضح کیا وہ تعلیمی نظام میں ربط اور وحدت کا ہونا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے سورہ ابراہیم (۱۴: ۲۴ تا ۲۶) کی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے یہ واضح کیا کہ ''شجرہ طیبہ سے مراد توحید باری تعالیٰ ہے۔ یہی اسلام کی بنیاد اور جڑ ہے۔ اس کی شاخوں سے مراد ایسے علوم وفنون ہیں جو اس بنیادی تصور کو واضح کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

3۔ دین اور مضمون میں ربط:

یہ وہ تیسرا اہم پہلو ہے جو نصاب تعلیم میں موجود ہونا ضروری ہے۔ اس میں جہاں ہر سطح

کے طلبہ (پرائمری بلکہ پری سکول) کے لئے سب سے پہلے ان کی ذہنی سطح کے مطابق مضمون کا خاکہ تیار کرنا اور اسکے مطابق مواد کا جمع کرنا ـــــ اس مواد سے متعلقہ قرآنی آیات کو منتخب کر کے ابتدا اللہ کے نام سے کی جائے ـــــ احادیث کا حوالہ بھی (عمر اور ذہنی جسمانی بلوغت کے لحاظ سے) دینا چاہیے۔ چھوٹے بچوں کے لئے حتی الوسع تصاویر (ویڈیو وغیرہ) سے وضاحت کی جائے ـــــ نیز اس ضمن میں غیر مسلم اہل علم کی آراء سے مدد بھی لی جاسکتی ہے۔

بچوں (پری سکول سے پرائمری یعنی پانچویں تک) کے لئے حال ہی میں متعدد اصحاب وخواتین نے ایسے نصاب کتب بنائے ہیں جن سے بچوں کو ان کی عمر کے لحاظ سے کائنات اور اس میں پائی جانے والی اللہ تعالیٰ کی لاتعداد مخلوقات سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ ایسی ایک کوشش ایک ڈاکٹر صاحبہ نے ذاتی طور پر کی ہے نیز اس قسم کے ایک نہایت عمدہ کوشش آفاق (AFAQ: Association For Academic Quality) نامی ادارے کی ہے جو پری سکول سے لے کر کالج کے طلبہ/ طالبات کے لئے AFAQ Encyclopaedia کے نام سے ہفتہ وار نہایت خوبصورت چار ورقہ کتابچہ شائع ہوتا ہے (گزشتہ صفحات میں اس کا ذکر ہو چکا ہے) ـــــ ہم نے اس کا ذکر خاص طور پر اس لئے کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں بچوں کو انٹرنیٹ، موبائل، ٹی وی دیکھنے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ ان کا دھیان کتب بینی (حتیٰ کہ اپنی درسی کتب سے بھی بہت حد تک ہٹ گیا ہے۔) دوسری جانب مخرب اخلاق لٹریچر کی اس قدر بھرمار ہے کہ الامان الحفیظ ـــــ ایسے عالم میں ایک اور بہت بڑی خامی والدین (بالخصوص اپر مڈل کلاس اور مترفین جن کے پاس حلال حرام ذرائع سے کمائی (الا ماشاءاللہ) کا خیال کیے بغیر ہیں جو اپنے بچوں کے لئے لباس، جوتے، کھلونے، کھانے پینے کی نہایت مضر صحت اشیاء (بیکری سے لے کر مشروبات اور فاسٹ فوڈ وغیرہ) فراہم کرنے میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے لیکن اگر ان کے پاس رقم نہیں ہوتی تو صرف اپنے اور بچوں کے لئے ایسے ہلکے پھلکے تاہم معلوماتی لٹریچر (رسالے، کتابچے، ناول، شعراء کا کلام، سوانح اور دیگر تاریخی مواد) کے لئے ایک پیسہ بھی خرچ کرنا گوارا نہیں کرتے ـــــ تاہم متوسط طبقے کے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لئے اوائل عمر (بلکہ اپنی شادی کے فوراً بعد) ایک معتدبہ رقم رسائل/کتب کی خرید کے

لئے مخصوص کریں) تاکہ جب ان کے بچے پڑھنے کی عمر کو پہنچیں تو وہ اپنے گھر میں والدین کی تیار کردہ ذاتی لائبریری سے استفادہ کر سکیں۔

(۴) زبان:

زبان چونکہ علوم وفنون سیکھنے اوراس کے ابلاغ کا ذریعہ ہوتی ہے اور انسانی فطرت بھی یہ ہے کہ وہ اپنی مادری زبان کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور اس کے لئے علم سیکھنے کا بہترین ذریعہ بھی اس کی زبان ہوتی ہے۔ اس ضمن میں صاحب مقالہ نے سورہ ابراہیم (۱۴:۴) کی آیات سے استشہاد کرتے ہوئے، مادری زبان کی اہمیت واضح کی۔ اس اصول کے تحت عرب میں حضورؐ کو مبعوث فرمانے کی وجہ سے قرآن مجید عربی زبان میں نازل کیا___ اس سے پتہ چلتا ہے کہ معلم، نصاب اور پڑھنے والوں کی زبان ایک ہونی چاہیے۔ ہماری قومی زبان اردو ہے اس لیے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ حسب ضرورت دوسری زبانیں نصاب میں شامل کی جائیں جن کی مقدار مرحلہ وار بڑھائی جاتی رہے۔ پاکستان کی جو علاقائی زبان تعلیم و تعلم کے تقاضے پوری کرتی ہوں بالکل پرائمری سطح پر تعلیم اسی میں دی جائے تو زیادہ مفید ہوگا اس صورت میں پہلے چند سالوں میں طلبہ وطالبات کی اردو خاصی مضبوط کرادی جائے تاکہ وہ آگے چل کر قومی دھارے میں شامل ہوجائیں اور پہلے بارہ سالوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر اردو میں تکمیل ہو۔ انگریزی زبان اس دور میں بہت اہم ہے مگر دنیا بھر میں دوسرے ملکوں کی زبانیں ''غیرملکی زبان Foreign Language'' کے طور پر سیکھی جاتی ہے۔ مختلف زبانیں سکھانے کا عمدہ انتظام کیا جائے اوراس کی طرف مکمل توجہ دی جائے لیکن تعلیمی نصاب دوسری زبان میں پڑھانا گویا معاشرے میں طبقات پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ اس بارے میں مزید گفتگو آئندہ صفحات میں آرہی ہے۔

(۵) تدریج:

جس طرح قرآنِ مجید کا نزول تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا اسی طرح پوری شریعت کے نفاذ میں تدریج کے اصول کو مد رکھا گیا۔ نصاب کی تیاری ایک نہایت کٹھن کام ہے اور ایک یکساں نظامِ تعلیم کے لیے نصاب بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں مشکل یہ رہی ہے کہ

بچوں کو پیدا ہوتے ہی انگریزی کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بچے کو ایک طرف معاشرہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور والدین کی انگریزی بلوانے کی خواہش اپنی طرف اور وہ بچپن سے ہی اعصاب کا تناؤ لے کر پلتا بڑھتا ہے۔ نہ دل و دماغ کو یکسوئی حاصل ہو پاتی ہے اور نہ وہ کوئی تخلیقی کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہ بات انگریزی سے نفرت کی علامت نہ سمجھی جائے، زبانوں سے کیا نفرت کرنا وہ تو رابطے اور علم کا ایک بہترین ذریعہ ہے مگر ذہنی سطح، ماحول کی ضرورت اور معاشرتی پس منظر کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک انگریزی ہی کیا جب ہمیں مذہبی ذہن رکھنے والے لوگوں سے قرآن مجید اور دینیات سے غفلت برتنے کی شکایات سننی پڑتی ہیں تو ہم جلدی میں پرائمری یا مڈل تک کے طلبہ و طالبات کو پورا قرآنِ مجید باترجمہ پڑھانے کا نعرہ لگا دیتے ہیں۔ بھلا یہ معصوم جانیں اس ذمہ داری کو اتنی کم عمری میں کیسے اٹھا سکتی ہیں جسے اٹھانے سے زمین و آسمان نے معذرت کر لی۔ اصل طریقہ تدریج ہے اور اگر مندرجہ بالا تجویز کے ساتھ تمام مضامین میں قرآن و سنت اور دینی نصوص کا حسب حصہ شامل کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ ہمارے طلبہ و طالبات اچھے مسلمان بن سکتے ہیں بلکہ وہ جدید علوم کے ماہر بھی ہو سکتے ہیں۔ تاریخ کا بارہ سو سالہ تجربہ اس کا شاہد ہے۔

(۶) تربیتی انداز:

شریعت نے صرف احکام نافذ کرنے کا طریقہ نہیں اپنایا بلکہ قرآنِ مجید میں آیات کے آخری جملے جن میں بعض اوقات تقویٰ کا درس دیا جاتا ہے، بعض دفعہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا درس دیا جاتا ہے، ظلم کی برائی بیان کی جاتی ہے وغیرہ۔ اس طرح قرآن مجید اور سنت پاک کی مشارکت سے نصابِ تعلیم بذات خود ہی اچھے انسان پیدا کرنے کی ضمانت ہوگا اور اگر اس کے اندر تربیتی انداز اپنایا جائے، صرف معلومات بہم پہنچانے پر اکتفا نہ کیا جائے تو ایسا تعلیمی نصاب ہی تعمیر و ترقی کا ضامن بن سکتا ہے۔

(۷) اساتذہ کے لیے باحوالہ رہنما کتب کی تیاری:

ہر نصابی کتاب کے ساتھ ایک رہنمائے اساتذہ تیار کیا جائے جس میں ان اقتباسات

کے مکمل حوالے اور وضاحتیں ہوں جن کی مدد سے وہ طلبہ وطالبات کو نصاب کے مشمولات ذہن نشین کرا سکے اور جہاں عملی تربیت کی ضرورت ہو وہ بھی کر سکے۔

نفاذ کے لیے تجاویز:

نصاب کا یہ خاکہ شاید وقتی طور پر مشکل معلوم ہو اور اس کے نفاذ میں مشکلات کا تصور بھی اس طرف متوجہ ہونے میں مانع ہو۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کام کے لیے غیر معمولی توجہ اور جگر سوزی کی ضرورت ہوگی۔ ایک آدھ دِن میں اس کی تکمیل بھی ممکن نہیں ہوگی مگر یہ اتنا بھی مشکل نہیں کہ مایوس ہو کر اسے چھوڑ دیا جائے۔ کچھ **اہل علم ایک غیر سیاسی، غیر تجارتی، غیر مفاداتی کمیٹی بنا کر اس کا خاکہ تیار کرلیں اور کام شروع کر دیں تو اللہ تعالیٰ ضرور برکت دیں گے۔** (اس ضمن میں مزید گفتگو آئندہ صفحات میں آ رہی ہے)۔

جہاں تک اس کے نفاذ میں مشکلات کا تعلق ہے تو ہم نے اسے بارہ سالہ نصاب تجویز کیا ہے۔ اس میں دو یا تین امتحانات بورڈ کے تحت بھی آتے ہیں۔ اس کا ایک حل یہ ہے کہ پرائمری کی حد تک نصابی کتابیں پرائیویٹ سکولوں کی انتظامیہ اپنی صوابدید سے پڑھا سکتی ہے۔ پرائیویٹ سکولوں میں اس مرحلے تک اس سے بھر پور فائدہ اٹھایا جائے اور سرکاری سکولوں میں نفاذ کے لیے محکمہ تعلیم کے متعلقہ افسران سے ملاقاتیں کر کے مذاکرات کے ذریعے انہیں اس کی افادیت بتائی جائے اور اس کے نفاذ کی تجویز دی جائے۔ سر دست بورڈ کے نصاب کے علاوہ پہلی پہلی کلاسوں کے لیے یہ نصاب ہو اور بورڈ کے سال میں مقررہ نصاب۔ ویسے بھی ہماری تجویز یہ ہے کہ حکومت کے مقرر کردہ خاکے ہی سے تعلیمی نصاب تیار کیا جائے اور اسی کے اندر قرآنی آیات اور حدیث شریف سے (آسان) اقتباسات شامل کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ محکمہ تعلیم سے بطور قومی نصاب منظور کرانے کی کوشش جاری رکھی جائے۔ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان کی مفید تجاویز کو اپنایا جائے۔ اس طرح کہ اصل مقصد فوت نہ ہونے پائے اور زمانے کی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ ڈگری لیول اور پوسٹ گریجویٹ کے لئے بھی مربوط نصاب اس انداز میں تیار کیا جا سکتا ہے، مگر اہم ترین کام پہلے بارہ سالوں کا نصاب سے متعاف کرانے کے لئے مسلسل ورکشاپس کروائی جائیں کیونکہ تعلیم میں اساتذہ کا کردار بنیادی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے“

باب دہم

نظام تعلیم کی تشکیل نو: چند تجاویز و آراء

گزشتہ باب میں ہم نے اُن چند امور کے بارے میں گفتگو کی ہے جن کا تعلق تعلیمی نظام کی تشکیل نو کے اصولی مباحث سے تھا۔ جیسا کہ گزشتہ ابواب میں اشارتاً کہا گیا کہ مغلیہ دور تک جو تعلیمی نظام رائج تھا، وہ ہماری تمام تر ملی اور قومی ضروریات کا بہت حد تک کفیل تھا تاہم انگریز نے جب اس برصغیر پر قبضہ کیا تو اپنے استبدادی نظام کو تقویت دینے اور اس ملک کے باسیوں کو سیاسی اور ذہنی طور پر غلام بنانے کا ایک طریقہ وضع کیا جس کے بارے میں لارڈ میکالے نے کسی قسم کا کوئی ابہام روا نہ رکھا۔ یہ تو ہمارے لوگوں کی اپنی بدقسمتی تھی کہ ہم نے اپنی نکیل خود انگریز کے ہاتھوں میں تھما دی اور اس پر مستزاد یہ کہ مرعوبیت کی یہ فضا نہ صرف دوسو سال سے (آج تک) برقرار ہے بلکہ قیام پاکستان کے بعد (ماسوا قائداعظم کی طلب کردہ قومی کانفرنس) ہم بحیثیت مجموعی حالت نفاق کی ایسی کیفیت میں مبتلا ہیں کہ آج تک فیصلہ سود و زیاں نہ کر سکے۔ اگرچہ انگریز کے دور ہی سے اسلامی ذہن رکھنے والوں نے اس کی مدافعت اور اپنے دینی ورثے کی تکمیل کے لئے جو کچھ زخم اٹھائے، وہ ہماری ملی تاریخ کا ایک ایسا سنہرا باب ہے جسے نمایاں کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی بلکہ گزشتہ ۵۰/۶۰ سالوں میں اس کے بارے میں اس حد تک تغافل برتا گیا اور نسل نو کے سامنے اس کا ایک ایسا پہلو پیش کیا گیا کہ ان کے ذہنوں سے اپنے آباء واجداد کی عظمت اور روشن و تابناک کوششیں اوجھل ہو کر رہ گئیں۔ تاہم انگریز سے مراعات پانے والے ایک مخصوص طبقے نے اقتدار پر قبضہ کر لینے اور یوں عزم سفر کعبہ والی امت کی باگیں شیطانی نظاموں (ملوکیت، جمہوریت، اشتراکیت، لادینیت وغیرہ) کی جانب موڑ دیں۔ ظاہر ہے کہ گاڑی کے انجن پر جس کا قبضہ ہوتا ہے، گاڑی کی سمت کا تعین بھی اس کی صوابدید پر ہوا کرتا ہے چاہے مسافر کتنا ہی واویلا

کریں ـــــ لیکن یہ بھی یہ ایک بہت تلخ حقیقت ہے کہ واویلا کرنے والوں کی آواز کو بھی دبا دیا گیا

خواب سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم گر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

یہاں اس حقیقت کا ادراک کرنا بھی ضروری ہے کہ محکوموں کو سلا دینے کے اس عمل میں جہاں اہل سیاست کی پُرکاری اور مغربی نظام تعلیم کے پروردہ بیوروکریسی کو دخل حاصل ہے وہاں اس میں ''اہل دین'' (ملاں/ پیر/فقیر) کا حصہ بھی کسی سے نہیں۔

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کہ بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذرؓ و دلق اویس و چادرِ زہراؓ

''تعلیمی ثنویت (دینی و دنیوی تصور تعلیم) اور اس کے خاتمے کا طریق کار'' کے موضوع پر ایک اور مسلم صاحب علم پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (۲۰۱۲) کا مقالہ بھی ہمارے پیش نظر ہے۔ ذیل کی سطور میں ہم ان کے مقالے کے نہایت فکر انگیز خیالات اور یکساں نظام تعلیم کے تجویز کردہ تفصیلی نصاب تعلیم کا ذکر کریں گے۔ موصوف نے تعلیمی ثنویت ◆ کے نتائج کے عنوان سے واضح کیا کیا کہ

> ''مسلم تصور تعلیم میں یہ انحراف کوئی معمولی انحراف نہ تھا بلکہ اس کے انتہائی گہرے اور دوررس اثرات نکلے۔ اس سے اسلام کے اس تصور کو زک پہنچی کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا جامع ہے، دنیا میں زندگی گزارنے کا مکمل نظام ہے، اور دنیا کی زندگی میں اسلامی تعلیمات پر عمل آخرت میں نجات کا ضامن ہے۔ اس سے مسلم معاشرے میں ایک نوع کے سیکولرزم کا چلن ہوا اور دین و دنیا میں تفریق کے رجحان کو استحکام حاصل ہوا، (جو اپنی اصل میں غیر اسلامی ہے)۔ جب تعلیم کا ڈھب بدلا تو تربیت کا وہ رنگ بھی باقی نہ رہا جو مسلم تعلیم کا جزو لاینفک تھا۔ اور آہستہ آہستہ مسلمانوں میں اس نظام تربیت

◆ مناسب ہے کہ باب نمبر ہفتم کے مندرجات پر بھی اگر دوبارہ نظر ڈالی جائے!

کے فقدان کا احساس ہی ختم ہو گیا (خود ان اداروں میں بھی جو ان کے اپنے قائم کردہ تھے)۔''

''جب استعمار کے قائم کردہ اس نظام تعلیم و تربیت سے لوگ دفتروں، بازاروں، کارخانوں اور اقتدار کے ایوانوں تک پہنچے تو ان کی اپنی زندگیوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا داعیہ ہی باقی نہ رہا۔ اب نہ حکمرانوں کو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نفاذ شریعت کی فکر تھی اور نہ مسلم عوام کو اس بات کا قلق تھا کہ شریعت معاشرے میں نافذ کیوں نہیں ہوئی، اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کوئی انقلاب نہ آ سکا۔ وہ ذلت و مسکنت کے گڑھے سے نکل نہ سکے اور ترقی، خوشحالی اور نشاۃ ثانیہ محض خواب بن کر رہ گئے۔''

اصولی حل

''اس صورت حال کا اصولی حل تو یہی ہے کہ نظام تعلیم ایک ہو، عام تعلیم میں دینی مضامین ضروری حد تک شامل ہوں اور وہ اسلامی تناظر میں دی جائے۔ دین کی خصوصی تعلیم تخصص کے مرحلے میں ہو۔ تربیت تعلیم کا جزو ہو۔ تاہم ظاہر ہے کہ ان تصورات کو روبہ عمل لانے کے لیے پورے نظام تعلیم خصوصاً نصاب، تربیت اساتذہ اور تربیت طلبہ کے مناہج کی تبدیلی ناگزیر ہے۔''

پھر نظام تعلیم کی وحدت کا سوچتے ہوئے ہمیں اس غلط فہمی سے بھی بچنا ہوگا کہ کسی تعلیمی دھارے کو برقرار رکھتے ہوئے دوسرے دھارے کی معمولی پیوند کاری سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ کیونکہ صرف اتنی بات سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا کہ جدید تعلیم کے ادارے اسلامیات پڑھا دیں اور دینی مدارس میں کچھ جدید علوم پڑھا دیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ یہ کام اتنے مؤثر طریقے سے ایسے ڈھب سے ہو کہ عملاً متوازن سیرت کے آدمی پیدا ہونے شروع ہو جائیں اور اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ان دونوں دھاروں کا ورلڈ ویو

بدلے، ان کا تعلمی کلچر بدلے، نصاب از سر نو مدون ہو، ان کے ہاں تربیت طلبہ کے تصورات اور مناہج بدلیں اور انہی تصورات کے مطابق اساتذہ کی تربیت کا اہتمام ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کام Status Quo برقرار رکھتے ہوئے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک تیسرا تعلیمی ماڈل کھڑا کیا جائے جسمیں سابقہ دونوں تعلیمی نظاموں کی مثبت خصوصیات تو موجود ہوں لیکن وہ ان کی خامیوں سے مبرا ہو ___ واضح رہے کہ دیوبند اور علی گڑھ کے دو ماڈلوں کے برعکس ندوۃ العلماء اور بعد ازاں جامعہ ملیہ بھی تیسرا ماڈل نہ بن سکے۔ تاہم درج ذیل تیسرے نئے ماڈل کا تصور کوئی ایسا عجوبہ نہیں جو قابل فہم اور قابل عمل نہ سمجھا جائے!''

تعلیمی اسکیم:

اس موضوع پر مزید لکھا کہ ''ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس اصولی حل کی کچھ عملی تفصیلات یہاں دے دی جائیں تا کہ بات واضح ہو جائے۔ تفصیلات کے تعین میں اس امر کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ تعلیم کے میدان میں مقامی اور بین الاقوامی عرف سے بہت دور نہ جایا جائے۔ اگر تعلیمی ثنویت دور کرنا مقصود ہو تو پھر مجوزہ طریق کار کو (قومی سطح پر مکالمے اور متعلقہ اداروں سے منظوری کے بعد) لازمی ہونا چاہیے اور کسی بھی تعلیمی ادارے کو یہ اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اس سے ہٹ کر تعلیم دے۔'' (درج ذیل ذہنی کاوش بیوروکریسی کے بس کی نہیں ___ یہاں تو وہ صلاحیت ہی عنقا ہے)

پری پرائمری (پریپ/ اعدادیہ)

داخلے کی عمر: پانچ سال

دورانیہ: ایک سال

ذریعہ تعلیم: مادری زبان/ اردو

مقاصد

☆ بچے کو سکول سے مانوس کرنا۔
☆ آئندہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے تیار کرنا۔
☆ عربی پڑھنا سیکھنا تاکہ قرآن حکیم پڑھنے کی اساس میسر آجائے اور اردو کے مخارج بھی ہمیشہ کے لیے درست ہو جائیں۔
☆ روزمرہ ضروریات کے لیے ابتدائی گنتی سیکھنا اور یاد کرنا۔
☆ زندگی کے بنیادی آداب سیکھنا۔

نصاب

☆ کھیل کود (سکول میں جھولے اور سلائیڈوں وغیرہ کا لازمی ہونا)۔
☆ قرآن وسنت پر مبنی کہانیاں سنائی جائیں، ان کہانیوں کے ویڈیو کھائی جائیں۔
☆ اسلامی تناظر میں تیار کی گئی کارٹون فلمیں دکھائی جائیں۔
☆ کلمہ طیبہ، بسم اللہ
☆ نماز یاد کرائی جائے۔ نماز کی ویڈیو دکھائی جائیں۔
☆ عربی حروف تہجی، عربی کا ابتدائی قاعدہ۔
☆ ایک سے سو تک گنتی۔
☆ آرٹ/ ڈرائنگ۔
☆ تربیت (تفصیل آگے آئے گی)

پرائمری:

داخلے کی عمر: چھ سال   دورانیہ: پانچ سال   ذریعہ تعلیم: مادری زبان/ اردو

مقاصد:

پرائمری کے آخر تک بہت سے بچوں کے سکول چھوڑ جانے کی وجہ سے ضروری دینی و

دنیاوی تعلیم کی اس مرحلے پر تکمیل تاکہ اگر بچہ بعد میں تعلیم نہ بھی جاری رکھ سکے تو بنیادی تعلیمی مہارتوں کا حامل ہو مثلاً:

☆ قرآن مجید مکمل ناظرہ پڑھ سکے اور کچھ حصہ یاد کر لے۔

☆ اردو لکھ، پڑھ اور بول سکے۔

☆ نماز کا ترجمہ اور قرآنی مسنون دعائیں اسے یاد ہو جائیں۔

☆ حفظان صحت کے اصولوں سے واقف ہو جائے۔

☆ حساب کی روزمرہ کی ضروریات پوری کر سکے۔

نصاب

☆ دینی تعلیم

☆ پانچ سال میں ناظرہ قرآن کی تکمیل (پہلے سال ایک پارہ، دوسرے سال چار پارے، تیسرے سال سات پارے، چوتھے سال آٹھ پارے اور پانچویں سال دس پارے)۔

☆ تیسواں پارہ زبانی یاد کرنا۔

☆ نماز کا ترجمہ (بشمول آخری سورتیں) نماز پڑھنے کی عملی مشق اور اسے عادت بنانا۔

☆ قرآنی اور مسنون دعائیں/ اذکار یاد کرنا (مع ترجمہ) اور ان پر عمل کی مشق۔

☆ ہر سال عقائد، عبادات، اخلاق و آداب اور معاملات سے متعلق چالیس مختصر احادیث کی تدریس مع تشریح) جن کا انتخاب بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق کیا گیا ہو۔

☆ سیرت النبی ﷺ اور صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم کے احوال، کہانیوں کی صورت میں۔

☆ اسلامی تناظر میں تیار کی گئی ویڈیوز اور فلمیں۔

☆ ضروریات دین مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ، حج، عائلی زندگی، حلال و حرام اور اخلاقیات وغیرہ سے متعلق بنیادی معلومات آسان پیرائے میں۔

۲۔ زبانیں

اردو: پہلی سے پانچویں تک لازمی ـــــ پڑھنے، لکھنے، سمجھنے اور بولنے کی مہارتیں

عربی: تیسری جماعت سے آغاز___ پڑھنے اور سمجھنے کی مہارتوں پر توجہ

۳۔حساب

۴۔روزمرہ سائنس، خصوصاً حفظان صحت، زراعت وغیرہ

۵۔معاشرتی علوم

۶۔کھیل/ ورزش

۷۔آرٹ/ ڈرائنگ

۸۔ہوم اکنامکس/ گھرداری (طالبات کے لیے)

۹۔عملی کام/ فنی تعلیم (جو روزگار میں مفید ہوسکے)

۱۰۔تربیت

نوٹ: اس سطح پر ہر سال امتحان ہوگا، نمبر لگیں گے لیکن کسی طالب علم کو فیل قرار دے کر اگلی کلاس سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ البتہ چھٹی جماعت میں داخلہ اسے ہی ملے گا جس نے پانچویں جماعت کا امتحان پاس کیا ہو۔

مڈل (متوسطہ)

داخلے کی عمر: ۱۱ سال دورانیہ: ۳ سال ذریعہ تعلیم: اردو

مقاصد

تخصیصی تعلیم کے آغاز کے ساتھ علمی مہارتوں کے حصول کا جاری رکھنا تا کہ طلبہ اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد:

☆ مزید تعلیم جاری رکھ سکیں ☆ عملی زندگی کا آغاز کرسکیں

نوٹ: ہر تعلیمی سطح کے جامع مقاصد فنی انداز میں لکھنا یہاں پیش نظر نہیں، اس لیے کہیں کہیں اہم چیزیں درج کر دی گئی ہیں:

(حصہ لازمی)

☆ دینی تعلیم

☆ ترجمہ قرآن پندرہ پارے (بشمول آخری پارہ)۔
☆ بعض اہم سورتیں یاد کرنا جیسے یٰس ، الملک، الحشر اور البقرہ کے آخری رکوع وغیرہ۔
☆ ہر سال عقائد، عبادات، اخلاق و آداب اور معاملات سے متعلق چالیس احادیث ۔
☆ سیرۃ النبیؐ اور صحابہؓ کے حالات زندگی، آسان اور دلچسپ پیرائے میں ۔
☆ اسلامیات میں دیگر چیزوں کے علاوہ نماز، روزے، زکوٰۃ، حج، عائلی زندگی اور اخلاق و معاملات کے بارے میں

تفصیلی معلومات

زبانیں

☆ اردو

☆ عربی: قرآنی ذخیرہ الفاظ پر مبنی، طریق مباشر (ٹی وی وغیرہ) سے تدریس۔

حساب

☆ روزمرہ سائنس

☆ معاشرتی علوم (جغرافیہ، تاریخ، شہریت، عمرانیات، مطالعہ پاکستان)

کھیل/ ورزش

تربیت

گھرداری/ ہوم اکنامکس (برائے طالبات)

حصہ/ اختیاری

ذیل میں سے کوئی دو مضامین

ا۔ انگریزی، عربی ایڈوانس۔ سائنس ایڈوانس۔ زراعت۔ فنی تربیت/ اپرنٹس شپ (بجلی کا کام/ موٹر مکینک/ مقامی کاٹیج انڈسٹری)۔

۲۔ حفظ قرآن

☆ جو بچے قرآن مجید حفظ کریں گے وہ ساتھ اردو، عربی اور اسلامیات کم ترکیز

(Low Weightage) کے ساتھ پڑھیں گے اور درجات متوسطہ کے نصاب کی تکمیل کر کے ثانوی میں داخلہ لیں گے۔

☆ دینی مدارس کو اجازت ہوگی کہ وہ حفظ اور درجہ متوسطہ کے نصاب کی تکمیل کرائیں جس کے بعد طلبہ ثانوی میں داخلہ لے کر تعلیم کے مرکزی دھارے میں شامل ہو جائیں گے۔

ثانوی (سیکنڈری و ہائر سیکنڈری)

داخلہ کی عمر: ۱۴ سال دورانیہ: ۴ سال ذریعہ تعلیم: اردو

نصاب (حصہ لازمی)

۱۔ دینی تعلیم

☆ ترجمہ قرآن، پارہ ۱۵ تا ۲۹۔

☆ ہر سال کی اربعین۔

☆ سیرۃ النبیؐ اور صحابہ کرامؓ کے حالات زندگی۔

☆ اسلامیات: موجودہ نصاب میں اضافے خصوصاً اسلام بطور نظام زندگی اور فقہی معلومات (جدید تناظر میں)

۲۔ زبانیں ☆ اردو ☆ عربی

۳۔ معاشرتی علوم: (بشمول مطالعہ پاکستان و تاریخ امت) ۴۔ جنرل ریاضی ۵۔ روزمرہ سائنس ۶۔ کھیل/ ورزش ۷۔ گھر داری/ ہوم اکنامکس (برائے طالبات) ۸۔ کمپیوٹر ۹۔ تربیت

(حصہ اختیاری)

☆ انگریزی/ فارسی

☆ علوم اسلامیہ گروپ: عربی ایڈوانس۔ اسلامیات ایڈوانس

☆ سائنس گروپ: میڈیکل/ نان میڈیکل

☆ تجارت گروپ

☆انتظامیات گروپ

☆ آرٹس گروپ

☆فنی تربیت گروپ: الیکٹرونکس۔کمپیوٹر

گریجویشن (عالیہ):

داخلے کی عمر:۱۸سال دورانیہ:۴سال ذریعہ تعلیم:اردو

ماسٹرز (عالمیہ):

داخلے کی عمر:۲۲سال دورانیہ:۲سال ذریعہ تعلیم:اردو

سائنسی مضامین کے لیے: انگریزی ☆برائے علوم عربیہ واسلامیہ: عربی

(حصہ لازمی) تخصص گروپ

☆اسلامیات ☆مطالعہ پاکستان بشمول تاریخ امت

☆طریق تحقیق (برائے ایم اے) ☆تربیت

(حصہ اختیاری)

☆انگریزی/ فارسی/ چینی/ روسی/ فرانسیسی/ جرمن/ پشتو/ ہندی (برائے گریجوایشن)

☆علوم اسلامیہ گروپ ☆ آرٹس گروپ

☆انفارمیشن ٹیکنالوجی گروپ ☆میڈیکل

☆انجینئرنگ گروپ ☆ٹیکسٹائل گروپ

☆زراعت گروپ ☆سائنس گروپ

☆تجارت گروپ ☆انتظامیات گروپ

سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی بہتر تفہیم کے لیے کچھ وضاحتیں ضروری ہیں۔

مدارجِ تعلیم

اس ضمن میں ہم نے صرف ایک تبدیلی تجویز کی ہے اور وہ یہ کہ ثانوی تعلیم کو بارہ سال کا قرار دے کر گریجویشن کو چار سال کر دیا ہے کیونکہ دنیا کے اکثر مما لک میں اس وقت ایسا

ہی ہو رہا ہے اور ہمارے جو طلبہ باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے جاتے ہیں، انہیں وہاں پر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پھر حکومت پاکستان بھی بی اے کو چار سالہ کرنے پر غور کر رہی ہے اور جہاں تک پرفیشل ڈگریوں کا تعلق ہے جیسے میڈیکل، انجینئرنگ، کمپیوٹر سائنس وغیرہ تو کئی اداروں نے ان میں پہلے ہی گریجویشن چار سال کر دی ہے۔

دینی تعلیم

ثانوی تعلیم کے چھ سالہ علوم اسلامیہ (چار سالہ گریجوایشن اور دو سالہ ماسٹرز) پروگرام کالجوں یونیورسٹیوں کے علاوہ دینی مدارس میں بھی پڑھایا جا سکے گا، تاہم نصاب دونوں جگہ کا ایک ہوگا۔

۲۔ چار سالہ گریجویشن میں قرآن، حدیث، فقہ، عربی وغیرہ اسلامی علوم پڑھائے جائیں گے جب کہ ماسٹرز میں ایک مضمون (مثلاً علوم القرآن) میں تخصص ہوگا۔

۳۔ علوم اسلامیہ گروپ کے طلبہ کو گریجوایشن کے بعد آرٹس کے مضامین مثلاً معاشیات، سیاسیات، فلسفہ، تاریخ وغیرہ اور زبانوں مثلاً اردو، عربی، انگریزی وغیرہ میں ایم اے کرنے کی اجازت ہوگی۔ مذکورہ سماجی علوم (مثلاً معاشیات، سیاسیات وغیرہ) کے نصاب میں کم از کم پچاس فیصد مواد اسلامی پہلوؤں پر مشتمل ہوگا۔

۴۔ لازمی مضامین میں تربیت اور مطالعہ پاکستان اور اختیاری مضامین میں سے انگریزی علوم اسلامیہ میں گریجوایشن کے نصاب کا حصہ ہوگی۔

۵۔ علوم اسلامیہ کا نصاب ایک ہوگا البتہ کتب مختلف ہوسکتی ہیں (جہاں ناگزیر ہو وہاں شیعہ نصاب اور کتب مختلف ہوسکتی ہیں)۔ اساسی کتب کے علاوہ جدید کتب بھی نصاب کا حصہ ہوں گی۔ موضوعات میں عصری تناظر اور جدید مسائل کو بھی سامنے رکھا جائے گا۔ عربی زبان کی تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ چاروں مہارتیں حاصل ہوں۔ فقہ واصول فقہ اور ادیان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے گا۔ امت کی تاریخ و جغرافیہ اور دعوت کے اصول و اسالیب بھی شامل ہوں۔ اس طرح کا متفقہ نصاب تیار کرنا مشکل ضرور نا ممکن نہیں (ہم اس سے پہلے چار وفاقوں کے لیے متفقہ نصابی سفارشات تیار کر کے اور علماء کرام سے اس کی

منظوری لے کر اس کا عملی تجربہ کر چکے ہیں)

۶۔ مدارس کے گریجوایشن (عالیہ) اور ماسٹرز (عالمیہ) کے امتحان بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد لے سکتی ہے اور حکومت کی منظور شدہ ڈگری جاری کر سکتی ہے یا موجودہ دینی وفاقوں کو ملا کر ایک یونیورسٹی کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن مقامی یونیورسٹیوں میں علوم اسلامیہ کا شعبہ ہو، انہیں مدارس کے طلبہ کا امتحان لینے اور ڈگری جاری کرنے کا اختیار دے دیا جائے تا کہ کسی ایک مرکزی ادارے کے ذریعے سارے ملک میں امتحان لینے کی انتظامی پیچیدگیوں سے بچا جا سکے۔

۷۔ ملازمتوں کے لیے ثانوی، بی اے اور متعلقہ مضامین میں ایم اے کے حوالے سے دینی مدارس کے طلبہ اور کالجوں یونیورسٹیوں کے طلبہ ہر لحاظ سے مساوی ہوں گے۔

۸۔ ثانوی تعلیم کے بعد دوسالہ خصوصی ڈپلومہ کرایا جائے جس میں تجوید، عربی زبان، روزمرہ کے مسائل وغیرہ پر زور ہو۔ اس ڈپلومے کے حامل مساجد میں امام مقرر ہوسکیں گے، بچوں کو قرآن کی تعلیم (حفظ و ناظرہ) دے سکیں گے۔ کالجوں میں اسلامیات کے شعبے اور دینی مدارس اس ڈپلومے کی تعلیم دے سکتے ہیں۔

۹۔ پروفیشنل ڈگریوں (جیسے میڈیکل، ، انجینئرنگ وغیرہ) میں بھی اسلامیات اور تربیت لازمی ہوں گی اور ان کی ذہنی سطح کے مطابق اسلامی تعلیم اور اسلامی تربیت کا اہتمام ہوگا تا کہ مسلمان ڈاکٹر اور مسلمان انجینئر تیار ہوسکیں۔

اعلیٰ تعلیم

☆ ایم فل اور پی ایچ ڈی کی تحقیقی ڈگریاں موجودہ صورت میں جاری رہیں گی۔

☆ اسلامیات، طرق تحقیق اور تربیت کے پرچے سب طلبہ کے لیے لازمی ہوں گے۔

☆ دینی مدارس سے ایم اے کرنے والے طلبہ ایم فل اور پی ایچ ڈی میں داخلے کے حوالے سے دوسرے طلبہ کے ہر لحاظ سے مساوی سمجھے جائیں گے۔

☆ وہ بڑے دینی مدارس جن میں موزوں عمارت، لائبریری اور اساتذہ وغیرہ موجود ہوں انہیں حکومت دوسرے تعلیمی اداروں کی طرح ڈگری جاری کرنے کا اختیار دے گی اور

وہ اسلامی علوم میں گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ ڈگریاں جاری رکھ سکیں گے۔

تربیت اساتذہ

☆ مجوزہ بالا تعلیمی اسکیم کے تناظر میں اساتذہ کی تربیت ضروری ہے تاکہ وہ شعوری طور پر ثنویت کے نقصانات سے آگاہ ہو سکیں اور اپنے طلبہ کو اس کے نقصانات سے بچا سکیں۔

☆ خود اچھا مسلمان کیسے بنا جائے اور طلبہ کو اچھا مسلمان کیسے بنایا جائے؟ یہ بات تربیت اساتذہ کے ہمارے موجودہ اداروں کے نصاب کا جزو ہی نہیں، جب کہ اسلامی نقطہ نظر سے یہی تربیت اساتذہ کا بنیادی ترین موضوع ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی اساتذہ کی تربیت ضروری ہے تاکہ ان کے اندر یہ احساس ابھر سکے کہ وہ معلم ہی نہیں مربی بھی ہیں۔

نصاب سازی

☆ مندرجہ بالا اسکیم کے مطابق نئے نصابات تیار کرنا ہوں گے اور نئی نصابی کتب لکھنا ہوں گی۔ نہ صرف دینی مدارس، سکولوں اور کالجوں کے لیے بلکہ یونیورسٹیوں کے لیے بھی میٹریل تیار کرنا ہوگا۔ اسلامی ورلڈ ویو اور اسلامی تصور علم کے مطابق علوم کی اسلامی تشکیل نو کا یہ کام بہت اہم بھی ہے اور چیلنج بھی۔

☆ اس کام میں کوئی حکومت ہاتھ نہیں بٹائے گی اور نہ ہی یہ کام فوری طور پر مارکیٹ میں منافع بخش ہو سکتا ہے اس لیے اسلامی نظام تعلیم اور اصلاح تعلیم کے اداروں اور تنظیموں کو اس کام کے لیے بھرپور جدوجہد کرنا پڑے گی۔

☆ اس بات کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے کہ تہذیبوں کی شکست و فتح کا مدار فکر پر ہوتا ہے لہٰذا مغربی تہذیب کی عظمت کے جعلی رعب کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی فکر کی عظمت کو علوم اور نصاب میں مبرہن کیا جائے اور مغربی فکر کا بودا پن نسل نو پر واضح کیا جائے تاکہ اسلامی فکر کے قابل عمل ہونے بلکہ انسانی مسائل کے لیے واحد موزوں حل ہونے پر ان کا ایمان مستحکم ہو جائے، اپنے ماضی پر انہیں فخر ہو اور مستقبل انہیں اپنی مٹھی میں نظر آئے۔

تربیت طلبہ

☆ تربیت تعلیم کی غایت ہے لہٰذا وہ تدریس سے اہم تر ہے۔ اس اہمیت کا احساس دلانے کے لیے ہر کلاس میں نصیحت کا سو نمبر کا ایک لازمی پرچہ ہوگا جس میں ہر بچے کے نمبر لگیں گے۔ اس سے تعلیمی ادارے اور استاذ کو یہ احساس رہے گا کہ طلبہ کی تربیت اس کی ذمہ داری ہے۔

☆ ہر تعلیمی مرحلے کا ایک تعلیمی نصاب ہوگا۔ ہم نے اپنی کتاب، **''تعلیمی ادارے اور کردار سازی''، اور ''بروشر طلبہ کی اسلامی تربیت کیوں اور کیسے؟''** میں اس نصاب کے لیے ابتدائی تجاویز دی ہیں جنہیں اہل علم کے مشورے سے فائنل کیا جا سکتا ہے۔

☆ اسلامی تربیت کی جانچ کا بھی ایک نظام ہونا چاہیے۔

مجوزہ تعلیمی اسکیم پر عمل درآمد

۱۔ اس طرح کے کسی منصوبے پر عمل درآمد کے لیے پاکستان میں میں جس طرح کی نظریاتی حکومت کی ضرورت ہے، اس کے برسر اقتدار آنے کے مستقبل قریب میں کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔ بگڑی ہوئی فکر اور غیر اسلامی تربیت پائے ہوئے افراد اور ان افراد پر مشتمل حکومتی اداروں سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ اس قسم کا نظام تعلیم وجود میں لانے کی کوشش کریں گے۔ تاہم اتمام حجت کے لیے کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۲۔ یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دینی مدارس اگر آج تک حکومت پاکستان کے ان مقتدر سیکولر عناصر کی مزاحمت نہ کرتے جو اسلام دشمن غیر ملکی قوتوں کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتے ہیں تو دینی تعلیم کا جیسا کیسا نظام بھی وہ چلا رہے ہیں وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ لہٰذا اہل مدارس کے اس مؤقف میں وزن ہے کہ ان کے نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی ان کی مشاورت اور رضامندی کے بغیر نہ کی جائے۔ لہٰذا اس طرح کی کسی

تجویز پر عمل درآمد کے لیے ضروری ہے کہ اسے دینی مدارس کے اہل حل وعقد کے سامنے پیش کیا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ دینی مدارس کے فہیم عناصر اس کی حمایت کریں گے کیونکہ ان کے اکثر عناصر کو حالات کی سنگینی اور عصری تقاضوں کا بخوبی احساس ہے۔ یہ بات ہم علماء کے ساتھ کام کرنے کے بعد اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اس 'اندرونی تبدیلی' کی فضا کو مستحکم بنانے کے لیے مزید اصلاحی کوششوں کی ضرورت ہے۔

۳۔ پرائیویٹ سیکٹر اس وقت پاکستان میں تعلیم کی ترقی اور تنزل میں اہم کردار ادا کر رہا ہے لہٰذا دینی ذہن رکھنے والے لوگ جو اس وقت جدید تعلیم کے شعبے میں کام کر رہے ہیں، انہیں خدا کا خوف کرنا چاہیے اور کمرشلزم اور مادہ پرستی کی دوڑ سے نکل کر انہیں اصلاح تعلیم کی طرف آنا چاہیے۔ اس طرح اہل مدارس کو بھی اپنی تنگنائے سے باہر آنا چاہیے۔ ثنویت کے خاتمے کے لیے ان اصحاب کے سامنے کرنے کے دو کام ہیں۔

۵۔ ایک تو یہ کہ سکول سے لے کر یونیورسٹی سطح تک کا ایک رول ماڈل تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس میں مذکورہ بالا خطوط پر دینی اور دنیاوی علوم کی یکجا تدریس اور تربیت کا انتظام ہوتا کہ دوسرے ادارے اس کی پیروی کر سکیں کیونکہ اس وقت ثنویت کے خاتمے کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں جدید تعلیمی ادارے علی گڑھ اور دینی مدارس دیوبند کے رول ماڈل کی پیروی کرنے پر فکری لحاظ سے مجبور ہیں کیونکہ کسی کے سامنے عدم ثنویت پر مبنی کوئی تیسرا رول ماڈل موجود ہی نہیں۔ لہٰذا کوئی شریف اور نیک آدمی آج بھی دنیاوی یا دینی تعلیم کے شعبے میں خدمت اور جذبے سے کام کرنا چاہے تو وہ ان دو رول ماڈلوں سے باہر نہیں نکل پاتا۔ اس لیے تیسرے تعلیمی رول ماڈل کا قیام بالکل ناگزیر اور انتہائی اہم ہے۔

۶۔ دوسرا یہ کہ دینی مدارس چلانے والے جن علماء کرام اور سکول کالج چلانے والے جن دینی ذہن رکھنے والے افراد کو تعلیمی ثنویت کے مضر اثرات کا احساس ہے، انہیں چاہیے کہ اپنے تعلیمی اداروں میں، مندرجہ بالا خطوط پر اصلاح کی بھرپور کوشش کریں۔

اسلامی نظام تعلیم اور اصلاح تعلیم کی علمبردار تنظیموں اور اداروں کا بھی فرض ہے کہ وہ تعلیمی شعبے کو ثنویت کے مضر اثرات سے آگاہ کریں اور انہیں ثنویت کے خاتمے پر ابھاریں۔ اور اس کی عملی مشکلات پر صبر اور حکمت سے قابو پانے کی کوشش کریں۔ دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کے نظام تدریس اور امتحانات وغیرہ میں بھی فرق ہے لہٰذا مشکلات آئیں گی لیکن اگر منزل واضح ہو اور منزل تک پہنچنے کا عزم راسخ ہو تو رکاوٹیں انسان کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ ان اقدامات سے توقع ہے کہ ثنویت کے خاتمے کا راستہ کھلے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہم نے درج بالا تمام تر تحریر ڈاکٹر محمد امین صاحب کے مقالے سے نقل کی ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ ارباب علم و دانش نے ان تمام تر مشکلات (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے) کے علم الرغم جو لائحہ عمل تجویز کیا ہے، اس پر عمل کرنے سے ایسے نتائج کا حصول ممکن ہے۔

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مرد مومن ہے، خدا کے رازدانوں میں!

انقلابی نظامِ تعلیم کا مختصر خاکہ

اشتیاق احمد

درج ذیل مضمون ایک اخبار The Education کے supplement کا تراشہ ہے جو نومبر 2017ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم و تحقیق کی بین الاقوامی کانفرنس Institute of Education Research (IER) کے موقع پر شرکائے کانفرنس میں تقسیم کیا گیا تھا۔اس کے مصنف ایک بہت ہی دردمند دل رکھنے والے ماہر تعلیم (گزشتہ 50 سالوں میں بیوروکریسی اور سرکاری تعلیمی شعبے میں ماہرین تعلیم کے برعکس) اور تعلیم و تدریس کا عملی تجربہ رکھنے والی شخصیت جناب اشتیاق احمد صاحب ہیں جو تحصیل جہانیاں ضلع خانیوال کے ایک دور دراز گاؤں (135/10-R) میں بطور سینئر ماہر مضمون (فزکس/طبیعات) تعینات ہیں۔موصوف نے نہ صرف یہ مقالہ تحریر کیا ہے بلکہ اپنے ذاتی خرچ پر الگ کتابچہ (پرنٹنگ/کاغذ کی کوالٹی سے پتہ چلتا ہے) بھی شائع کیا ہے جس کا عنوان **''وزیر اعلیٰ کا پروگرام برائے تعلیمی اصلاحات یا نصابی دہشت گردی''** ہے۔اس کتابچے سے بھی چند اقتباسات ذیل کے صفحات میں درج کیے جا رہے ہیں۔تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ تنظیم اساتذہ پاکستان یا کوئی دوسرا ادارہ اسے بڑی تعداد میں عمدہ پرنٹنگ کے ساتھ شائع کر کے اسے پاکستان کے اساتذہ اور دیگر پڑھے لکھے حضرات نیز اخبارات/رسائل کو بھیجیں۔انہوں نے کتابچے میں جن ہوشربا تاہم مبنی برحقائق اعداد و شمار اور دلائل سے بات کی ہے،ہمیں یقین ہے کہ **پنجاب کی تمام بیوروکریسی میں شاید ہی کوئی ایسا ''پڑھا لکھا شخص''** موجود ہو جو اس طرح دلائل کی زبان میں گفتگو کر سکتا ہو البتہ کسی سیکشن آفیسر یا ڈپٹی سیکرٹری کی تحریر پر ''صاحب بہادر'' نے مہر تصدیق ثبت کر کے ''حلال روزی/رزق'' کمانے کا اہتمام خاص کر لیا ہو تو وہ ایک علیحدہ بات ہے۔ہم معذرت خواہ ہیں کہ

اپنے موضوع سے کسی حد تک دور چلے گئے۔ تاہم ملک وملت کے ساتھ جس قدر ظالمانہ سلوک تعلیمی میدان میں گزشتہ ۰ ۷ سالوں (1947 سے لے کر 2020 تک) روا رکھا گیا ہے اس پر جس قدر ماتم بھی کیا جائے کم ہے۔ موصوف نے لکھا کہ

''انقلابی نظام تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ایسا تعلیمی نظام جو انفرادی اور اجتماعی طور پر افراد کی تربیت کرے، انہیں اچھا مسلمان اور محب وطن شہری بنانے کے ساتھ ساتھ وہ قوم پر تحقیق، تخلیق اور ایجادات کے دروازے کھولے۔ قوم کو ہر لحاظ سے خود کفیل بنائے۔''

آیئے ایسے انقلابی نظام تعلیم کا مختصر خاکہ ملاحظہ فرمایئے۔ یہ نظام پہلی جماعت سے پی ایچ ڈی تک کے مختلف مراحل پر مشتمل ہے۔

پہلی سے پانچویں جماعت

پہلی سے پانچویں جماعت تک صرف دو کتابیں ہوں۔ پہلی اردو اور دوسری ریاضی کی۔ سائنس، معاشرتی علوم، اسلامیات، جغرافیہ اور دیگر علوم کی بابت مضامین سادہ اور آسان پیرائے میں اردو کی کتاب میں ہی ہوں۔ اس کے علاوہ ریاضی کی کتاب میں جمع تفریق اور ضرب تقسیم کی بنیادی مہارتیں اور روزمرہ کی پیمائشیں وغیرہ ہوں۔ املا اور ریاضی کی مہارتوں کو پختہ کرنے کے لیے تختی اور سلیٹ کا استعمال لازمی ہو۔ بھاری بھرکم کاپیوں، بستوں اور پنسلوں کا بوجھ صرف اشرافیہ کے چونچلے ہیں اور مفت تعلیم میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔

چھٹی سے آٹھویں جماعت

چھٹی سے آٹھویں جماعت تک اردو اور ریاضی کے ساتھ ایک تیسری کتاب سائنس کی ہو۔ سائنس کی یہ کتاب ماحول سے مربوط سائنسی تصورات پر مشتمل ہو۔ انسانیات، حیوانیات و نباتات کا علم ماحول اور تہذیب و ثقافت سے مربوط، سادہ اور آسان اصطلاحات میں ہو۔ انگریزی یا کوئی دوسری زبان لازمی طور پر نافذ نہ کی جائے۔

نہم سے دہم

نہم و دہم میں اردو اور ریاضی کی لازمی حیثیت کے ساتھ طبعیات، کیمیا، حیاتیات اور

کمپیوٹر کے آسان فہم کورسز پڑھائے جائیں۔ ان تمام کورسز کا معیار ترقی یافتہ ممالک کے برابر ہو۔ ان مضامین کے ساتھ آرٹس کے تمام مضامین بھی شامل ہوں۔ طالب علموں کو مختلف زبانیں پڑھنے کی بھی اجازت ہوگی مگر اختیاری حیثیت سے۔ **پہلی جماعت سے میٹرک تک کے اس نصابی خاکے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوگی کہ پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں کی کل تعداد کا کم از کم ۸۰ سے ۹۰ فی صد حصہ بلا کسی رکاوٹ کے میٹرک پاس کر جائے گا** جبکہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ **پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں کی کل تعداد کا صرف ۱۰ فی صد حصہ میٹرک کر پاتا ہے۔ باقی ۹۰ فی صد انگریزی میں الجھ کر تعلیم کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔**

گیارہویں سے بارہویں

گیارہویں اور بارہویں جماعت میں اردو، اسلامیات، مطالعہ پاکستان کی لازمی حیثیت کے ساتھ تمام تر سائنسی اور غیر سائنسی مضامین اردو میں ہی پڑھائے جائیں جیسا کہ پاکستان کے صوبہ سندھ میں سندھی اور اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے لیے بھارت میں چھپنے والی سائنسی مضامین کی تمام کتابیں ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں جو کہ Ncertbooks.com پر دستیاب ہیں۔ انٹرمیڈیٹ میں بھی طالب علموں کو تمام تر مضامین قومی زبان میں ہی پڑھائے جائیں، یہاں بھی دیگر زبانیں اختیاری طور پر پڑھانے کے انتظامات ہوں۔

بی ایس سی اور ایم ایس سی

بی ایس سی اور ایم ایس سی کے تمام تر کورسز فوری طور پر اردو میں تیار کیے جائیں۔ زیادہ تر کورسز اردو یونیورسٹی کراچی اور مولانا ابوالکلام آزاد یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے پہلے سے ہی تیار کیے ہوئے ہیں جنہیں ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں رائج ہونے کے لیے قوت نافذہ کا انتظار ہے۔ جو کورسز بچ گئے ہیں انہیں بھی جلد از جلد ترجموں کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ پہلے پانچ سالوں میں ہر مضمون کا امتحان اردو میں دینے کی اجازت دی جائے۔

اس سے خودبخود ہر سطح کے نصاب ترجمہ ہونا شروع ہوجائے گا۔قرین قیاس ہے کہ سب سے پہلے ایم بی بی ایس کے نصاب کا ترجمہ کیا جائے۔

یونیورسٹیوں میں دارالترجمہ کا قیام

ہر یونیورسٹی میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی طرز کا دارالترجمہ قائم کیا جائے جہاں ایم فل اور پی ایچ ڈی مقالہ جات کے ساتھ ساتھ دیگر تصنیف و اشاعت کا ہدف مقرر کیا جائے۔۱۰ سالوں میں یونیورسٹیوں کی لائبریریاں ہمارے اپنے لوگوں کی اپنی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں سے بھر جائیں گی۔اس طرح خودانحصاری اور تحقیق وتخلیق کی وہ دولت ہاتھ آئے گی جس کے طفیل پہلی جماعت میں داخل ہونے والے بچوں کا ۶۰ سے ۷۰ فی صد حصہ ماسٹر ڈگری کا حامل ہوگا اور ایجادات کے صدیوں سے بند دروازے کھل جائیں گے۔ ذرا **موجودہ صورت حال دیکھئے کہ ہمارے بچوں کا محض ایک فی صد حصہ بھی بی اے، بی ایس سی نہیں کر پاتا۔** راستے میں تعلیم سے دلبرداشتہ ہوکر جو وسائل ضائع ہوتے ہیں وہ تو کسی حد وحساب میں نہیں ہیں۔اس کے علاوہ ایم بی بی ایس اور ایم ایس سی وغیرہ میں ہمارے طلبا وطالبات اپنے کورسز کو صرف پانچ سے دس فی صد تک سمجھتے ہیں جبکہ باقی سارا رٹا ہوتا ہے۔ان اقدامات کی بدولت رٹنے کا عمل نہ صرف پانچ سے دس فی صد تک رہ جائے گا جبکہ ۹۰ سے ۹۵ فی صد تک نفس مضمون کا فہم ہوگا اور یہ ایک بڑے انقلاب کی صورت ہوگی!

ضلعی ترجمہ مراکز کا قیام

جامعات کے علاوہ ہر ضلع میں ایک ترجمہ مرکز قائم ہو جہاں دیگر زبانوں سے علوم و فنون منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ قومی اور علاقائی زبانوں کی ترقی کے لیے بھی کام کیا جائے۔ ان تمام ترجمہ مراکز کو ایک مرکزی دارالترجمہ سے کنٹرول کیا جائے اور ضروری رہنمائی و تربیت فراہم کی جائے۔دنیا میں موجود کسی بھی ملک نے یہ کام کیے بغیر ترقی نہیں کی۔

تحقیقی کام کی تشہیر اور دارالمطالعہ کا قیام

تمام جامعات اور اضلاع کی سطح پر کئے گئے تحقیقی کام کی ہر سال کسی مناسب جگہ پر

نمائش کی جائے اور بہترین محققین و مصنفین کو انعام واکرام اور دیگر مراعات سے نوازا جائے۔ شہروں کے علاوہ ہر گاؤں میں ایک دارالمطالعہ قائم کیا جائے جہاں مطالعہ کے شوقین نچلی سطح پر کتاب کو اپنی دسترس میں پائیں اور پڑھنے لکھنے کے ذوق کی آبیاری کا دائرہ وسیع ہو۔

تمام نصاب کی سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز پر منتقلی اور اس کی مفت تقسیم

پہلی جماعت سے ایم بی بی ایس اور ایم ایس سی تک کے تمام کورسز آسان فہم زبان میں سی ڈیز پر تیار کیے جائیں اور بازار میں عام سی ڈی یا ڈی وی ڈی کی صورت میں دستیاب ہوں۔ یہ تمام مواد مثالی اسباق کی صورت میں ہو جس سے علوم وفنون کا فہم آسان ہوگا **اور اس سے ٹیوشن کا مذموم کاروبار خود بخود دم توڑ جائے گا۔ رٹے کی بیماری ختم ہو جائے گی** اور اس کی جگہ فہم وابلاغ آ جائے گا۔ اس ضمن میں ملاحظہ فرمایئے ناچیز کی تیار کی ہوئی سینکڑوں ویڈیوز مثالی اسباق کی صورت میں Youtube پر جن کے پتے ishtiaqahmedish اور ishtiaqahmad1000 اور اس کے علاوہ tahqeeqotakhleeq blogspot.com پر ہزاروں گھنٹوں پر مشتمل اسباق شامل ہیں۔

تمام علوم وفنون کی اصلاحات کی تشریح

ملک میں فرہنگستان علم کے نام سے تمام علوم وفنون کی اصطلاحات اپنے ماحول و زبان اور ان کے تاریخی پس منظر کے اعتبار سے وضع کی جائیں اور ان کو عملاً نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ **یاد رہے کہ کوئی بھی قوم پہلے الفاظ واصطلاحات ایجاد کرتی ہے اور اس کے بعد آلات واشیاء۔** یہ ایک زبردست تخلیقی عمل ہے اس سے گزرنے والی قوم پر تخلیقات وایجادات کے دروازے بند ہو ہی نہیں سکتے۔

ہر ضلع میں یونیورسٹی اور میڈیکل کالج کا قیام

ہر ضلع میں ایک یونیورسٹی اور ایک میڈیکل کالج ہو۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں بچے اتنی بڑی تعداد میں ماسٹر ڈگری تک پہنچیں گے کہ ضلعی سطح پر قائم کردہ یہ ادارے کم پڑ جائیں گے اور انہیں تحصیل سطح پر لانا پڑے گا۔ **ضمناً عرض کرتا چلوں کہ ہمارے حکمران دانستہ**

طور پر اپنی عوام کو اَن پڑھ رکھ کر ان پر جاگیردارانہ اور وڈیرہ شاہی نظام مسلط کر رہے ہیں۔ یہ اصلاحات واحد ذریعہ ہیں ان سے پیچھا چھڑوانے کا۔

تعلیم مکمل حکومتی ذمہ داری

اصولی اور قانونی طور پر معاشرے کے افراد کو تعلیم فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ ریاست کے وزیر اور مشیر خود ہی اپنے اپنے سکول سسٹم کھول کر بیٹھ جائیں اور سامراجی مداخلت کے ساتھ اسے کمائی کا بڑا ذریعہ بنالیں تو ظاہر ہے کہ غریبوں کے لیے قائم کردہ سکول اور کالج خود بخود تباہ ہو جائیں گے۔ **ان تمام سیاسی مگرمچھوں کے تعلیمی اداروں کو بند کر دیا جائے اور ان کے بچوں کو غریبوں کے بچوں کے ساتھ پڑھنے کے لیے بٹھایا جائے تاکہ کبر و نخوت کے ان مجسموں کی گردنوں میں تنا ہوا سریہ نکل جائے اور وہ انسانیت کی سطح پر اتر کر اپنے اردگرد دیکھنا شروع کر دیں۔**

دینی مدارس میں بھی اصلاحات کا نفاذ

دینی مدارس کے نظام میں بھی اصلاحات لائی جائیں۔ دینی علوم کے ساتھ ساتھ سائنسی اور معاشرتی علوم بھی پڑھائے جائیں تاکہ وہاں سے فارغ التحصیل افراد عالم دین بننے کے ساتھ ساتھ مستند طبیب اور سائنسدان بھی بن سکیں۔ ہر بڑے مدرسہ میں ایک دارالترجمہ بھی قائم ہو۔ قرونِ وسطی کے تحقیقی مراکز اسی طرز پر قائم تھے۔

مساجد میں بھی تعلیم کا انتظام

مسجدوں کو بھی بچوں کو پڑھانے کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ سکولوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے صبح و شام کی کلاسیں بھی لگائی جاسکتی ہیں۔ نیت ٹھیک ہو تو بوہڑ، پیپل اور شیشم وغیرہ کے بڑے بڑے درختوں کے سایہ میں بھی بچوں کو بٹھا کر تعلیم دی جاسکتی ہے۔ فرنیچر ضروری نہیں، صفوں اور ٹاٹوں پر بیٹھ کر بچے آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ ٹاٹ سسٹم ختم کر کے فرنیچر کا شور مچانا ہمارے سیاسی شعبدہ بازوں اور کمیشن مافیا کی لوٹ مار کا ڈھونگ کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ جو لوگ روٹی کو ترستے ہیں انہیں ٹاٹوں پر بٹھا کر پڑھانا ممکن ہے۔ ہاں

پڑھ لکھ کر ترقی کرنے کے بعد وسائل کو یکساں تقسیم کر کے بہتری لائی جا سکتی ہے۔

مقابلے کے امتحانات کا اردو زبان میں انعقاد

تمام تر مقابلے کے امتحانات اردو میں لیے جائیں گے۔ اس سے موچی اور نائی (یہ پیشے بھی باقی پیشوں کی طرح قابل احترام ہیں) کا بیٹا بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو سکے گا۔ ان امتحانات کا انگلش میں لینا ملک کے 99 فی صد لوگوں کو آگے آنے سے روکنے کے مترادف ہے۔ **سپوکن انگلش اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے پاگل پن کو ختم کر کے ایسے ماہرین تیار کیے جائیں جو غیر ملکی زبانوں کے ماہر ہوں اور انہیں اپنی مادری زبان پر بھی اعلیٰ درجے کا عبور حاصل ہو۔** ان افراد کے ذمہ دوسری زبانوں کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں منتقل کرنا ہو اور وطن عزیز میں سب سے زیادہ تنخواہ تحقیق کاروں کو ہی دی جائے۔ وطن عزیز کا عدالتی نظام قومی اور صوبائی زبانوں میں ہو۔ اس سے انصاف کی فراہمی آسان اور سہل ہوگی۔ انگریزی میں لکھے ہوئے عدالتی فیصلے کی چٹھی پورے پورے گاؤں پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

اردو اور مقامی زبان میں تشہیری مہم

بازار میں مختلف قسم کے بینر اور اشتہاری بورڈ صرف اردو یا مقامی زبان میں لکھنے کی اجازت ہو تا کہ قومی زبان قومی تفاخر کا ذریعہ بنے۔

غیر ملکی امداد پر پابندی

غیر ملکی امداد پر ہر قیمت پر پابندی لگائی جائے کیونکہ غیر ملکی امداد ایسی پالیسیوں کے ساتھ مشروط ہوتی ہے جو بالآخر قوم کو جاہل اور ان پڑھ بنا دیتی ہے جیسا کہ پاکستان میں گزشتہ تمام پالیسی ساز اداروں کو جن میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ اور ڈائریکٹوریٹ آف سٹاف ڈیویلپمنٹ لاہور جیسے ادارے شامل ہیں ان کو سامراجیوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اداروں میں تبدیل کر دیا ہے۔

مسلم ممالک کے مشترکہ تعلیمی منصوبے

مسلم ممالک کے ساتھ مل کر مشترکہ تعلیمی منصوبے شروع کیے جائیں۔ایک دوسرے سے جدید ترین علوم وفنون کا تبادلہ کیا جائے۔تراجم کے کام میں خصوصاً باہمی تعاون کو فروغ دیا جائے اور امت مسلمہ کو جو تعلیم و تحقیق کے میدان میں چیلنجز کا سامنا ہے ان سے نمٹنے کی حکمت عملی وضع کی جائے۔

قرآن مجید کی ترجمے کے ساتھ پڑھائی

سب سے اہم بات یہ کہ قوم کو حقیقی اسلامی تہذیب سے روشناس کرانے اور ان میں بہترین اخلاقی اوصاف پیدا کرنے کے لیے چھٹی جماعت سے سولہویں جماعت تک مکمل قرآن مجید پڑھایا جائے۔اس سے فرقہ واریت کی جڑیں بھی خود بخود کھوکھلی ہو جائیں گی، اور اس سے قومی یکجہتی اور ایمان کی پختگی جیسی بے شمار، لازوال نعمتیں حاصل ہوں گی۔

حرف آخر:

صاحب مقالہ نے اپنی گفتگو کا خاتمہ یوں کیا:

''مذکورہ بالا اقدامات میں یقیناً مختلف زاویوں سے ترمیم و اضافہ اور بہتر تجاویز ممکن ہیں مگر یہ ناچیز پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ ان پر عمل کرنے سے پاکستان بیس سالوں میں سپر طاقت بن جائے گا **ورنہ جو کچھ تعلیمی نظام کے ساتھ ہو رہا ہے اس سے اس کے وجود کو بے شمار خطرات لاحق ہیں**۔اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور اسے انتہائی حد تک کمزور کرنے کے آثار وشواہد ہر طرف بکھرے پڑے نظر آتے ہیں۔دشمن نے یہ محاذ اس لیے چنا ہے کہ تمام سازشوں کو جانے والے راستے اسی سے ہو کر گذرتے ہیں۔آیئے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں اور حتیٰ المقدور وسائل اکٹھے کر کے اس وطن کو ترقی وخوشحالی کے بام عروج تک پہنچا دیں۔اللہ تعالیٰ ملک پاک کو سدا سلامت رکھے۔''

ہم نے گزشتہ صفحات میں اشتیاق احمد صاحب ایک کتابچہ بعنوان ''تعلیم تہذیب اور قومی زبان کا قتل عام''......ایک پر مغز مقالہ کا ذکر کیا ہے۔ٹائٹل کے دوسرے صفحے پر جلی

الفاظ میں لکھا ہے: **''وزیر اعلیٰ کا پروگرام برائے تعلیمی اصلاحات یا نصابی دہشت گردی۔''** اس کتابچے میں متعدد مضامین ''قومی زبان اردو پر نسل کش حملہ'' چھٹی آئی ہے۔ ''پنجاب کے تعلیمی نظام پر مائیکل باربر اور انجینئر کا قبضہ'' دانش ہے جس کا نام خلل ہے دماغ کا۔'' کمپیوٹر پر اردو میں تدریس سائنس کیسے؟ بھارت تعلیمی میدان میں ہم سے کیسے آگے نکل رہا ہے؟ خیبر پختونخواہ تحریک انصاف کی تعلیمی پالیسی کا مدفن۔ بھارت میں اردو کا فروغ، پاکستان میں زوال، ذریعہ تعلیم کا مسئلہ قرآن وحدیث کی روشنی میں۔فلموں کی طرح کتابوں کے ترجمے کیوں نہیں؟ اور شعبہ تعلیم میں حکومت کی آئینی خلاف ورزیاں اور کیا سائنس کا نصاب نیا ہے یا پرانا؟ (کل تیرہ (۱۳) موضوعات) ہیں۔ یہ تمام مضامین اس مقالے میں نقل کرنا تو ممکن نہیں تاہم ان میں سے چند اقتباسات کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات

ہمیں نہیں معلوم کہ یہ کتابچہ صاحبان اقتدار تک رسائی حاصل کر پایا یا نہیں اور یہ کہ اس کے مندرجات پر کسی قسم کا ردعمل گزشتہ حکومتی اداروں کی جانب سے آیا۔ تاہم اگر موجودہ وزیر تعلیم (اور وزیر اعظم پاکستان جناب عمران خان صاحب) کسی ایمان دار سیکرٹری سے گزشتہ مضمون اور اس کتابچے کا خلاصہ سن لیں تو مجھے یقین ہے کہ یہ امر ملک و ملت کے لیے مستقبل میں بہت بڑی بھلائی کا سبب بن سکتا ہے۔ چند چیدہ چیدہ اقتباسات ذیل میں درج ہیں:

کتابچے کی مصنف نے ''قومی زبان اردو پر نسل کش حملہ'' کے عنوان سے ۳۲ سوالات کیے ہیں اور ان تمام تعلیمی ماہرین کی علمی/تحقیقی اور ادبی قابلیت کا جس طریق پر پوسٹ مارٹم کیا ہے، جنھوں نے اقتدار کے بل پر اس ملک کے مستقبل کے نونہالوں کو نہ صرف اپنے دین اور علم وحکمت کے خزانوں سے بے بہرہ کر دیا بلکہ دنیاوی طور پر بھی ان کی ترقی کی راہوں کو مسدود کر کے رکھ دیا کہ **نہ انگریزی بولنے کی مہارت ہوگی، نہ وہ انگریزی میں اپنے ماضی الضمیر کو تحریری صورت میں لکھ سکیں گے اور یوں وہ ایک**

''گونگے بہرے''پی ایچ ڈی ہوں گے۔ پی ایچ ڈی کے کاغذی پرزے سے وہ اعلیٰ مناصب تو حاصل کر پائیں گے تاہم اپنے منصب کو برقرار رکھنے کے لیے جھوٹ/کرپشن اور گوروں/ نیم گوروں کے محتاج بھی ہوں گے کہ وہ انگریزی زبان میں تحریر وتقریر کی مہارت تامہ سے بہرہ مند نہیں ہوں گے۔

سکول اور کالج کی تعلیم (بالخصوص فزکس/کیمسٹری/ بائیولوجی) کے سلسلے میں انہوں نے متعدد مثالیں دے کر واضح کیا ہے کہ اردو میں نہ صرف ان تمام مضامین کی تعلیم با آسانی دی جاسکتی ہے بلکہ بچوں کے لیے انہیں سمجھنا، یادرکھنا، بیان کرنا نہ صرف آسان ہوتا ہے بلکہ سوچ بچار کے نتیجے میں بڑے ہوکر ان مبادیات واصولوں کی روشنی میں اپنی ذہانت اور قابلیت کی بناء پر پاکستان جیسے پسماندہ ملک کو ایٹمی طاقت بھی بنانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں!

اردو کو سائنسی مضامین کے لیے بطور زبان استعمال کرنے کے ضمن میں انہوں نے ایک سوال (سولہواں سوال) پوچھا ہے کہ'' پاکستان کے سکولوں میں پڑھائے جانے والے سائنس اساتذہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے لیکچراز، پروفیسرز سائنس پر کتابیں کیوں نہیں لکھتے؟''انہوں نے اس ضمن میں متعدد سوالات کرتے ہوئے پوچھا کہ:

☆.....کیا انگریز مصنّفین کی سائنس پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھانا ہمارے ڈاکٹروں/ پروفیسروں کی اہلیت وقابلیت پر سوالیہ نشان نہیں؟

☆......کیا یہ لوگ اپنے ہمسایہ ملک بھارت کی طرف نہیں دیکھتے جس میں تمام سطح کے سائنسی نصابات ان کے اپنے لوگوں نے قومی زبان میں نہ سہی مگر آسان انگریزی میں تحریر کیے ہیں؟ ہمارے نصابی ٹھیکیداروں کو تو یہ توفیق بھی نصیب نہیں ہوئی۔ **یہ تو مشکل زبان میں لکھی ہوئی کتاب کو اپنے ملک کے طلباو طالبات کے لیے معیاری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نصاب کو مشکل سے مشکل تر بنانا نصابی معیار قرار پاتا ہے؟**

اس ضمن میں اولیول، اے لیول کی درسی ونصابی کتب پر ہم نے اپنے تجزیہ میں ان سکولوں کے پرنسپل/ اساتذہ سے ایک سوال پوچھا ہے کہ کیا وہ تمام تر

مواد (بہت مشکل اور ۷۵ فی صد غیر ضروری) ایمانداری کے ساتھ سالانہ تعلیمی مدت (۱۸۰ دن) میں پڑھا سکتے ہیں؟ کسی ایک بھی ایماندار شخص کے لیے اس سوال کا مثبت میں جواب دینا ممکن نہیں!۔

اپنے اس فکر انگیز مقالے میں انہوں نے ''اردو اصطلاحات کے آسان ہونے کی وجہ'' کے عنوان سے اردو زبان میں اصطلاحات کے مشکل ہونے کے اعتراض کا بہت خوبصورت انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ آیئے ان کا استدلال مطالعہ کریں: ''اردو کی اصطلاحات اس لیے اجنبی اور مشکل محسوس ہوتی ہیں کیونکہ انہیں نصاب کے ذریعے رائج کر کے مستعمل نہیں بنایا گیا۔ اگر انہیں نصاب کے ذریعے رائج کر دیا جاتا تو ان کے زیر استعمال آنے کی وجہ سے ان کی اجنبیت ختم ہو جاتی۔'' مثال کے طور پر انہوں نے دو الفاظ کی وضاحت فرمائی: ''پاکستان اگر خود تھرمامیٹر تیار کرتا اور اس پر ''حرارت پیما'' لکھا ہوتا تو یہ لفظ بھی تھرمامیٹر کی جگہ زبان زد عام ہو جاتا۔ ہماری زبان و ثقافت کے اعتبار سے تھرمامیٹر اپنے معنی خود بخود واضح نہیں کرتا کیونکہ ''تھرما'' لاطینی زبان کے لفظ ''تھرماس'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی گرمی کے ہیں اور ''میٹر'' کا مطلب ہے پیمائش کرنے والا۔ اس لیے تھرمامیٹر اپنے معنی خود بخود نہیں دیتا **جب کہ حرارت پیما اپنے معنی خود ہی ظاہر کر دیتا ہے۔** اسی طرح کی ایک دوسری مثال لفظ ''توازن'' کی ہے۔ انہوں نے لکھا: **''توازن کا لفظ اس قدر مستعمل ہے کہ ان پڑھ بھی اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھتا ہے۔ مگر ایکوی لبریم بالکل غیر مستعمل اور اردو ادب میں اس کا کہیں بھی استعمال نہیں ہے۔** اب آپ ہی بتائیں کہ سائنس توازن کے ذریعے آسانی سے پڑھائی جا سکتی ہے یا ایکوی لبرم کے ذریعے؟'' یاد رہے کہ اس ضمن میں متعدد مثالیں بائیولوجی، کیمسٹری، حساب کے مضامین کی تدریس کے لیے انہوں نے دی ہیں۔

صاحب مقالہ نے ''سائنسی نصاب کی اس تبدیلی کو پاکستان پر ایٹم بم سے بھی بڑا حملہ تصور کیا ہے۔ ایٹم بم بنا کر قومیں سنبھل جاتی ہیں مگر نصابی بم ان کو صدیوں کے لیے مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے۔ اے اربابِ اختیار خدا کے لیے اتنا بڑا ظلم نہ کرو۔ اسے

آزادی کا درس دینے کی بجائے غلامی کی زنجیروں میں مت جکڑو۔ اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین مت کھینچو۔''

جیسا کہ ہم نے گزشتہ صفحات میں اشارہ کیا کہ صاحب کتاب نے مختلف موضوعات پر جو مقالہ جات تحریر کیے ہیں وہ اپنے حسن طباعت کے لحاظ سے فروتر ہیں (کہ ایک فرد لازماً اس دور میں کسی کتاب کی اشاعت کا بار اٹھانے کے قابل بھی نہیں) **تاہم مواد اور حسن معنی کا ایک بہت بڑا سمندر اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔** اس کتاب میں ایک ''مضمون'' بھارت تعلیمی میدان میں ہم سے کیسے آگے نکل رہا ہے'' **میں انہوں نے بھارت میں سائنسی علوم کی ترویج واشاعت کے بارے میں ایسی معلومات درج کی ہیں جو شاید ہمارے تعلیمی ماہرین، نیز ہائر ایجوکیشن کمشن ماہرین کی نظروں سے گزرے بھی نہ ہوں گے کجا یہ کہ اس ضمن میں انہوں نے کسی منصوبہ بندی کا سوچا بھی ہو۔**

ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ!

انہوں نے لکھا کہ ''بھارت جیسا ملک جو انگریزی کا شیدائی سمجھا جاتا تھا اس نے یکدم پلٹا کھایا ہے اور تمام علوم وفنون کو بھارت کی قومی زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کام میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی خاص ترجیح دی جارہی ہے۔''

اپنے مقالے میں انہوں نے متعدد اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے مختلف اداروں، منصوبوں، کتب اور اقدامات کا ذکر کیا ہے جس میں ''بھارت کی ایک ویب سائٹ کا ذکر ہے جہاں پہلی جماعت سے لے کر بارہویں جماعت تک بشمول سائنس کتب کے تمام مضامین کی کتب اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب تدریسی مواد کے ساتھ موجود ہیں جو کہ ہر شخص ڈاؤن لوڈ کر سکتا ہے۔''

''دہلی میں قائم ادارہ'' قومی کونسل برائے فروغِ اردو جو کہ **اعلیٰ تعلیمی کمیشن اور ''ادارہ برائے ترقی انسانی وسائل''** کے تحت کام کرتا ہے، نے اعلیٰ سطح تک کا نصاب اردو میں منتقل

کرنے، اس کے مطابق اساتذہ کو تربیت دینے اور سافٹ ویئر تیار کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔"
قومی کونسل برائے فروغ اردو کی ویب سائٹ urducouncil.nic.in.com پر ان کی نئی کتب کی فہرست موجود ہے جو مفت میں ڈاؤن لوڈ اور پرنٹ کی جا سکتی ہیں۔ ان میں بہت سی ادبی اردو کتب کے علاوہ جناب فضل الرحمن صاحب کا تین ضخیم جلدوں پر مشتمل اردو انسائیکلو پیڈیا، بی شیلا کماری کی تصویری اردو لغت، آٹھ جلدوں پر مشتمل قومی کونسل برائے اردو زبان کا تیار کردہ جامع اردو انسائیکلو پیڈیا، اردو کے مشہور نقاد جناب کلیم الدین کی تحریر کردہ چھ جلدوں میں جامع انگریزی اردو لغت جو خصوصاً ترجمے کے مقاصد کے لیے تیار کی گئی ہے جسے ایک بڑا کارنامے سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ جناب نصیر احمد خاں نے دو ضخیم جلدوں میں جدید ہندی اردو لغت تحریر کی ہے، قومی اردو کونسل کی فرہنگ ادبی اصطلاحات، فرہنگ اصطلاحاتِ طبیعات، فرہنگ اصطلاحاتِ انتظامیہ، فرہنگ اصطلاحات تاریخ و سیاسیات، فرہنگ اصطلاحاتِ جغرافیہ، فرہنگ اصطلاحاتِ حیوانات، فرہنگ اصطلاحاتِ ریاضیات ثانوی سطح کے لیے، فرہنگ اصطلاحاتِ ریاضیات، گریجوایٹ سطح کے لیے فرہنگ اصطلاحاتِ فلسفہ، نفسیات اور تعلیم اور ان کے علاوہ لسانیات، کیمیا، معاشیات، نباتات، سماجیات، ترسیل عامہ، سیاسیات، شماریات کی فرہنگ تیاری کی ہیں۔ ◆ لغاتِ ابجد شماری جناب سعید احمد کی، بی شیلا کماری اور ماہ جبیں نجم کی کتاب اردو زبان کا جادو، اور ان کے علاوہ کیمیا، طبیعات اور دوسرے سائنسی مضامین پر سینکڑوں کی تعداد میں کتب فہرست میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں بچوں کے سائنسی اور اخلاقی ادب کے حوالے سے بھی سینکڑوں کتب اس فہرست میں موجود ہیں۔ قومی کونسل برائے اردو کے پلیٹ فارم سے ملک کے مختلف شہروں اور صوبوں میں اردو صحافت کے بہت سے کورسز کروائے جا رہے ہیں۔ جون 2010ء میں دہلی سے شائع ہونے والے "اردو دنیا" کے شمارے کے پچھلے سرورق

◆ کسی زمانے میں مختلف علوم کی فرہنگ کی تیاری کا کام کراچی یونیورسٹی نے شروع کیا تھا۔ میجر آفتاب حسن اس کے انچارج تھے۔ نمعلوم اس پروگرام کا کیا حشر سیاست کے میدان کے "بھٹوؤں" اور "شریفین" کے ہاتھوں ہوا؟

(بیک ٹائٹل) پر کشمیر کے شاہ فیصل نامی ایک نوجوان کی تصویر ہے جو اردو مضامین کے ساتھ مقابلے کے امتحان (انڈین سول سروس) میں بھارت بھر میں اول آیا!''

اس ضمن میں صاحب مقالہ نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کا ذکر بھی کیا ہے جہاں 1917 سے 1948 تک ایم بی بی ایس سمیت تمام سائنسی علوم میں ایم ایس سی اردو میں ہوتی تھی۔ اب ان تمام مضامین کی کتابیں مطالعے اور ڈاؤن لوڈ کے لیے ڈیجیٹل لائبریری آف انڈیا کی ویب سائٹ www.dli.eannet پر دستیاب ہیں۔ میڈیکل سائنس میں علم تشریح الاعضاء (Anatomy) کی مشہور ترین کتاب (Gray's Anatomy) کا ترجمہ اردو میں ایک عرصہ سے پڑھایا جا رہا ہے۔ راقم کے پی ایچ ڈی سپروائزر مرحوم ڈاکٹر عبدالوہاب قریشی صاحب نے علم وراثت (Genetics) کی ایم ایس سی ڈگری اردو میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے حاصل کی تھی۔ بعد ازاں انہوں نے امریکہ سے پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کی اور زرعی یونیورسٹی میں تعلیم دینے کے بعد عالمی ادارۂ خوراک وزراعت (FAO) زیر یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن (UNO) میں خدمات سرانجام دے کر ریٹائر ہوئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

بھارت میں اردو زبان کو جو پذیرائی حاصل ہو رہی ہے اس کی ایک دوسری مثال صاحب مقالہ'' نے حیدر آباد شہر میں 1994ء میں قائم کردہ مولانا آزاد بین الاقوامی اردو یونیورسٹی کی دی ہے۔ اس یونیورسٹی میں سائنس کے تمام مضامین (حیاتیات، کیمیا، طبیعات، شماریات، ریاضی، کمپیوٹر سائنس وغیرہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد (فاصلاتی تعلیم) کی طرز پر بی ایس سی اردو زبان میں کامیابی کے ساتھ کرا رہی ہے اور ایم ایس سی کے کورسز بھی شروع کرنے والی ہے۔ مزید اس کے کیمپس برطانیہ اور جدہ میں بھی قائم ہو رہے ہیں۔ مزید برآں بھارت میں ہزاروں اردو میڈیم سکول کھل رہے ہیں جن میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد بھی داخلہ لے رہی ہے۔ سکول کی اسمبلی میں تین دن اردو اور تین دن انگریزی میں کرنے کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔'' اس ضمن میں انہوں نے پاکستانی شاعروں اور ادیبوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اردو کی ترویج کے لیے اقدامات کریں۔

باب یازدہم

یکساں نظامِ تعلیم: ایک نعرہ یا حقیقت؟

گزشتہ صفحات میں تعلیمی ثنویت اور اس کے بالمقابل یکساں نظام تعلیم کے موضوع پر متعدد اشارات کئے گئے ہیں۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں اس موضوع پر کی گئی موجودہ حکومت کے وزیر تعلیم کی ان تمام بھونڈی کوششوں کا ذکر کیا ہے جو وہ اپنی کلیر و کریسی اور لبرل طبقے کی مشاورت اور مدد سے کر رہے ہیں۔ نیز وہاں اس امر کا تذکرہ بھی کیا تھا کہ ان کی کاوشوں کے بارے میں، اس ملک کے متعدد مایہ ناز اہل علم، جن کی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے اور جو واقف درونِ میخانہ بھی ہیں، نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور مثبت انداز میں تجاویز دی ہیں، ان کی سربراہی میں ایک کمیشن بنایا جائے اور اس کام میں ان کی مشاورت پر بلا کسی غیر ملکی دباؤ، سیاست یا ذاتی پسند و ناپسند کے عمل کیا جائے ____ بیورو کریسی کا کام صرف ان کی مدد کرنا اور ان کی سفارشات کو عملی جامہ پہنانا ہو، تو توقع کی جا سکتی ہے کہ اس طریق پر اس ''مرضِ کہنہ'' کا علاج اس ''آبِ نشاط انگیز'' سے ہو جائے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی!

چار صدیوں سے ہند کے میخانوں کی بندش کا علاج ریاست مدینہ کے احیاء، اجرائے ریاست مدینہ کے فیضِ عالم تاب کے ذریعے ہی ممکن ہے ____ باقی جو کچھ ہے، سبھی کچھ سے بتانِ آذری!

ذیل میں اب ہم ان خیالات کا جائزہ لیں گے جو یکساں نظام تعلیم بارے ایسے چند اہل علم و دانش نے کیے ہیں کہ **جن کا اوڑھنا بچھونا بقول پطرس مرحوم ()** ''کتابیں ہی

ہمارا اوڑھنا اور کتابیں ہی ہمارا بچھونا ہیں''

اہل علم ودانش:

اغیار کی کوششوں کے علی الرغم جو گزشتہ دوصدیوں سے زائد عرصے پر محیط ہیں، مشیت ایزدی کے تحت امت مسلمہ کی خوش قسمتی ہے کہ ''جب بھی کسی جانب سے کوئی ایسا حملہ ہوتا ہے تو انسان کے جسم کی مدافعانہ قوتیں (Immune System) بھی بیدار ہو کر تیزی سے کام کرنے لگتی ہیں اور مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ جو اپنے اسلامی تشخص کے اعزاز سے آگاہ ہیں، وہ اس طوفان کے خلاف صف آرا ہونا شروع ہو جائیں گے''❶

''یکساں نظام تعلیم کے نام پر'' کے موضوع پر پروفیسر ملک محمد حسین کا ایک مقالہ وطن عزیز کے ایک موقر علمی و دینی رسالے ''ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن'' میں فروری ۲۰۲۰ء میں شائع ہوا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ

وفاقی حکومت نے پورے ملک میں یکساں نظامِ تعلیم اور یکساں نصاب تعلیم کے نفاذ کا اعلان کر رکھا ہے۔ اس ضمن میں مرکزی وزارتِ تعلیم نے پرائمری جماعتوں کے مجوزہ نصاب کا مسودہ جاری کیا ہے، جس کے مطابق:

☆ پہلی اور دوسری جماعت میں انگریزی، اردو، ریاضی اور معلومات عامہ (جنرل نالج) کے مضامین تجویز کیے گئے ہیں۔ جنرل نالج میں معاشرتی علوم، سائنس اور اسلامیات کی معلومات دی گئی ہیں۔

☆ تیسری جماعت میں انگریزی، اردو، ریاضی، معلومات عامہ اور اسلامیات کے مضامین تجویز کیے گئے ہیں۔

☆ چوتھی اور پانچویں جماعت میں انگریزی، اردو، ریاضی، سائنس، اسلامیات، معاشرتی،

---

❶ واضح رہے کہ یہ خیالات غلام اکبر خان (جو اسلام آباد سے نکلنے والے ایک اخبار کے چیف ایڈیٹر ہیں) نے اپنے ایک مقالے ''حملہ ہو چکا ہے'' شائع شدہ روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی مورخہ ۳ جنوری ۲۰۱۹ء میں کئے تھے۔ جو انہوں نے میڈیا بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے کردار پر تنقید کرتے ہوئے اسے ثقافتی حملہ (Cultural Attack) سے تعبیر کیا ہے!

علوم کے مضامین تجویز کیے گئے ہیں۔

نصابی تجاویز میں 'اقداری تعلیم'(Value Education) کے نام سے ایک علیحدہ نصابی کتابچہ فراہم کیا گیا ہے اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ مجوزہ قدریں (Values) سارے نصاب اور سارے مضامین میں اساسی فکر کے طور پر نصابی وجود میں پھیلی ہوں گی اور یہی قدریں طلبہ وطالبات کی شخصیت کا حصہ بنائی جائیں گی۔

'اقداری تعلیم' کے لیے سفارشات: صاحب مقالہ نے لکھا کہ ''نصاب کے باقی حصوں پر تبصرہ بعد میں کیا جائے گا پہلے 'اقداری تعلیم' (ویلیو ایجوکیشن) کو دیکھتے ہیں کیونکہ اس کی تفصیلات پہلی سے بارھویں جماعت تک دی گئی ہیں۔ حقیقتاً 'ویلیو ایجوکیشن' کا یہ کتابچہ حکومت کی نصابی پالیسی کی بنیاد ہے۔''

''اقداری تعلیم، معلوماتِ عامہ، معاشرتی علوم وغیرہ کی تفصیلات دیکھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ نصاب کی تشکیل ہیومنزم (Humanism) کے فلسفے کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ اقداری تعلیم میں جن اقدار کو طلبہ کی شخصیت اور ان کے فکر وخیال میں راسخ کرنے کا عزم کیا گیا ہے وہ اساسی اقدار حسب ذیل ہیں:

(۱) ہمدردی اور نگہداشت یا دیکھ بھال (۲) راست بازی اور امانت داری

(۳) ذمہ دارانہ شہریت۔

ذیلی اقدار میں جن قدروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

''اپنی ذات کے لیے ہمدردی، اپنوں اور دوسروں کی دیکھ بھال/نگہداشت، ماحول کے لیے ہمدردانہ دیکھ بھال، حفاظت اور سلامتی، سچائی، اعتباریت، انصاف، محنت، بہترین کی تلاش، بدعنوانی سے اجتناب، معاشرے کی تنظیم کا فہم، قانون، قواعد وضوابط کا احترام، باہمی اشتراک، اختلاف رائے کا احترام، برداشت، امن اور سماجی ربط، جمہوری اقدار، انسانی حقوق، مقامی اور عالمی شہریت، حفظان صحت کی تعلیم، جنسی مساوات، شہری برابری، وابستہ بہ شمار (ڈیجیٹل) شہری، سائبر رہبری وغیرہ کا فہم''۔

''بیان کیا گیا ہے کہ یہ اقدار نظامِ عقائد (Belief System) کی وضاحت کرتی

ہیں کہ ایسا نظامِ عقائد جو ہمارے رویوں، فکر و تدبر اور اعمال کی تشکیل کرتا ہے۔ یہ اقدار ہمیں اس قابل بناتی ہیں کہ ہم منصفانہ اور غیر منصفانہ میں تمیز کر سکیں اور درست اور غلط میں فرق سمجھ سکیں۔''

نصابی دستاویز میں جا بجا کہا گیا ہے کہ مذکورہ اقدار پورے نصاب میں ایک راسخ اور مضبوط دھارے کے طور پر پھیلا دی جائیں گی۔ جب ہم معلوماتِ عامہ، معاشرتی علوم، حتیٰ کہ اسلامیات کے مجوزہ نصاب میں نظر ڈالتے ہیں تو 'اقداری تعلیم' کے یہ تصورات ہر طرف نظر آتے ہیں۔''

''یہ بات علمی حلقوں میں واضح ہے کہ ہیومنزم (Humanism) باقاعدہ ایک فلسفہ ہے، جس کا ایک اپنا تصورِ جہاں اور تصورِ کائنات ہے اور یہ کسی خدائی نظام کو نہیں مانتا۔ یہی آج کے دور میں مغرب کا نظامِ حیات ہے۔ ہیومنزم اپنے عملی اقدامات میں انسانوں کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے: پہلی قسم ہے انسان (Humans)، دوسری قسم ہے تابع انسان (Sub-Humans) اور تیسری قسم ہے منفی انسان (Non-Humans)۔

مغربی لوگ اپنے آپ کو 'انسان' کہتے ہیں۔ ایشیائی لوگ ان کے نزدیک 'تابع انسان' ہیں اور غیر ترقی یافتہ معاشرے، مثلاً افریقی 'منفی انسان' ہیں۔ دنیا میں اس وقت جو جنگ و جدل، قتل و غارت اور ظلم و ستم نظر آ رہا ہے، وہ ہیومنزم کے انھی تصورات کی وجہ سے ہے۔''

''ہمارے مقتدر حلقے ہیومنزم کے فلسفۂ حیات کو اور ہیومنزم کی اقدار کو ہماری تعلیم کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں، جب کہ اس کے مقابلے میں: ہمارا نظامِ حیات، ہمارا تصورِ جہاں اور ہمارا آئین اور معاشرتی نظام، جس فلسفۂ حیات پر مبنی نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کو تشکیل دینا چاہتے ہیں وہ اسلام ہے۔ نظریۂ پاکستان، قائداعظم کے تصورات، قراردادِ مقاصد، دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا آرٹیکل ۳۱ تقاضا کرتا ہے کہ ہمارا قومی نظامِ تعلیم اور ہمارا قومی نصاب اسلام کے نظامِ حیات پر مبنی ہوگا، جس کی اساسی اقدار توحید، رسالت، آخرت اور عبادت ہیں۔ ان اقدار کے مطابق انسان بنیادی طور پر اللہ کا بندہ ہے اور اس کا مقصد زندگی اللہ کی عبادت، یعنی بندگی اور اطاعت ہے۔ جن کی ذیلی اقدار میں حلال، حرام،

عدل، ظلم، گناہ، ثواب، خیر، شر، دیانت، امانت، صدق، تعاون، اعتدال وغیرہ ہیں۔ یہی وہ اقدار ہیں جو پورے نصاب کے تانے بانے میں پھیلا نا ہوں گی اور تعلیم کا مقصد انھی اقدار کو نئی نسل کے رویوں اور فکر و عمل میں جاری و ساری کرنا ہے۔''

''تاہم، یہاں بالکل مختلف ذہن اس نصابی کام پر حاوی ہے جو ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے دین، اپنے کلچر، اپنی روایات اور اپنے تصورِ کائنات سے دور لے جانا چاہتا ہے۔ اگر ہم پچھلے چند برسوں پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ مغربی وسائل پر پلنے اور ان کے ایجنڈے کو لے کر چلنے والی این جی اوز اور خاص طور پر 'یو ایس کمیشن آن انٹرنیشنل ریلجس فریڈم' یعنی امریکی کمیشن برائے بین الاقوامی مذہبی آزادی، نے ہماری تعلیمی پالیسیوں پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ **مذکورہ امریکی کمیشن نے ۲۰۱۵ء میں ہماری نصابی اور درسی کتب پر جو تحقیقات کروائیں، ان کے مطابق تقریباً ۷۰ موضوعات کو قابل اعتراض گردانا گیا۔** یہ سب کے سب موضوعات دینی موضوعات ہیں۔ اس کے بالمقابل جن اقدار کو ہمارے نصاب اور درسی کتب میں نافذ کرنے کی سفارش کی گئی، وہ تمام وہی ہیں جو ہم نے ان کی 'اقداری تعلیم' کے تحت گنوائی ہیں۔ **مذکورہ امریکی کمیشن کی رپورٹوں میں جہاد کو خصوصی نشانہ بنایا گیا، نیز قادیانیت کے متعلق اعتراض اٹھائے گئے۔** مذکورہ کمیشن کی ۲۰۱۹ء کی رپورٹ میں **پاکستان کے اس قانونی اقدام کی سخت مخالفت کی گئی ہے جس کے مطابق ناظرہ قرآن اور ترجمۂ قرآن اسکولوں میں لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جائے۔** صد افسوس کہ ہمارے ہاں نصابی خاکے میں پوری اطاعت گزاری کے ساتھ امریکی سفارشات پر عمل کیا گیا ہے۔

مجوزہ نصابات پر ایک نظر: اسلامیات کا نصاب:

''اسلامیات کا نصاب پہلے بھی ہمارے ہاں اپنے حجم اور تنوع کے لحاظ سے بہت مختصر ہوتا ہے، جس سے طالب علم کے ذہن میں نہ اسلامی عقائد راسخ ہوتے ہیں اور نہ اسلامی نظامِ حیات کا کوئی واضح اور مربوط تصور پیدا ہوتا ہے۔ زیر غور نصاب میں پہلی سے پانچویں تک ناظرہ قرآن شامل کیا گیا ہے جو فی الحقیقت ۱۹۶۰ء سے لازمی حیثیت رکھتا ہے اور اس

کے لیے اسکولوں میں زیرو پیریڈ ہوا کرتا تھا، جس میں ناظرہ قرآن پڑھایا جاتا تھا۔ عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا رہا۔ اب حکومت نے تدریس القرآن کے متعلق بل پاس کیا ہے، جس سے توقع پیدا ہوئی ہے کہ پانچویں جماعت تک ناظرہ قرآن اور اعلیٰ ثانوی درجے تک ترجمۂ قرآن کی تکمیل ہوگی۔ زیرغور نصاب میں اچھا ہوتا اگر تدریس القرآن کو علیحدہ حیثیت دی جاتی، نیز اسلامیات کے نصاب میں بنیادی تصورات زیادہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ دیے جاتے۔''

''نصاب کو ایمانیات، عبادات، سیرت طیبہ، ہدایت کے سرچشمے، مشاہیر اسلام، اسلامی تہذیب اور عصر حاضر کے عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ عنوانات تو بلاشبہ جامعیت ظاہر کرتے ہیں، لیکن مواد جو ان عنوانات کے تحت تجویز کیا گیا ہے، وہ بہت ناکافی معلوم ہوتا ہے۔ مشاہیر اسلام میں چار پیغمبر اور چار خلفائے راشدین دیے گئے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے پیغمبروں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ درجہ بدرجہ جماعتوں میں بچوں کو تصور یہ دیا جانا چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی آخر الزماں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ کی طرف سے دین اسلام ہی بھیجا جاتا رہا ہے۔ **نصاب میں سے غزوات کو بالکل نکال دیا گیا ہے اور جہاد کا تصور بھی مکمل طور پر مفقود ہے۔** حق کے لیے اللہ کی راہ میں جدوجہد جب تک بچوں کے اذہان میں جاگزیں نہ ہو، ان میں حریت اور حق وصداقت کے لیے کھڑا ہونے کا جذبہ کیسے پیدا ہوگا؟ **ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'اقداری تعلیم' جو فی الحقیقت امریکی اور مغربی دباؤ اور ہدایت کے تحت بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی ہے، اس نے اسلامیات کے نصاب کو محدود کر دیا ہے۔ نصاب میں قدریں تو اسلام کی بتائی جانی چاہیے تھیں، لیکن ہیومنزم کی 'خوش نما اقدار' نصاب پر چھا گئی ہیں۔ اسلامیات کا نصاب تجویز کرنا ایک قومی مجبوری تھی۔ اس لیے بے دلی سے بکھرے بکھرے انداز میں کچھ سمویا گیا ہے۔''**

دیگر نصابات:

''اس کے بعد اردو کے نصاب پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اردو دانی کے

لحاظ سے تنوع ہے۔ اردو بعض بچوں کی مادری زبان ہے۔ بعض گھروں میں اگرچہ اردو مادری زبان نہیں ہے لیکن گھر میں والدین بچوں کے ساتھ اردو میں بات کرتے ہیں۔ اس طرح اسکول میں آنے والے بچوں کا اردو زبان کے لحاظ سے پس منظر مختلف ہے۔ لہٰذا نصاب میں اس کا مناسب طور پر خیال رکھا جانا چاہیے، لیکن پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا ہے، اور اب جب کہ 'یکساں نصاب' کی بات ہو رہی ہے، تو اردو کے نصاب میں بچوں کے مختلف پس منظر کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے نصاب میں طے کیا گیا ہے، کہ ''تیسری جماعت کے بچے اڑھائی ہزار الفاظ کو جانتے، سمجھتے اور استعمال کرتے ہوں گے، جب کہ پانچویں جماعت کے بچے پانچ ہزار الفاظ کو بولنے لکھنے پڑھنے میں استعمال کر سکیں گے۔ اب یہ اڑھائی ہزار یا پانچ ہزار الفاظ کون سے ہوں گے؟ اس ذخیرۂ الفاظ کی فہرست موجود نہیں ہے۔ یہ تحقیق کا کام ہے اور مختلف پس منظر کے بچوں کے لیے اس طرح کے ذخیرۂ الفاظ کی فہرستیں تیار کرنا بڑی مہارت اور جاں فشانی کا کام ہے۔ انگریزی کا نصاب اگر دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی لسانی پالیسی نہیں ہے۔ نیز ذہنی سطح کے لحاظ سے شاید ان بچوں کو سامنے رکھا گیا ہے، جن کے گھروں میں ماں باپ زیادہ تر انگریزی الفاظ اپنی بول چال میں برتتے ہیں اور ان کے گھر میں انگریزی میڈیا کے پروگرام دیکھے سنے جاتے ہیں۔ **المختصر یہ کہ انگریزی کا نصاب بچوں کی ضروریات اور ذہنی سطح کے مطابق نہیں ہے، بلکہ کسی انگلش بولنے والے ملک کے لیے ہے۔**

''انگریزی، اردو، اسلامیات، معاشرتی علوم اور معلوماتِ عامہ کے نصاب کا تجزیہ کیا جائے تو ان میں افقی اور عمودی ربط ◆ غائب نظر آتا ہے۔ سارے مضامین اور سارا نصاب تو ایک ہی بچے نے پڑھنا ہوتا ہے، لہٰذا یہ ربط اشد ضروری ہے۔ معلومات میں خلا یا تکرار

◆ ہمیں یقین کامل ہے کہ فیڈرل منسٹر تعلیم، صوبائی وزرائے تعلیم اور محکمہ تعلیم کے بیوروکریٹ سیکرٹری، اگر ان اصطلاحات کی تشریح کر سکیں تو انہیں سول ایوارڈ دیا جانا چاہیے۔ اس مبلغ علم کے لوگوں کی بنائی گئی تعلیمی پالیسی اور نصاب تعلیم کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے

نہیں ہونی چاہیے۔''

معاشرتی علوم کا نصاب مکمل طور پر گنجلک نظر آتا ہے۔'اقداری تعلیم' میں دی گئی قدروں کو بچوں کے ذہنوں پر ٹھونسنے کی وجہ سے زبان و بیان میں پیچیدگی بڑھ گئی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب باتیں بچوں کے ذہنوں کے اوپر اوپر سے ہی گزر جائیں گی۔

معاشرتی علوم، معلوماتِ عامہ اور انگریزی کے نصاب میں کمپیوٹر کی مدد سے مختلف جگہوں پر نقل کرتے ہوئے چسپاں کا کمال زیادہ ہے۔ بعض امریکی ریاستوں، اسکولوں اور اسکول سسٹمز کے نصابی خاکے اٹھا کر ڈال دیے گئے ہیں۔ ویب سائٹس اور حوالے جو بطور رہنمائی دیے گئے ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امریکی اسکولوں کے نصاب کو پاکستانی بنائے بغیر بڑے پھوہڑ پن سے شامل کر دیا گیا ہے۔

قیاس کن زگلستانِ من بہارمرا

''پاکستان میں پہلے جو نصابات بنائے جاتے تھے، ان کے عمومی مقاصد اور خصوصی مقاصد اس طرح بیان کیے جاتے تھے کہ انھیں بچوں کو منتقل کرنے کے لیے بہت توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن زیرِ نظر نصابی دستاویز میں سٹینڈرڈ اور سٹوڈنٹس لرننگ آؤٹ کم (SLOs) کے نام سے طلبہ کے تعلیمی مقاصد دیے گئے ہیں، جو پریشان کن ہیں اور ان سے یہ پتا بھی نہیں چلتا کہ کون سا لوازمہ درسی کتب کا حصہ بنے گا!''

سائنس اور ریاضی کے نصاب کے متعلق مختصر تبصرہ یہ ہے کہ ان میں عمودی ربط کا فقدان ہے۔اسی طرح بعض تصورات غیر ضروری اور ماحول سے ہٹے ہوئے ہیں۔اصل میں مسئلہ وہی ہے کہ امریکی اسکولوں کا نصاب اٹھا کر شامل کر دیا گیا ہے، جس سے مقامی ماحول سے ان کی نامناسبت کھل کر سامنے آگئی ہے۔

مثالیں

صاحب مقالہ نے یہاں کچھ مثالیں پیش کی ہیں، جن سے ہماری تحریر کو منطقی بنیاد مہیا ہوگی:

۱۔ ''ڈیما کریسی، ہیومن رائٹس اور رول آف لا (جمہوریت، انسانی حقوق، قانون کی عمل داری) کے تحت پہلی سے تیسری جماعت کے دوران، بچوں سے جو اُن کی ذہنی سطح سے بلند ہے غیر منطقی توقع کی جا رہی ہے۔ اس کی مثال حسب ذیل ہے: ''اس امر کا فہم کہ انصاف کیا ہے اور کمرۂ جماعت کے علاوہ ان کے والدین، بھائی بہنوں، دوستوں، رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ انصاف پرور ہونے کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اس امر کا فہم کہ بنیادی انسانی ضروریات اور بنیادی انسانی حقوق کیا ہیں؟''

۲۔ ''چوتھی اور پانچویں جماعت سے Diversity (تنوع) اور Tolerance (تحمل، بردباری کے حوالے سے مندرجہ ذیل توقع کی جا رہی ہے: ''اختلاف وتنوع کی اصطلاح کو بیان کریں اور معاشروں میں اختلاف رائے کے حامل دھڑوں کی اہم خصوصیات کی نشان دہی کریں۔''

۳۔ ''معلومات عامہ کے نصاب کے تحت پہلی جماعت کے بچے سے ٹریفک قوانین کے متعلق جو توقع کی جا رہی ہے وہ یہ ہے: ''ان حفاظتی قوانین کی نشان دہی کریں، جن کی پیروی سڑک پر چلتے، سڑک عبور کرتے اور بس کے ذریعے سفر کرتے ہوئے کرنی چاہیے۔''

۴۔ ''معاشرتی علوم میں چوتھی پانچویں جماعت کے طلبہ سے جو توقع کی جا رہی ہے وہ یہ ہے **''تمام طلبہ آئین پاکستان کی اہم خصوصیات اور روح کی نشان دہی کریں گے اور مقامی قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر شہریوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کو سمجھیں گے۔''** ◆

◆ ہمیں یقین کامل ہے کہ اس توقع پر تو بی اے/ ایم اے پاس طلبہ بھی پورا نہیں اتر سکتے۔ ان ۳/ ۴ صفحات میں نقل کردہ تمام تر تحریریں نہایت بھونڈے انداز میں کسی امریکی یا گورے کی لکھی ہوئی ہیں جسے ہمارے کسی ڈپٹی سیکرٹری/ سیکشن آفیسر نے نقل کر کے صاحب بہادر کو پیش کر دیا اور لگتا ہے کہ شفقت محمود صاحب جیسے صاحب علم نے بھی اس پر دستخط کر دیئے!

۵۔ پانچویں کی اسی سطح کے بچوں سے جو توقع کی جا رہی ہے اس کا بیان اس طرح ہے:
'ابتدائی بچپن کی تعلیم' (ارلی چائلڈ ہڈ ایجوکیشن) کے نصاب میں تین چار سال کی عمر کے بچے کے لیے انفرادی اور سماجی تعمیر و ترقی کے عنوان کے تحت متوقع نتیجے کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ: ''تمام طلبہ بیان کریں گے کہ مصنوعات اور پیداواری خدمات کی تقسیم، استعمال کے متعلق وسائل اور خدمات، ایک فرد اور معاشرے کی بہبودی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔''

۶۔ **انگلش کا نصاب بڑی 'محنت' سے کسی انگریزی پس منظر کے حامل ملک کے نصابی خاکے سے نقل کیا گیا ہے۔** ہم یہاں نصابی رپورٹ میں سٹینڈرڈ اور سٹوڈنٹس لرنگ آؤٹ کم (SLOs) کا ذکر کریں گے، مثلاً صلاحیت (Competency) یعنی لکھنے کی مہارت (Writing Skills) کے تحت سٹینڈرڈ نمبر ا کا بیان یوں ہے:
''مسائل اور ان کے بہترین حل کی نشان دہی کے ذریعے مسائل حل کرنے کی مہارت پیدا کریں۔''

۷۔ ''طالب علموں کو چاہیے کہ وہ ایک ایسی تعلیم، معاملہ فہمی اور تخلیقی تحریر لکھنے میں مہارت حاصل کریں جو رواں، درست، مرتکز اور بامقصد ہو اور تحریری عمل میں آپ کی بصیرت کو ظاہر کرتی ہو۔''

۸۔ درج بالا معیار کے تحت چوتھی جماعت کے لیے ایک سٹوڈنٹ لرننگ آؤٹ کم کی مثال اس طرح ہے: ''کسی بھی عبارت کے پس منظر کے ابلاغی مقصد کے لیے درکار مناسب لب و لہجہ (بشمول ذخیرۂ الفاظ) استعمال کرتے ہوئے بولنے کے ابتدائی طریقوں اور مزاحیہ خاکوں کے ٹکڑوں میں مختصر عبارتیں استعمال کریں۔''

''اوّل تو ہمارے اساتذہ کے لیے یہ باتیں سمجھنا ممکن نہیں ہے، اور اگر وہ بالفرض سمجھ بھی جائیں، تو طالب علموں سے یہ سب کچھ کروانا ممکن نہیں ہے۔ **نصابی کمیٹی نے کسی انگلش سپیکنگ ملک کا نصاب اٹھا کر دے دیا ہے، یہ سوچے بغیر کہ اسے پاکستان**

میں پڑھانا ہے ◆ جہاں ابھی تک 'مارننگ واک' کا مضمون رٹا لگوا کر یاد کرایا جاتا ہے۔ نصاب اچھا اور معیاری ہونا چاہیے لیکن اسے زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے قابل نفاذ بھی ہونا چاہیے۔

حاصل مطالعہ

پہلی سے پانچویں تک کے نصابی کتابچوں کو اور خاص طور پر 'اقداری تعلیم' کے حصے کو دیکھ کر نظر آتا ہے کہ:

☆ یہ نصاب مغربی تہذیب اور کلچر کے فروغ کے لیے بنایا گیا ہے۔

☆ نظامِ اقدار جس پر یہ مبنی ہے وہ ہیومنزم کی اقدار ہیں اور اسلامی تہذیب وتمدن کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆ نصابی خاکہ میں جو تصورات اور لوازمہ تجویز کیا گیا ہے، وہ بچوں کی ضروریات، معاشرے کی ضروریات اور بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق نہیں ہے۔

☆ مغربی اسکولوں کے نصابات کی بھونڈی نقل ہے، جو ہمارے نظامِ تعلیم میں جگہ نہیں پا سکے گا۔

☆ نصاب میں اُفقی اور عمودی ربط کا خیال نہیں رکھا گیا۔

☆ ''یوایس کمیشن آن ریلیجس فریڈم' کی سفارشات بلکہ ڈکٹیشن پر عمل کیا گیا ہے۔ اسلامی اقدار اور اسلامی فکر کے تصور کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔

☆ اردو اور انگریزی کا نصاب بچوں میں مطلوبہ لسانی صلاحیتیں پیدا نہیں کر سکے گا۔ خصوصاً متوسط اور نچلے متوسط گھرانوں کے بچے، دیہاتی اسکولوں کے بچے اور اساتذہ اس نصاب کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکیں گے۔

کیا کیا جائے؟

اس ضمن میں پروفیسر ملک محمد حسین نے توجہ دلائی کہ

◆ کلیریوکریسی کی فائلوں/ انٹرنیٹ سے نقل کردہ ''شاہ کار تخلیق'' کا نمونہ جسے دیکھ کر لارڈ میکالے بھی اپنی قبر میں دادِ تحسین دینے پر مجبور ہوگا!

۱۔ ''اس نصاب کو قبول کرنے کے بجائے حکومتی زعما کو احساس دلایا جائے کہ یکساں نظامِ تعلیم کا مستحسن فیصلہ، اس نصاب کے ہوتے ہوئے نافذ نہیں ہو پائے گا۔

۲۔ چونکہ اس نصاب کی پشت پر امریکی/مغربی دباؤ ہے اور اندرون ملک سیکولر لابی اس نصاب کی تائید میں ہوگی، اس لیے ملک کی دینی اور محب وطن قوتوں کو میڈیا کے ذریعے سیمی ناروں اور کانفرنسوں کے ذریعے، اخباری مضامین کے ذریعے اور خصوصاً سوشل میڈیا کے بھرپور استعمال سے **اس احمقانہ نصاب** کے حوالے سے ایک بیداری پیدا کرنا چاہیے۔

۳۔ ''اٹھارھویں ترمیم کے بعد پاکستان کے سب صوبے اپنا اپنا نصابِ تعلیم بنانے میں قانوناً آزاد ہیں۔ اس سلسلے میں پنجاب کے محکمۂ تعلیم نے جو نصاب بنا رکھا ہے، وہ وفاقی حکومت کے اس زیرِ غور نصابی مسودے سے بہتر ہے۔ اس حوالے سے صوبائی سطح پر بھی لابنگ ہونی چاہیے، تاکہ وفاق درست رویہ اختیار کرے۔ نیز دینی مدارس کے وفاقوں کو بھی متحرک کرنا چاہیے کیونکہ یہی نصاب انھیں بھی اپنے قائم کردہ اسکولوں میں پڑھانا ہوگا۔ نیز ضروری ہے کہ اگر کوئی یکساں نظامِ تعلیم اور یکساں نصاب تعلیم نافذ ہونا ہے تو وہ سب کی شراکت، مشاورت اور رضامندی سے نافذ ہو۔''

درج بالا مقالے میں پروفیسر ملک محمد حسین صاحب نے جس دردمندی اور اخلاص کے ساتھ ''یکساں نظام تعلیم کے نام پر'' جو کھیل وزیر تعلیم کھیل رہے ہیں اس کی نشان دہی کر دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ وزیر اعظم کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش نہیں۔ ہمیں ابھی بھی وزیر تعلیم کے خلوص اور نیت پر کوئی شک وشبہ نہیں تاہم ہم ان سے یہ گزارش کرنے کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ خدارا وہ ''کلرو کریسی'' کے اس دام ہمرنگ زمین میں مت آئیں____ ان کا مبلغ علم تو بس اس قدر ہی ہے کہ وہ انگریزی زبان میں امریکی فکر کو ایسے بھونڈے طریقے سے بیان کر سکتے ہیں کہ امریکن ماہرین بھی اس پر عش عش کر اٹھتے ہیں کہ ہمارے مافی الضمیر کی کس قدر چابکدستی کے ساتھ تائید ونصرت ہو رہی ہے لیکن اس مقالے میں متعدد نشان زدہ حصوں پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نقل بھی بہت بھونڈے طریقے

پر کی گئی ہے کہ اس کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے لیکن یہاں تو خانۂ دماغ میں ایسی کسی چیز کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا!

عقل کی نارسائی پہ فریاد!

ابھی ہم وزیر با تدبیر تعلیم کے بارے میں سر پٹک ہی رہے تھے کہ پروفیسر ملک محمد حسین نے اپنے ایک دوسرے نہایت پر مغز مقالے ''یکساں نصاب اور حکومتی مضحکہ خیزی'' شائع شدہ اگست ۲۰۲۰ء کے ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن میں پڑھنے کا موقع ملا۔ خیال تھا کہ اس مقالے کا ایک مختصر خاکہ ہم پیش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن مطالعہ کرنے پر پتہ چلا کہ اس مقالے کو بھی ہمیں من وعن اپنی کتاب کی زینت بنا لینا چاہیے کہ جس پرزور انداز اور علمی وتحقیقی طریق پر انہوں نے اس موضوع کا حق ادا کیا ہے، وہ ہم جیسا طالب علم اور ان کا خوشہ چیں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس مقالے میں بھی ''کلرو کریسی'' کی چالبازیوں اور الفاظ کے گورکھ دھندے سے کام کیا گیا ہے ___ نمعلوم اس قسم کی تحریر لکھنے والے **افسر نما کلرک** کب اپنے دماغ سے کام لینا شروع کریں گے اور اس قسم کی اوٹ پٹانگ تحریروں کے بعد وہ رات کو اپنے ضمیر کو تھپکی دے کر کیوں کر سلا دیتے ہوں گے یا اس کے لئے کسی ''دارو'' کا سہارا لیتے ہوں گے۔ ذیل میں ہم پروفیسر محترم کا مقالہ بہت زیادہ کاٹ چھانٹ کے بغیر پیش کر رہے ہیں۔

''مارچ ۲۰۲۰ء میں وزیر اعظم پاکستان کے ہاتھوں 'یکساں قومی نصاب' کی منظوری کے اب چار ماہ بعد 'نیشنل کریکولم کونسل' (NCC) سے منظوری کا ڈرامار چانے کے لیے ۲۲ جولائی کو اسلام آباد میں اجلاس منعقد کیا گیا۔ کہا یہ گیا کہ درمیانی عرصے میں نصاب کی نوک پلک سنواری جاتی رہی ہے۔ اس سے پہلے ۱۶ جولائی کو بقول وزارتِ وفاقی تعلیم ماہرین کا اجلاس بلایا گیا جس میں میڈیم آف انسٹرکشن، یعنی ذریعۂ تعلیم کا فیصلہ لینا تھا۔ وفاقی وزارتِ تعلیم نے اس مقصد کے لیے جو نقشہ کار دیا وہ یہ تھا کہ پری اسکول (قبل اسکول) سے ہی ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوگا، تاہم اسلامیات کا مضمون اُردو میں پڑھایا جائے گا۔ نیز اسلامیات کے سوا باقی تمام مضامین کی درسی کتب بھی انگریزی میں ہوں گی۔

۱۶ مارچ کے اجلاس میں ۲۷ شرکاء نے انگریزی بطور ذریعۂ تعلیم کی مخالفت کی۔ صرف بیکن ہاؤس اسکولز کے نمائندے اور جناب جاوید جبار نے انگریزی بطور ذریعۂ تعلیم کی حمایت کی۔ غالب اکثریت کی مخالف رائے آنے کی وجہ سے ذمہ داران نے کوئی فیصلہ کیے بغیر اجلاس یہ کہتے ہوئے ختم کر دیا کہ اس مقصد کے لیے مزید مشاورتی اجلاس بلائے جائیں گے۔ لیکن مزید کوئی اجلاس بلانے کے بجائے ۲۲ جولائی کو 'یکساں قومی نصاب' کی 'قومی نصابی کونسل' (NCC) کا ذریعۂ تعلیم کے فیصلے کے لیے اجلاس بلایا گیا۔ اس اجلاس میں ۲۵ لوگ ذاتی طور پر اجلاس میں شریک ہوئے اور باقی اراکین آن لائن سہولت کے ساتھ اجلاس میں شامل تھے۔''

''اس اجلاس کے حوالے سے وفاقی وزارتِ تعلیم نے یہ چالاکی دکھائی کہ **وفاق ہائے مدارس دینیہ کے نمائندوں کو بہت تاخیر سے اطلاع دی گئی۔ انھیں نہ کوئی ایجنڈا بھیجا گیا اور نہ اجلاس کا کوئی ورکنگ پیپر۔ مزید یہ کہ آن لائن زوم کے ذریعے شرکت کے لیے بعض اراکین کو لنک بھی فراہم نہیں کیا گیا۔** لیکن دینی اداروں کے تمام نمائندوں نے لنک کی معلومات حاصل کر کے اجلاس میں شرکت ممکن بنا لی۔ ۲۲ جولائی کے اجلاس میں بھی دلچسپ صورتِ حال رہی۔ مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے احتجاج ریکارڈ کرایا کہ انھیں نہ بروقت اطلاع دی گئی، نہ ایجنڈا فراہم کیا گیا اور نہ زیر غور نصاب کا مسودہ دیا گیا۔ اس لیے وہ بے مقصد شرکت پسند نہیں کرتے، لہٰذا انھیں نصابی مسودات فراہم کیے جائیں اور جائزے کے لیے ایک ماہ دیا جائے تو وہ نصاب پر غور کے لیے تیار ہیں۔ یہ کہہ کر وہ اجلاس سے الگ ہو گئے، جب کہ مولانا حنیف جالندھری صاحب، علامہ افضل حیدر صاحب اور ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب نے بھرپور استدلال سے شرکت کی اور شکوہ بیان کیا۔''

یہاں ہم دوبارہ محترم وزیر تعلیم کو بتانا چاہتے ہیں کہ ان کا ''کلرو کریسی کا عملہ'' انہیں ایک بار پھر مغالطے میں نہیں بلکہ ایک ایسے نرغے میں گھیر رہا ہے جس کا شکار ان سے بہت پہلے آنے والے متعدد وزرائے تعلیم ہو چکے ہیں اور شاید

انہیں بھی اس عہدہ سے فراغت کے بعد، اپنے سابقین کی طرح یہ خیال آئے کہ ان کے ساتھ تو بہت بڑا ہاتھ ہو گیا ہے___ **ہم اس ملک کے ایک شہری کی حیثیت سے ان سے یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آخران کا عملہ کیوں کر اہل علم اور دین کے مخلص لوگوں کے ساتھ اس قسم کے ''اوچھے ہتھکنڈے'' استعمال کر رہا ہے؟**___ آخر کیوں کر اور کب تک اس ملک کے وسائل کو لبرل اور آزاد خیال لوگوں کو پروان چڑھانے، ان کے خیالات کو پذیرائی بخشنے کا کھیل کھیلا جا تا رہے گا؟

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر اے روز مکافات

ہم اپنے ان خیالات کو وزیر اعظم پاکستان کے علم میں لا کر ان سے مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ اس قسم کی تمام تر کوششوں کا نوٹس لیں___ اور اگر ان کے زیر سایہ اس قسم کا کلروکریسی کا عملہ اپنے وزیر کے ساتھ اس قسم کی حرکتوں سے باز نہیں آ سکتا تو پھر بہتر ہے کہ وہ ''نظام تعلیم کی مرمت'' کرنے کے عمل سے باز آ جائیں اور اپنی تمام تر کوششیں صرف اور صرف ''کرپشن سے پاک وطن'' کی حد تک مرکوز کریں۔ان کا یہ اقدام بھی پاکستان کے قیام و بقا کے لئے ایک بہت بڑا احسان ہو گا!

پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کے مقالے میں اٹھائے گئے خیالات پر ہمیں درج بالا ''دخل در معقولات'' دینے پر افسوس ہے لیکن ہمارے ملک کی ''کلروکریسی'' کے اقدامات پر کسی صاحب دل کا تڑپ اٹھنا باعث تعجب نہیں ہونا چاہیے___ ان کے مقالے کا بقایا حصہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ملک صاحب نے لکھا کہ

''باقی شرکا میں سے سندھ، بلوچستان، آزاد کشمیر کے وزرائے تعلیم یا سیکرٹری تعلیم نے کہا کہ اٹھارھویں آئینی ترمیم کے بعد نصاب سازی صوبوں کا اختیار ہے۔تاہم، وفاق کے اچھے کام کو وہ زیر غور لا سکتے ہیں، لیکن اس کا فیصلہ صوبے کی کابینہ نے کرنا ہے۔نیز صوبے اپنا نصاب اور درسی کتب تیار کر رہے ہیں۔آزاد کشمیر کے وزیر تعلیم نے کہا کہ وفاق مہربانی کر کے اپنے نصاب میں کشمیر کا بھی کہیں ذکر کر دے تو اس کی مہربانی ہو گی۔خیبر پختونخواہ

کے وزیر تعلیم نے کہا کہ ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ نصاب کی منظوری کا یہ آخری اجلاس ہے لیکن شرکاے اجلاس کی تنقیدی آرا سننے کے بعد معلوم ہو رہا ہے کہ یکساں قومی نصاب کے سلسلے میں یہ تو ابھی پہلا اجلاس ہے۔''

مقالے میں وفاق کی مختلف اکائیوں کے نمائندوں نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہا ہے

گر ہمیں مکتب و ملاں، کارِ طفلاں تمام خواہد شد!

پروفیسر ملک محمد حسین نے مزید لکھا کہ

شرکائے اجلاس میں اکثریت اگرچہ سیکولر، لبرل خیالات کی حامی اور وفاقی وزیر تعلیم کی پسندیدہ شخصیات تھیں لیکن ان کے تبصرے بھی کام کے حق میں نظر نہیں آ رہے تھے۔ وفاقی وزیر تعلیم جناب شفقت محمود کا کہنا یہ تھا کہ ہم نیشنل کریکولم کونسل کے اراکین کی رائے اور تبصروں کی روشنی میں نصاب کی ٹیوننگ اور پالشنگ کریں گے۔ نتیجہ یہ کہ پھر ۱۶ جولائی والے اجلاس کی طرح صورت پیدا ہوئی اور کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا اور وزیر تعلیم نے اجلاس یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ مشاورت جاری رہے گی۔

ہم وفاقی وزیر تعلیم سے یہ گزارش کریں گے کہ ''نصاب کی ٹیوننگ اور پالشنگ'' کرنے کے اس لامتناہی سلسلے کو اب ختم کریں۔ قوم اور وطن عزیز اس قسم کی لفاظی اور کہہ مکرینوں سے دھوکہ کھانے والی نہیں اور نہ ہی لبرلزم کے اس دام ہمرنگ زمین میں آنے کو تیار ہے ــــــ اپنے مزعومہ افکار و خیالات کے دام سے نکل کر حقائق کو رنگین شیشے کی عینک سے دیکھنے کی عادت کو ترک کر دیں ــــــ ذرا دیکھئے اہل علم کیا کہتے ہیں؟

(حکومت) ''ایک قوم، ایک نصاب، کا ڈھول پیٹ رہی تھی اس کے غبارے سے ہوا نکلتی نظر آ رہی ہے اور قومی سطح پر یہ جو مثبت تاثر اُبھر رہا تھا کہ یکساں قومی نصاب کا دیرینہ قومی خواب تعبیر کے قریب ہے، اب یہ خواب بکھرتا نظر آ رہا ہے جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:''

۱۔ ''وزارتِ وفاقی تعلیم کے ارباب بست و کشاد کا واضح جھکاؤ سیکولر/لبرل لابی کی طرف ہے، جب کہ قوم کا مجموعی مزاج اسلامی نظریۂ حیات سے سرشار ہے۔ نیشنل کریکولم

کونسل میں وزیر تعلیم نے اپنی پسند کے لبرل/سیکولر لوگ پورے دھڑلے کے ساتھ شامل کیے ہیں۔ اگر نیشنل کریکولم کونسل کے ارکان کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو چاروں صوبوں، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان کے بر بنائے عہدہ نمائندوں کے علاوہ گیارہ مرد حضرات اور دس خواتین اراکین ہیں۔ سب نامزد افراد کی وابستگی لبرل/سیکولر سوچ سے ہے۔ **دینی مدارس کے پانچ وفاقوں کے نمائندے البتہ علمائے کرام ہیں جو کہ ایک مجبوری تھی لیکن ان نمائندوں کو اسلامیات کے نصاب کے علاوہ کہیں کردار ادا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔''**

۲۔ ''سنگل نیشنل کریکولم کے عنوان سے جو نصاب تیار کیا گیا ہے وہ ارکان نیشنل کریکولم کونسل تک کو مہیا نہیں کیا گیا تھا۔''

۳۔ ''نصاب کے جائزے کے لیے ضروری ہے کہ ان ضروریات کی فہرست دی جائے جو عصر حاضر میں نرسری سے بارھویں جماعت تک ہمارے طلبہ کی نصابی ضروریات کے طور پر وفاقی وزارتِ تعلیم نے ترتیب دی ہیں تا کہ ان ضروریات کی روشنی میں نصابِ تعلیم کی مناسبت کا جائزہ لیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وزارت نے ضروریات پر مبنی ایسی کوئی فہرست نہیں بنائی۔'' ــــــ نقل را عقل باشد!

۴۔ ''نرسری سے بارھویں تک پورے نصاب میں سے ایک طالب علم نے گزرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک تسلسل ہے جو نصاب میں نظر آنا چاہیے۔ گریڈوں یا جماعتوں کی تقسیم ہم اپنی انتظامی سہولت کے لیے کرتے ہیں۔ اس وقت صرف نرسری سے پانچویں جماعت تک کا نصاب دیا جا رہا ہے۔ اس سے ہمیں کیسے معلوم ہو کہ اس کا مڈل جماعتوں اور ثانوی جماعتوں کے نصاب کے ساتھ عمودی ربط موجود ہے اور کسی قسم کا خلا نہیں ہے۔''

۵۔ پانچ سال سے ۱۶ سال کی عمر کی تعلیم قانون کے مطابق ہمارے ملک میں لازمی ہے اس کا مطلب ہے کہ تعلیم کے اس دورانیے میں طالب علم کو بالغ زندگی کامیابی سے گزارنے کے لیے تمام معلومات، تمام مہارتیں اور ضروری اخلاق و کردار اور رویے،

رسمی اور غیر رسمی تعلیم کے ذریعے مل جائیں۔ خصوصاً آئین کے آرٹیکل ۳۱ کی روشنی میں ۱۶ سال کی عمر تک تعلیم حاصل کر کے ہمارے طلبہ و طالبات اس قابل ہو جائیں کہ وہ قرآن و سنت کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ محض پری اسکول سے پانچویں جماعت تک کا نصاب دیکھ کر تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ نصاب لازمی تعلیم کے دورانیہ کے تقاضے پورے کرتا ہے یا نہیں۔''

۶۔ ''سکول سطح کا نصابِ تعلیم ایک تسلسل کا تقاضا کرتا ہے جس میں ربط، توازن، تسلسل، وسعت اور گہرائی کا بدرجۂ اتم خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے پوری دنیا کی یہ روایت ہے کہ نصاب جب بھی تیار ہوگا وہ پری سکول سے ثانوی/ اعلیٰ ثانوی درجے تک ایک ہی وقت میں تیار ہوگا۔ البتہ اس کے نفاذ کے لیے درجہ وار ترتیب لگائی جاتی ہے۔ ٹکڑوں میں جب نصاب تیار ہوگا اس میں اُفقی اور عمودی ربط اور توازن کی کمزوری لازماً رہے گی۔ ◆ وفاقی وزارتِ تعلیم اجزا میں نصاب سازی کر کے تعلیمی دنیا کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کا ارتکاب کر رہی ہے۔''

۷۔ ''ماہرین کی طرف سے یہ اعتراض شد و مد سے اُٹھایا جا رہا ہے کہ مذکورہ نصاب جو نظریۂ پاکستان، اسلامی نظریۂ حیات اور دستورِ پاکستان کی تعلیم سے متعلق آرٹیکلز کی روشنی میں تیار ہونا تھا، وہ سیکولر، لبرل اقدار کی روشنی میں تشکیل دیا گیا ہے۔ نصاب کی بنیادی اسلامی اقدار، یعنی توحید، رسالت، عبادت اور آخرت اور معاملات و اخلاقیات کی ذیلی اقدار ہونا چاہیے تھیں، لیکن ان کی بنیاد سیکولر اساسی اقدار پر رکھی گئی ہے جو نا قابل قبول ہے۔''

۸۔ ''رہ گئی بات میڈیم آف انسٹرکشن (ذریعۂ تعلیم) کی تو ۱۶ جولائی کو جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں ایک دو کو چھوڑ کر سب نے انگریزی کی مخالفت کی اور سفارش کی کہ پری اسکول سے آخر تک اسکول کی تعلیم اُردو یا علاقائی زبان میں ہونی چاہیے۔ تقریباً

◆ ہر دو اصطلاحوں کی کوئی جامع تعریف کوئی سیکرٹری تعلیم/ یا خود وزیر تعلیم اگر کر سکیں تو انہیں صدرِ مملکت کی جانب سے اعلیٰ ترین سول ایوارڈ دینا چاہیے!

متفقہ مخالفت آنے پر وزارتِ تعلیم کے ذمہ داران نے کوئی فیصلہ کیے بغیر میٹنگ ختم کردی۔ ماہرین کی آرا کی روشنی میں اور قومی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے پری اسکول سے ثانوی سطح تک تمام مضامین اُردو یا علاقائی زبان میں پڑھانے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔''

۹۔ ''تعلیم اب صوبائی معاملہ ہے۔ وزارتِ وفاقی تعلیم کس اختیار اور قانون کے تحت سنگل نیشنل کریکولم اور سنگل ٹیکسٹ بکس تمام صوبوں میں نافذ کرے گی جبکہ صوبوں کے اپنے کریکولم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈز اور صوبائی اسمبلیوں سے پاس کردہ اپنے قانون موجود ہیں نیز پرائیویٹ سیکٹر میں اشرافیہ کے اسکولز جو بیرونی امتحانی بورڈز سے منسلک ہیں، کیڈٹ کالج، آرمی پبلک سکولز، جو مقتدر طبقوں کے ادارے ہیں وہ کب اور کس طرح سنگل نیشنل کریکولم کو قبول کریں گے؟ مذکورہ تمام اداروں میں نافذ کرائے بغیر اسے یکساں قومی نصاب کا درجہ کیسے حاصل ہوگا؟''

۱۰۔ ''وزارتِ وفاقی تعلیم اور نیشنل کریکولم کونسل کے ذمہ دار افسران نے وزیر اعظم کے سامنے کارکردگی دکھانے کی خاطر عجلت میں یہ کیا ہے۔ امر واقعہ ہے کہ یہ سب کچھ ۲۰۰۶ء میں جنرل پرویز مشرف کے نصاب میں معمولی کمی بیشی کا تسلسل ہے، جسے اسلامی حلقوں نے مسترد کردیا۔''

۱۱۔ ''یہ غلط دعویٰ کیا جارہا ہے کہ اس نصاب کو پاکستان بھر کے ۷۰ ماہرین نے تیار کیا ہے حالانکہ یہ ۲۰۰۶ء کے نصاب میں محض کچھ تبدیلیاں ہیں۔''

۱۲۔ نیشنل کریکولم کونسل کے ذمہ داران نے تعلیمی عمل کے حقیقی اسٹیک ہولڈرز کو نظر انداز کر کے اپنے پسندیدہ نام نہاد ماہرین کو آگے رکھ کر شفافیت کی نفی کی ہے، اور پھر اس طرح رازداری سے کام لیا ہے جس سے شکوک وشبہات نے جنم لیا ہے۔ اِن میں سے کسی کو اس دستاویز کا علم نہیں جن کے بچوں کا تعلیمی مستقبل اس سے وابستہ ہے یا جنھوں نے نصاب کے اس مسودے کو نافذ کرنا ہے، یعنی اساتذہ اور محکمہ ہائے تعلیم کے انتظامی ذمہ داران۔''

۱۳۔ ''وفاقی وزیر تعلیم شفقت محمود نے اپنے ٹویٹ میں یہ کہہ کر ''سنگل نیشنل کریکولم صرف کور کریکولم (Core Curriculum) ہے۔ **اگر اسکول اور اسکولز سسٹمز اس نصاب میں اضافہ کرنا چاہیں گے تو اُن کو اجازت ہو گی''، یکساں قومی نصاب کے غبارے سے خود ہی ہوا نکال دی ہے۔ یہ وہ بدترین پسپائی ہے جو اشرافیہ کے تعلیمی اداروں کے انکار اور دباؤ کی وجہ سے کی گئی ہے۔''**

۱۴۔ ''پنجاب کے وزیر تعلیم ڈاکٹر مراد راس نے وضاحت کی ہے کہ یکساں قومی نصاب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام اسکول صرف وفاق کا قومی نصاب ہی پڑھائیں گے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ وفاق نے ایک نصابی فریم ورک دیا ہے جس کے اندر رہ کر پڑھانا ہوگا، باقی ادارے اگر اس میں اضافہ کرنا چاہیں تو اس کی ان کو آزادی ہوگی۔ نیز ایک ہی درسی کتاب بھی مطلوب نہیں ہے۔ دینی مدارس میں مقتدر قوتوں کے دباؤ کے تحت سیکولر نصاب رائج کیا جائے اور ان کا موجودہ دینی تشخص آہستہ آہستہ ختم کر دیا جائے۔ سرکاری ادارے تو شاید ہی مذکورہ نصاب نافذ کریں گے۔''

۱۵۔ ''اگر حکومت یکساں قومی نصاب کے مسئلے پر سنجیدہ ہے تو اسے بیرونی امتحان پر پابندی اور بیرونی بورڈز کے تعلیمی سرٹیفکیٹس کی نامنظوری کی قانون سازی کرنی چاہیے جو ظاہر ہے ممکن نہیں ہوگی کیونکہ ان اداروں اور ان بیرونی امتحانات سے منسلک سیاست دانوں، بیوروکریٹس، ججوں، جرنیلوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے نونہالوں کا روشن مستقبل وابستہ ہے۔ اس طرح یکساں قومی نصاب صرف غریبوں پر ہی نافذ ہوگا۔''

۱۶۔ ''یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ سنگل نیشنل کریکولم کا یہ سارا ڈھونگ حکومت (یا وزارتِ تعلیم) کے سیکولر تعلیمی ایجنڈے کا حصہ ہے اور ہدف محض دینی ادارے ہیں۔ اس کے پیچھے امریکی کمیشن برائے مذہبی آزادی ارو دیگر مغربی قوتیں ہیں۔ ملک کی اندرونی سیکولر لابی ایک طرف تو نیشنل کریکولم کونسل میں غالب حیثیت بلکہ فیصلہ کن حیثیت میں موجود ہے اور دوسری طرف سیکولر، لبرل اور کرسچین این جی اوز کے پلیٹ

فارم سے بعض معروف خواتین و حضرات متحرک ہیں۔ ان این جی اوز کی ۳ مارچ ۲۰۲۰ء کے سیمی نار جس کی صدارت جناب شفقت محمود نے کی اور پھر ۱۰ جولائی ۲۰۲۰ء کا Webinar اور ان دونوں اجلاسوں کی کارروائی سنگل نیشنل کریکولم کے لبرل سیکولر ایجنڈے کی حمایت میں نظر آتی ہے۔ اسی سیمی نار میں شرکا کے مطالبے پر جناب شفقت محمود نے وعدہ کیا تھا کہ ''وہ سارا مواد نصاب سے خارج کر دیا جائے گا جس پر اقلیتوں کو اعتراض ہے۔''

''اس عجیب و غریب صورتِ حال میں اصل نقصان قومی نظامِ تعلیم کا ہو رہا ہے جس کے لیے پارلیمنٹیرین، دانش وروں، عالموں اور استادوں کو اپنا فرضِ منصبی ادا کرتے ہوئے ایک جانب سیکولر یلغار کی مزاحمت کرنی چاہیے اور دوسری جانب مثبت طور پر اقدامات تجویز اور نافذ کرانے چاہئیں۔''

علوم دینی کے ماہرین:

درج بالا سطور میں جو گزارشات مختلف ماہرین تعلیم کے حوالوں سے پیش کی گئی ہیں، ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کسی ایسے شخص کے ذہن کی اختراع ہیں جسے تعلیمی حالات و کوائف کا کوئی تجربہ نہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا تبصرہ اور تنقید ہے جس نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ اسی تعلیم و تعلم میں گزارا ہے۔ اس کی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری ہے اور جو واقف درونِ میخانہ ہے___ اب ہم ایک دوسرے فریق کے خیالات پیش کریں گے جو انہی کی طرح دینی علوم کے ماہر ہیں، انہوں نے قرآن کی تعلیم پر سیکولر طبقے کے ردعمل میں تحریر فرمایا ہے۔ ہماری مراد مفتی منیب الرحمن صاحب سے ہے جو نہ صرف ایک دینی ادارے کے سربراہ ہیں بلکہ چیئرمین رویت ہلال کمیٹی پاکستان کے منصب جلیلہ پر بھی فائز رہے ہیں۔ مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے اپنے مقالے ''اسلام پر براہ راست حملے دستور اور معاشرہ'' کے موضوع پر ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن (اگست ۲۰۲۰ء) کی اشاعت میں نہایت سوز اور دردمندی کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ پس منظر اس مقالے کا یہ ہے کہ ۱۴ جون ۲۰۲۰ء میں پنجاب کے گورنر نے پنجاب کی سرکاری یونیورسٹیوں کے وائس

چانسلرز کے اجلاس کے بعد اعلان کیا کہ ''ڈگری کے حصول کے لئے طالب علم کو ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھ کر سنانا ہوگا'' ___ ملت اسلامیہ نے اس پیغام کا خیر مقدم کیا لیکن الحادی طاقتوں کے علمبرداروں نے اس پر جو شوروغوغا مچایا اور جس انداز کی تحریر لکھیں، اگر ایسی کوئی صورت حال امریکہ یا روس میں ان ممالک کے دستوری معاملات کے خلاف لکھی جاتی تو دنیا دیکھتی کہ ایسے ''لکھاریوں اور دانش وروں'' کا کیا انجام ہوتا (بلکہ دنیا دیکھ چکی ہے تاریخ کے صفحات ان مظالم کی تفصیل سے بھرے پڑے ہیں جو نام نہاد جمہوریت اور کمیونزم کے قیام و تسلسل کے لئے ان طاقتوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ کیا) مفتی صاحب نے اپنے مقالے میں جو کچھ لکھا، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

☆......گورنر پنجاب کا ڈگری کے حصول کے لئے قرآن کا ترجمہ سنانے کا اطلاق محض ایک اعلان ہے جس کے پیچھے کوئی موثر قانون سازی نہیں ہے لیکن انگریزی اخبارات کے بعض کالم نگاروں نے شدید احتجاج کیا اب چاہیے تو یہ تھا کہ گورنر پنجاب اپنے ایک اعلان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے صوبائی/ وفاقی سطح پر کوئی اقدامات صادر کرتے، ان کے اعلان کی جس انداز میں دھجیاں اڑائی گئیں، اس کا انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تاہم امت مسلمہ کی آنکھیں (متدین اہل علم) برداشت نہ کر سکیں اور متعدد اہل علم نے احتجاج کیا۔

☆......مفتی صاحب نے نہایت پتہ کی بات کی کہ ''یہ ہمارے روزمرہ مشاہدے کی بات ہے کہ اگر حساس اداروں سے وابستہ شخصیات کے بارے میں سوشل میڈیا میں کوئی نازیبا بات کرے تو اسے تلاش کر کے بھرپور گوشمالی کی جاتی ہے لیکن یوں نظر آتا ہے کہ اب وطن عزیز کے ریاستی و حکومتی نظم میں دینی مقدمات کا دفاع اور تحفظ شاید کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

☆......اسی ضمن میں مفتی صاحب نے دستور پاکستان کے حوالے سے کالم نگاروں سے اور بعد ازاں حکومتی اداروں سے بجا طور پر یہ سوال کیا کہ کیا دستور پاکستان کی رو سے دینی تعلیمات کو فروغ دینا اور وطن عزیز کے لوگوں کو اچھا مسلمان بنانے کے لئے

اقدامات کرنا ضروری نہیں؟

☆...... ماضی کا حوالہ دیتے ہوئے مفتی صاحب نے بجا طور پر فرمایا کہ کبھی دائیں بازو یا بائیں بازو کی باتیں ہوتی تھیں اور لوگ کسی حد تک نظریاتی وابستگی بھی رکھتے تھے لیکن اب تو یہ باتیں قصۂ پارینہ بن گئی ہیں۔ اب یہ سب باتیں صرف مفاداتی، گروہی، اور شخصیت پرستی تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں___ ایسے عالم میں انہوں نے دستوری اساس یعنی اسلام اور قرآن وسنت پر حملہ کرنے پر دستورِ پاکستان کے تحت وفاقی/صوبائی کابینہ، پارلیمنٹ کے ارکان، اعلیٰ عدلیہ، سول اور مسلح اداروں کی اعلیٰ قیادت سے سوال کیا کہ کیوں وہ ایسی ''تمام حرکتوں پر سدراہ نہیں بنتے؟ کیا ان سب نے دستور سے وفاداری کا حلف نہیں اٹھا رکھا۔

☆...... مفتی صاحب نے شعبۂ صحافت کے جفادریوں کو بھی آئینہ دکھایا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ مرحوم نواب زادہ نصر اللہ خان نے ایک بڑے اخبار کو ''ڈیپارٹمنٹل سٹور'' کہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اب تو صحافت (بالخصوص پرائیویٹ ٹی وی چینلز) سے وہ غیرت و حمیت بھی ختم ہوگئی ہے کہ

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!

☆...... مفتی صاحب نے اپنے مقالے کا اختتام جس سوز اور دردمندی سے کیا، ہم اسے ان کے الفاظ میں لکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ

''___ یوں لگتا ہے کہ مذہبی، سیاسی، سماجی، صحافتی، ادبی تنظیموں کے نزدیک قرآن وسنت کی ناموس کے تحفظ کا مسئلہ ثانوی ترجیح کے درجے میں چلا گیا ہے۔ آج تعلیم کو سیکولرائیز کرنے کے لئے بھرپور کوششیں اور فیصلے کئے جارہے ہیں لیکن ان پر کوئی قابل ذکر علمی، احتجاجی یا سیاسی کاوش دکھائی نہیں دیتی''!

دانش ور/تجزیہ کار:

وزارت تعلیم کے ان ''سیاسی کرتبوں'' کا نوٹس چند دانشور اور تجزیہ کار حضرات نے بھی لیا کراچی کے ایک دانش ور تجزیہ نگار اور انصاف پسند شاہ نواز فاروقی کا بھی مقالہ ماہنامہ

عالمی ترجمان القرآن (۲۰۲۰) میں شائع ہوا ہے، انہوں نے قرآن پڑھانے کے اس اعلان پر تین سیکولر کالم نگاروں (روزنامہ دنیا اور دنیا ٹیلی ویژن کے ایاز امیر، جنگ، اور 'جیو گروپ' کے انگریزی اخبار کے کالم نویس غازی صلاح الدین اور روزنامہ پاکستان ٹائمز کے سابق ایڈیٹر آئی اے رحمان نے ڈان اخبار میں) کے کالموں پر تبصرہ کیا ہے۔ ان سب 'نام نہاد دانش وروں'' نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اس قدر سوقیانہ اور پھسپھسے ہیں کہ ہم جیسا ایک طالب علم اس سے متاثر ہی نہ ہوا بلکہ اگر ان کے بارے میں اگر کوئی مثبت تاثر ان کی ''انگریزی دانی'' کے بارے میں تھا تو وہ بھی زائل ہو گیا۔

محترم شاہ نواز فاروقی صاحب نے مختلف کالم نگاروں کے دلائل کا جس قدر دقت نظر کے ساتھ پوسٹمارٹم کیا ہے، اس کے لئے ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں____ انہوں نے برطانوی نژاد محقق خاتون سلینا کریم کی کتاب Secular Jinnah and Pakistan: What the Nation does not know کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کا ایک باب The Quran & Jinnah's Speeches ہے، اس کتاب میں انہوں نے متعدد آیات نقل کی ہیں جو قائداعظم کی تقاریر کے اقتباسات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قائداعظم کو قرآن پر (انگریزی تراجم/ تفاسیر کے مطالعے سے) کس قدر عبور حاصل تھا۔''

☆......فاروقی صاحب نے اپنے مقالے کا جن الفاظ سے اختتام کیا ہے، وہ سچے اور دردمند دل رکھنے والے مسلمان کی غمازی کرتا ہے موصوف نے لکھا کہ ''____ یہ عناصر سرعام قرآن وسنت کے خلاف صف آرا ہیں مگر نہ ریاست کو اس بات کی فکر ہے اور نہ علماء نے بڑے پیمانے پر اس کے مضمرات ونتائج پر غور فرمایا ہے''

ملت اسلامیہ کا جسد خاکی، اپنی تمام تر جسمانی، روحانی، سیاسی، تعلیمی اور اخلاقی امراض اور مسائل کا جس قدر شکار ہے، اس کے بارے میں یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ

تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم؟

گزشتہ ۷۰ سالوں میں تعلیمی نظام کا جس قدر حلیہ بگاڑ دیا گیا ہے، اس پر وطن عزیز

اور ملت کے سیاسی، تعلیمی، دینی ماہرین نے جس قدر واویلا اور تنقید کی ہے، وہ اگرچہ اس امر کا تو ثبوت ہے کہ ملت اسلامیہ بقول علامہ اقبال

دلِ مردہ، دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

کے تحت ''زندہ رہنے'' کا ثبوت فراہم کر رہی ہے۔ وطن عزیز کے کونے کونے سے اسلامی نظام تعلیم کے اجراء، احیاء اور قیام کے لیے مختلف گوشوں سے مسلسل آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اسی ضمن میں ستمبر ۲۰۱۹ء کے ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن میں ڈاکٹر حافظ حسن مدنی کا ایک مقالہ بعنوان ''دینی مدارس: حکومتی پالیسی اور مطالبے؟'' نامی شائع ہوا ہے۔ اس مقالے میں وفاقی حکومت، اور جنرل قمر باجوہ صاحب آرمی چیف نیز وزیراعظم پاکستان (جناب عمران خان صاحب) اور اتحاد تنظیماتِ مدارس دینیہ کے نمائندہ وفود کی ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے۔

صاحب مقالہ نے گزشتہ حکومتوں کے ادوار میں بھی ان کوششوں کا ایک مبسوط اور مدلل جائزہ لیا ہے جس کا لب لباب ''کہہ مکرینوں، وعدہ خلافیوں، حتیٰ کہ سرکاری تعلیمی امور سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اور اداروں کے اس 'خبث باطن' کی نشان دہی کرتا ہے جو گزشتہ غلامی اور بعدازاں ماضی قریب کے اشرافیہ اور اس قسم کے لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے ___ اس ذہنی حالت پر قرآن کریم کی سورہ الصّف کی ہدایت تو گویا ایسے لگتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ہمارے لیے ہی نازل کی تھی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ (سورہ الصّف: ۲-۳)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں ہو۔''

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ جس انداز کا رویہ روا رکھا تھا، وہ گزشتہ ۷۰ سالوں سے نہ صرف تعلیم کے میدان بلکہ اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے مختلف تاخیری

ہتھکنڈوں سے ٹالا جا رہا ہے ___ شراب، زنا، سود اور دیگر محرمات کی موجودگی میں دعویٰ اسلام، کس منہ سے لازم آتا ہے؟ ___ وطن عزیز کی اعلیٰ ترین عدالتیں ایسے مسائل کو التوا کے کنوؤں میں اتنی دیر تک کے لئے بند کر دیتی ہیں کہ عوام کے ذہنوں سے وہ معاملہ محو ہو جاتا ہے ___ اس قسم کے اعمال وافعال کے ساتھ اپنے ناموں کے ساتھ ''محمد، احمد، عبداللہ'' کے اضافے کیا اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں؟

درج بالا گزارشات کی روشنی میں موجودہ حکومت کے سربراہ اور وزیراعظم سے یہی درخواست ہے کہ خدارا، اپنے وزیر تعلیم اوران کے تحت عملے کو ان ''کہہ مکرنیوں، وعدہ خلافیوں اور دفاتر میں کی جانے والی موشگافیوں'' سے باز رہنے کا حکم دیں اور تعلیمی ماہرین پر مشتمل ایک کمیشن/ بورڈ تشکیل دیں جو جید اہل مسلم (دینی اور دنیوی علوم کے ماہرین اور خود ان میں سے کسی ایک شخصیت کو اس کا چیئر مین بنائیں) پر مشتمل ہو اوران کی آراء تجاویز کو عملی جامہ بنانے کا ایک مرحلہ وار، تدریج کے اصول پر مبنی لائحہ عمل تشکیل دیں ___ کہ ملک وملت کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی انفرادی/ نجی فلاحِ آخرت کا بھی صرف اور صرف یہی ایک راستہ ہے!

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!

ضمیمہ جات

ذیل کے صفحات میں ہم چند ایسی تحریریں بطور ضمیمہ درج کر رہے ہیں جو ہم نے گزشتہ ۲۰ / ۲۵ سالوں میں تعلیم کے موضوع پر سینکڑوں تحریروں سے منتخب کی ہیں جو اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ **اگرچہ یہ موضوع بھی اس قابل ہے کہ اس پر کوئی صاحب قلم اٹھائیں تاکہ موجودہ اور آنے والی نوجوان نسل کو پتہ چل سکے کہ یہ موضوع کس قدر اہم رہا ہے اور اس پر کس قدر محنت ہمارے اہل علم نے کی تھی۔** تاہم اس تمام کے علی الرغم پاکستان کی سیاسی قیادتیں (الا ماشاء اللہ) جو نہ صرف خود ''اَن پڑھ'' اور دین سے بیگانہ تھیں بلکہ وہ بیوروکریسی بھی اس سازش میں ان کے ساتھ شامل تھی جنہوں نے سیاسی طالع آزماؤں کا نہ صرف آلہ کار بننا گوارا کیا بلکہ اس تمام تر ''ڈکیتیوں اور ظالمانہ تعلیمی نظاموں'' کو صحیح سمت اور طریقے پر چلانے میں غفلت ہی نہیں برتی بلکہ گورے ماہرین (امریکن/ یورپین) کے سامنے اس طرح سرنگوں ہوئے کہ اپنی تمام تر تعلیمی وانتظامی برتری کا بھرم بھی برقرار نہ رکھ سکے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا!

اس بیوروکریسی نے زندگی کی شب کو سیاہ اور تاریک تر، اور وطن عزیز کے جسد توانا کو اس قدر نحیف ونزار کر دیا کہ اس کے وجود کا قائم رہنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں لیکن سیاست دانوں اور بیوروکریسی کا ایک ''جم غفیر'' ہے جو اسے جلد از جلد اس کے آخری انجام سے دوچار کرنے میں رات دن کوشاں ہیں لیکن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز

(ضمیمہ الف)

نصابِ تعلیم ......(قسط ۲)

ڈاکٹر سعید احمد ملک

یہ تراشہ روزنامہ نوائے وقت (نومبر ۲۰۰۸) کا ہے۔ کالم نگار ڈاکٹر سعید احمد ملک، وطن عزیز کے مایۂ ناز ماہر تعلیم رہے ہیں۔ کسی زمانے میں انہوں نے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا جس کی قسط نمبر ۲ میں انہوں نے جن ہوشربا حقائق کا انکشاف کیا، وہ پڑھنے کے لائق اور تعلیم کے شعبہ سے تعلق رکھنے والے وزراء/سیکرٹری/ ڈائریکٹرز کے منہ پر ایک طمانچہ ہیں!

''آج سے چند سال قبل میں اپنے ایک محبوب سکول گیا۔ محبوب اس لیے کہ 1950ء میں، میں نے وہاں سے میٹرک پاس کی تھی۔ میں نے تاریخ پڑھانے والے استاد سے ملاقات کے شوق کا اظہار کیا **تو معلوم ہوا ہے کہ تاریخ نام کا مضمون نصابِ تعلیم سے خارج کر دیا گیا ہے،** البتہ اس کے بدلے ''پاکستان سٹڈیز'' کا مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ میں نے اسی کو غنیمت جانتے ہوئے ''پاکستان سٹڈی'' کے استاد سے ملنے کی خواہش کی، ملاقات تو ہوگئی مگر آج بھی جب میں اس استاد سے ملاقات کے لمحات اور ان کی گفتگو کو یاد کرتا ہوں تو مجھ پر وحشت طاری ہو جاتی ہے، **یہ پاکستان سٹڈی پڑھانے والے استاد قائداعظم اور پاکستان کے خون کے پیاسے تھے اور گاندھی جیسے مکار دشمن اسلام کے مداح تھے۔''**

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد !''

''اگر یہ مکتب اور اسی قسم کے استاد رہے تو پھر بچوں کی اخلاقی / معنوی موت سے مفر ممکن نہیں''

انہوں نے اپنے کالم میں مزید لکھا کہ

''شاید آپ پڑھ کر حیران رہ جائیں کہ یہ سکول سندھ یا بلوچستان کے کسی دور افتادہ گاؤں میں نہیں بلکہ لاہور (شہر کے ایسے علاقے میں واقع ہے جو ایک بزرگ ولی اللہ کے قرب میں ہے___) سندھ کا حال تو یہ ہے کہ جب سن ساٹھ کی دہائی میں، میں وہاں پڑھاتا تھا تو **محکمہ تعلیم نے اسلامیات پڑھانے کے لیے ہندو اساتذہ مقرر کیے ہوئے تھے**۔ کاش یہ مسند نشیں سمجھ سکتے کہ:

نگہ دارد برہمن کارِ خود را
نمی گوید بہ کس اسرار خود را
بمن گوید کہ از تسبیح بگزر
بدوشِ برد زنار خود را

''برہمن اپنی گانٹھ کا بہت پکا ہے کہ اپنے دل کی بات کسی کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیتا تاہم ہم جیسے لوگوں کو اس امر کی تلقین کرتا ہے کہ تسبیح کرنا چھوڑ دو لیکن اپنی بغل میں اپنی ''زنار'' (مالا) دبائے رکھتا ہے۔''

''اس ہندوانہ تعلیم کا عملی ظہور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شاید آپ جان کر حیرت زدہ رہ جائیں کہ سندھ پبلک سروس کمیشن کے مسلمان ممبر کے گھر میں اسلامی شعائر کا نام ونشان نہ تھا، ان کے گھر کے در و دیوار پر قرآنی آیات تھیں نہ کوئی اور اسلامی لٹریچر۔ البتہ اس گھر کی الماریوں کے شیشوں پر کرشن مہاراج کی تصویر کشی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ہر صبح آنکھیں کھولتے ہی انہیں کرشن مہاراج کا درشن ہوتا تھا۔ یہ اسی ہندوانہ طرزِ تعلیم کا نتیجہ ہے کہ سندھ کے بیشتر لوگ ہندوانہ طریقے پر چرن چھو کر سلام کرتے ہیں۔''

''تیسری قسم ہمارے دینی مدارس کی ہے جہاں بدقسمتی سے وہ بچے بھیجے جاتے ہیں جو کوئی اور کام کرنے کے قابل نہ ہوں۔ ان میں تمام نہیں مگر کچھ ذہنی طور پر ہی معذور نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی معذور ہوتے ہیں۔ ان مدارس کے طلبہ دینی تعلیم کے علاوہ اور بھی بہت سیکھتے ہیں مثلاً تنگ نظری، چغل خوری، نفرت، ہیرا پھیری، گندگی، دھوکا دہی اور چندہ اکٹھا کرنے کے گر۔ باقی سیئات کا ذکر نہ ہی کروں تو بہتر ہے۔''

(ضمیمہ ب)

تلخ نوائی

محمد اظہار الحق

''تلخ نوائی'' کے عنوان سے ایک مشہور کالم نگار محمد اظہار الحق صاحب نوائے وقت میں کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کا ایک عالم ''احمق'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ کالم انہوں نے امریکہ میں صدر اوباما کے منتخب ہونے پر پاکستانی دانشوروں، سیاستدانوں اور مذہبی راہ نماؤں کے اس ردعمل پر لکھا تھا جس میں توقع کی گئی تھی کہ اب پاکستان کے حالات اور واقعات ٹھیک ہو جائیں گے۔ انہوں نے لکھا:

''تو کیا اوباما تمہیں آ کر بتائے گا کہ تمہارا تعلیمی نظام دنیا کا سب سے زیادہ گلا سڑا نظام ہے۔ اتنا گلا سڑا کہ تعفن کے بھبکے اٹھ رہے ہیں اور خدا کی پناہ، ناک سے کپڑا نہیں ہٹایا جا سکتا۔ ہزاروں سکول چھتوں اور دیواروں کے بغیر ہیں، لاکھوں بچے بیٹھنے کے لیے گھروں سے پٹ سن اور پلاسٹک کے ٹکڑے لاتے ہیں اور ہر حکومت گرانٹ ان **تعلیمی اداروں کو دیتی ہے جو برطانوی حکومت نے ٹوڈیوں کی اولاد کو وفادار رکھنے کے لیے کھولے تھے** اور کیا اوباما بتائے گا کہ سیکرٹری اور وزراء جن سکولوں کی وجہ سے سیکرٹری اور وزراء ہیں، اپنے بچوں کو انہی سکولوں میں بھیجیں۔ کیا دنیا میں کہیں اور بھی اس طرح ہو رہا ہے **کہ مدرسے، سرکاری سکول، مہنگے سکول اور مزید مہنگے سکول بیک وقت چل رہے ہوں؟** اور اگر فرض کریں اوباما آ کر اس ملک کے اقتصادی، سیاسی، تعلیمی، زرعی، عدالتی اور دوسرے نظام آ کر ٹھیک بھی کر دے تو باقی اسلامی دنیا کا کیا بنے گا؟ اس کی مدت صدارت تو صرف چار سال ہے!۔'' (۱۳ نومبر ۲۰۰۸ء)

(ضمیمہ نمبر ج)

ہماری تعلیمی پالیسی

سلیم منصور خالد

اسی طرح سلیم منصور خالد صاحب (جو وطن عزیز کے بہت مشہور ماہر تعلیم اور دانشور ہیں) کی خصوصی رپورٹ روزنامہ نوائے وقت (مورخہ ۱۱ مارچ ۲۰۰۷ء) نے اپنے سنڈے میگزین میں ''ہماری تعلیمی پالیسی'' کے موضوع پر شائع کی۔ انہوں نے اس وقت کے برسراقتدار طبقے کی سات سالہ تعلیمی سرگرمیوں کو ''چھاپہ مار کارروائیاں'' قرار دیتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے ''نظام نصاب اور امتحان کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے''۔ انہوں نے Education in Pakistan: A white paper document to debate National Educational Policy.

پر بہت تفصیل کے ساتھ نقد و تبصرہ کیا ہے۔ اس کے چیدہ چیدہ نکات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

☆......سب سے پہلے تو اس رپورٹ کے اس دعوی کی سختی کے ساتھ تردید کی گئی ہے کہ اس کی تیاری میں وفاق سے ضلعی سطح تک تمام فریقوں سے وسیع پیمانے پر مشاورت کی گئی ہے۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ فیڈریشن، صوبہ جات کی سطح پر کسی بھی ایک قابل ذکر تنظیم سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا۔ ''دعویٰ کرنے والوں کو بھلا کون روک سکتا ہے؟''۔

☆......رپورٹ کی تیاری میں ۱۸ / فروری سے ۱۷ / جولائی ۲۰۰۶ء کے دوران سات تفصیلی کانفرنسیں منعقد کی گئیں نیز وائٹ پیپر کے آخر میں جن ۲۳ گرین پیپرز (Green Papers) کی فہرست دی گئی ہے، ان کے بارے میں بتایا گیا کہ ان (سات) **سماجی تقریبات کو قومی تعلیمی مشاورت کا نام دینا** (جو کراچی/ کوئٹہ/ لاہور/

پشاور اور اسلام آباد میں کی گئیں) علمی دیانت کے منافی ہے۔ نیز درج بالا گرین پیپرز کے وجود سے بھی انکار کیا گیا ہے۔

☆......اس مسودے میں کہیں کہیں چلتے چلتے اسلام کا ذکر آ گیا ہے۔ لیکن شعوری طور پر اس سے اجتناب برتا گیا ہے۔ (دیکھئے قائداعظم کے فرمودات برائے تعلیم)۔

☆...... پاکستان کا سرکاری دستوری نام ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' ہے مگر اس کے برعکس یہاں ایک نئی اصطلاح ''اسٹیٹ آف پاکستان'' استعمال کی گئی ہے۔ سلیم منصور نے بجا طور پر اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ ''کہیں پاکستان کو سیکولرائیز کر کے محض ''اسٹیٹ آف پاکستان'' بنانے کی یہ شروعات ہوں''!۔

☆...... بلاشبہ اس مجوزہ مسودے میں بعض مقامات پر خاصے زوردار انداز میں خود احتسابی پر مبنی جملے لکھے گئے ہیں جن میں درد اور احساس درد پایا جاتا ہے۔ مگر مجموعی پالیسی میں ان ''اعترافات گناہ'' (Confessions) کا مقصد بڑے ٹیکنیکل انداز سے (ماضی کے) پورے قومی نظام تعلیم کو ناقص، ناقابل اعتماد اور ایک بدنما تماشا ثابت کرنا دکھائی دیتا ہے۔ اگر اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ واقعی پاکستان کا موجودہ تعلیمی نظام ایک بے کار ڈھانچے اور متعفن لاش سے زیادہ کچھ بھی قدر و قیمت نہیں رکھتا، تب نظام تعلیم اور تعلیمی ڈھانچے کو تلپٹ کرنا آسان بلکہ جائز اور لازمی بھی ہو جاتا ہے!

اس مقصد کے لیے یہ ملامتی انداز واقعی بڑا موثر ہے۔ اس پالیسی ڈرافٹ میں متعدد اچھی تجاویز بھی ہیں۔ لیکن یہ اس لیے حیرت کی بات نہیں کہ ایسی مثبت تجاویز پالیسی میں پیش تو کر دی جاتی ہیں، **مگر زیادہ سرگرمی سے کام ان تجاویز پر ہوتا ہے جو کام کو الٹ پلٹ کر رکھ دینے والی ہوتی ہیں**۔ آئندہ صفحات میں ایسی تجاویز کی نشان دہی کی جارہی ہے کہ جن پر عمل کا زیادہ امکان اور یقین ہے۔ جبکہ اچھی تجاویز کسی دوسری پالیسی کا حصہ بنتی نظر آئیں گی۔

☆......وائٹ پیپر کے آخر میں پاکستان کی گزشتہ ۹، ۱۰ تعلیمی پالیسیوں (۱۹۴۷، ۱۹۵۱، ۱۹۵۹، ۱۹۶۶، ۱۹۷۰، ۱۹۷۲، ۱۹۷۹، ۱۹۹۲، ۱۹۹۸) کا ایک مختصر تقابلی جائزہ

چارٹ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس تقابلی جائزے میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ **وژن، اور مقاصدِ تعلیم کے حوالے سے ان تمام گزشتہ پالیسیوں میں اسلام ایک غالب مثالی نمونے (Paradigm) کے طور پر موجود رہا ہے، جب کہ زیر نظر پالیسی دستاویز میں پاکستان کے اساسی نظریے، یعنی اسلام کو بالکل نظرانداز کرتے ہوئے جگہ جگہ نام لیے بغیر بے دلیل عقیدہ اور ماضی پرستانہ یاد ایام (Nostalgia) قرار دے کر مسترد کرنے اور بے وزن ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔**

مزید واضح کیا گیا کہ ''۱۹۵۹ء کی تعلیمی پالیسیوں کو چھوڑ کر باقی تمام تعلیمی پالیسیاں، معاشی سرگرمی میں شریک ایک فرد کی ترقی اور بطور شہری نشوونما کا خیال رکھنے والی تعلیم کے لیے محض سیاسی اور نظریاتی ضروریات کی تکمیل کرتی رہیں۔ انجام کار ایسی تعلیم دی جاتی رہی جس کا مقصد قومی استحکام تھا یا پھر روحانی سطح پر عمدہ زندگی کا حصول۔ **اس کے باوصف بے دلیل مذہبی عقائد کا یہ تسلسل، تاریخی طور پر ہمیں ترقی اور سماجی انصاف کے معاملے میں ناکامی سے دوچار کرتا رہا ہے۔ مسلسل تعلیمی تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے ہم ایمان کے غارت گر شکاریوں (Predators of our faith) کے سامنے ہتھیار ڈال (Succumbed) بیٹھے کہ جو اپنی قوت اس ابہام (Ambiguity) سے حاصل کرتے ہیں جو جہالت سے جنم لیتا ہے** ◆ **اور جہاں علم ماضی پرستی کا مظہر ہوتا ہے اس لیے یہ (تعلیمی) پالیسیاں غیر حقیقت پسندانہ اور ترقی کی دشمن تھیں۔''**

یہ فتویٰ دینے والے حضرات، صدر جنرل محمد ایوب خان، صدر جنرل یحییٰ خان، وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، صدر جنرل محمد ضیاء الحق، وزیراعظم محمد خاں جونیجو، وزیراعظم محمد نواز شریف وغیرہ سبھی کی حکومتوں کو چشم زدن میں کورفہم یا ترقی دشمن تعلیمی پالیسیوں کا خالق قرار دے رہے ہیں۔ دیکھنا ہوگا کہ ان تمام تعلیمی پالیسیوں کے مرتبین میں کتنے علماء تھے

◆ صاحبانِ علم ان سے جو معنی بھی اخذ کریں، بہرحال اس میں کم سے کم اسلام کو ''مطعون اور مذموم'' ثابت کرنے کی کوشش کا بہت ''بے تابانہ رندانہ جوشِ جنوں'' واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے!

اور کتنے جدید اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات تھے۔ ہمارے مطالعے کی حد تک مذکورہ بالا تمام ''فرسودہ تعلیمی پالیسیاں'' پاکستانیوں ہی نے تشکیل دی تھیں، **مگر ان جدید تعلیم یافتہ پالیسی سازوں میں بہرحال عقیدے اور ایمان کی شرم موجود تھی۔ ناکامی کی وجوہ کا تعلق اس تہذیبی کمٹ منٹ سے نہیں بلکہ بے بصر سول اور آرمڈ حکمرانی سے ہے۔**

اس قرطاس ابیض کے بنیادی مباحث اور پالیسی سفارشات کو دیکھیں تو جگہ جگہ تضاد اور تکرار سے لتھڑے اس ذہن سے واسطہ پڑتا ہے، جو پاکستان کے نظام تعلیم اور تعلیمی مسائل کا محض ایک سطحی ناظر ہے۔

قومی نصاب تعلیم کے بارے میں اس وائٹ پیپر کے مندرجات کا جائزہ لیتے ہوئے، سلیم منصور خالد صاحب نے بہت ہی فکر انگیز تاہم ایک ایسا تبصرہ کیا ہے جس سے اس **وائٹ پیپر کے مرتب کرنے والوں کی ذہنی مرعوبیت کا پتہ چل رہا ہے** کہ وہ کس کے ایجنڈے کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

''ایجوکیشن ایکٹ ۱۹۷۶ء، پاکستان کے تمام اسکولوں، کالجوں، اور یونی ورسٹیوں پر نافذ ہے، جس کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ پورے پاکستان میں قومی نصاب تعلیم رائج ہوگا۔ مگر افسوس کہ سالہا سال سے اس قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ **سبب یہ ہے کہ ''اے'' لیول اور ''او'' لیول کے بیرونی نصابات دراصل سول، جاگیردار اور مقتدر طبقوں کے اسکولوں یا ان کے پسندیدہ اسکولوں میں رائج ہیں۔ لہٰذا ان کی زیرسرپرستی چلنے والے یہ تمام ادارے وطن عزیز کے رائج الوقت قانون سے بالاتر ہیں۔** زیر بحث پالیسی میں نظام تعلیم کو بین الاقوامی معیار سے ہم کنار کرنے کا خوش کن خواب دکھلا کر غیر ملکی امتحانی نظاموں سے وابستہ ان تعلیمی اداروں کو مزید کشادگی دی جا رہی ہے۔

ابتدائی بچپن کی تعلیم (Early childhood education)

وطن عزیز کے تعلیمی نظام کا ایک بہت بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ماضی میں اس نظام کی باگ ڈور ایسی بیوروکریسی کے ہاتھوں میں رہی ہے جو از خود تو ایم اے ہوں گے لیکن سول سروسز

کا امتحان پاس کرنے کے بعد گویا ان کے ہاتھوں میں الہ دین کا چراغ لگ گیا کہ وہ اپنے آپ کو پروفیشنل تعلیم/ ہائرتعلیم/ انجینئرنگ وغیرہ تمام امور کے بارے میں ارسطو اور سقراط سے کم نہیں شمار کرتے۔ کسی زمانے میں لاہور میں ایک حکیم صاحب ہوتے تھے، ان کا بنایا ہوا ایک نسخہ ''امرت دھارا'' کے نام سے فروخت ہوتا تھا اور ان کا دعویٰ تھا کہ یہ امرت دھارا پیٹ درد/ سر درد/ چوٹ کی وجہ سے درد نیز معدے کی جملہ بیماریوں اور نزلے، زکام کا بیک وقت شافی علاج ہے۔ **ہماری بیوروکریسی کا بھی یہی عالم رہا ہے۔ کہ وہ ہر قومی مرض کے لیے ''امرت دھارا'' کا رول ادا کرتے رہے ہیں!** اس پر مستزاد امر یہ کہ سیاست دانوں میں نہایت ''اَن پڑھ'' لیکن ''اپنی ووٹ پاور'' کی بنیاد پر ایسے ایسے وزراء شعبہ تعلیم کے نگران بنائے جاتے رہے کہ یوں بیوروکریسی اپنے ''امریکن ماہرین تعلیم'' سے مرعوبیت کی بناء پر جو سبق لیتے تھے، وہ وزیر صاحب کو من وعن پڑھا دیتے تھے جبکہ موصوف کا تعلیم و تعلم سے ''واجبی سا تعلق'' ہی ہوتا تھا، وہ فائل پر دستخط کر دینے کے لیے وزیر بنے تھے اور یوں اس پالیسی کا نفاذ ہو جاتا تھا۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے اس قسم کی متعدد مثالیں ایک بہت ہی دردمند استاد (اشتیاق احمد صاحب) کے مضامین سے نقل کی ہیں۔

تاہم سلیم منصور نے مزید لکھا کہ

''ابتدائی بچپن کی تعلیم'' یعنی Early Childhood Education کو پالیسی دستاویز میں زیر بحث لایا گیا ہے۔ تین سے پانچ سال کے بچوں کے لیے یہ تعلیم کی کون سی قسم ہے یا اس کی شان نزول کیا ہے، اسے جاننے کے لیے امریکی اور یورپی پالیسی سازوں کی وہ رپورٹیں ذہن میں رکھی جائیں، جن میں وہ بہ تکرار یہ کہتے ہیں کہ: **مسلم دنیا میں فکری اور تہذیبی تبدیلی کے لیے میڈیا، عورت اور تعلیم کے محاذ پر تو ہنگامی بنیادوں پر کام کرنا ہی ہے، لیکن دراصل مسلمان بچے کو تین چار سال کی عمر ہی میں ہدف بنانے کے لیے جنگی بنیادوں پر کام کرنا چاہیے، تاکہ اس بچے پر مسلم معاشرہ یا مسلم معاشرے کے اساتذہ اپنا کوئی نقش بٹھا نہ سکیں** ـــــ اس مقصد کے لیے امریکی سرکاری ادارے یو ایس ایڈ اور آغا خان ایجوکیشن سروس (یاد رہے یہ وہی آغا خان

ایجوکیشن بورڈ ہے جس نے آج سے قریباً دس سال پہلے نویں/ دسویں اور انٹرمیڈیٹ لڑکے/ لڑکیوں کے لیے جنسی تعلیم کی آگہی کے لئے ایک سوالنامہ ترتیب دیا تھا۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مصنف کی کتاب ۲۰۱۰)۔ ایک مشترکہ منصوبے کے تحت، جبکہ بعض این جی اوز اور عیسائی مشنریوں کی متعدد تنظیمیں، ایک فکری ہم آہنگی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ ان کا اپنا نصاب، اپنا نظام تربیت اور اپنے اساتذہ ہیں۔ اس مجوزہ تعلیمی پالیسی میں بھی ارلی چائلڈ ہوڈ ایجوکیشن کو ایک اچھوتا منصوبہ سمجھ کر پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے: ''فوری طور پر اس ECE کے 42500 مراکز قائم کیے جائیں، جن کے لیے سرکاری مدد لی جائے۔'' اس منصوبے پر کروڑوں روپے کا جو زرمبادلہ خرچ ہوگا، وہ باہر سے قرض کی صورت میں آئے گا۔ لیکن جس طرح پہلے سے قائم سرکاری اداروں کو لازمی ضروریات کی چیزیں فراہم نہ کر کے بے اثر بنایا جا رہا ہے، اس فضا میں بچوں کا یہ بوجھ بھی پہلے پہل پرائمری اسکولوں کے سر تھوپ دیا جائے گا، جو خود پہلے سے جاں بلب ادارے ہیں۔ جب وہ یہ نیا بوجھ نہیں اٹھا سکیں گے تو اس وقت سفید جھنڈا اٹھائے این جی اوز اور غیر ملکی ایجنڈے کی حامل قوتیں سامنے آئیں گی اور مخصوص تربیت اور مخصوص نصاب کے سائے میں ان بچوں کو اپنی گود میں لے کر، جس طرح چاہیں گی، ویسا ذہن بنانے کی کوشش کریں گی۔ یاد رہے کہ اس وقت بھی اندرون سندھ اور اندرون بلوچستان متعدد این جی اوز ''ابتدائی بچپن کی تعلیم'' پراجیکٹ میں بڑی فعالیت سے اپنا دائرہ کار بڑھا رہی ہیں۔

تعلیمی سہولیات کا فقدان

درج بالا حقائق کے بعد سلیم منصور خالد صاحب نے ان تعلیمی سہولیات کا بھی ایک جائزہ پیش کیا ہے جسے جاننے کے بعد نہ صرف اس ملک کے عوام، سیاسی پارٹیوں اور بالخصوص گزشتہ نام نہاد حکمرانوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ان تمام تر حقائق کو جاننے کے باوجود گزشتہ حکمرانوں نے عوام الناس کے بچوں کی تعلیم کے لیے جو ''شاندار بندوبست'' کیے تھے، ان پر انہیں ڈوب کر مر جانا چاہیے لیکن:

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!

اس تمام کے علی الرغم نام نہاد انگلش میڈیم سکولوں (اے لیول/ او لیول) کی بہت ہی ''شاہانہ اور فیاضانہ'' انداز میں فنڈنگ کی جاتی ہے کہ ان سکولوں میں ان کے بچے بھی زیر تعلیم ہوتے ہیں۔ جبکہ پہلے سے موجود سرکاری اسکولوں کی حالت زار کا نقشہ حکومت پاکستان کی تازہ ترین نمبر شماری (Census) کے مطابق اس طرح سامنے آتا ہے:

☆......''53,4810 اسکولوں کے گرد چار دیواری موجود نہیں ہے۔

☆......46,7660 سرکاری اسکولوں میں پینے کے پانی کا بندوبست (نلکا) تک نہیں پایا جاتا۔

☆......57,2160 اسکولوں میں بیت الخلا کا وجود نہیں ہے۔

☆......81,6330 اسکولوں میں بجلی کا کنکشن نہیں ہے

☆......اور 9,7760 اسکولوں کی کوئی عمارت تک نہیں اور وہ درختوں کے سائے میں یا کسی سے جگہ مانگ کر اسکول چلا رہے ہیں۔'''' (نیشنل ایجوکیشن سینسس پاکستان، اسلام آباد دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۲۷)

ایک طرف عالم یہ ہے اور دوسری جانب نئے نئے منصوبوں پر قوم کا قیمتی زرمبادلہ پھونکا جا رہا ہے۔ پہلے ''نئی روشنی'' اور پھر ''پڑھا لکھا پنجاب'' جیسے منصوبوں میں کتنا سرمایہ واقعی تعلیمی اداروں کی بہتری پر خرچ ہوا، اور کتنا محض تنخواہوں اور کتنا انگریزی اخبارات اور ٹیلی ویژن پر بے مغز تشہیری مہم کی آگ میں جھونکا گیا؟ اس حقیقت سے حکمران طبقہ پوری طرح آگاہ ہے۔ اس پس منظر میں ''ابتدائے بچپن کی تعلیم'' کے 42500 مراکز کے منصوبے پر یقیناً اخراجات کا سیلاب لایا جائے گا۔ اس کے لیے وائٹ پیپر میں ''الگ بجٹ کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔''

ان ہوشربا حقائق زمینی کے بارے میں کچھ مزید کہنا شاید لاحاصل ہو کہ اس تمام تر دور میں جو ۲۰۰۷ سے آج ۲۰۲۰ تک کسی بھی برسر اقتدار پارٹی نے چار دیواری، کمروں، پانی، بجلی، بیت الخلاء کا کوئی بندوبست ہی کر دیا جاتا____ جہاں تک حزب اختلاف کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک حصولِ اقتدار کے علاوہ اور کوئی مقصد وقعت نہیں رکھتا!

گریز از طرز جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید!

ضمیمہ د

مخلوط تعلیم

(اقتباس کتاب ''جنسی تعلیم: اسلامی تناظر میں'')

ڈاکٹر محمد آفتاب خان

مخلوط طرز تعلیم کا موضوع بھی ہمارے سیاستدانوں نیز بیوروکریسی کا ایک بہت ہی محبوب موضوع رہا ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ قوم کی تمام بچیاں اور عورتیں، وہ طرز زندگی (مخلوط مجالس، بے پردگی اور عریانی نیز جنسی بے راہ روی) اختیار کر لیں جو امریکہ یا مغربی ممالک میں رائج ہے۔ آج سے ایک دہائی قبل ''صحت جنس کی آگاہی مہم'' ایک سوالنامہ دسویں اور انٹرمیڈیٹ کی طالبات اور طلبہ سے پُر کروایا گیا تھا جس میں جنسی تعلقات اور شراب نوشی سے متعلق سوالات کیے گئے تھے۔ راقم نے اپنی کتاب (۲۰۱۲) میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس سوالنامے کے مرتبین سے یہ سوال کیا تھا کہ کیا وہ یہ تمام سوالات اپنے بیٹوں/بیٹیوں سے پوچھنے کی جرأت رندانہ کر سکتے ہیں؟ تاہم بعد ازاں اس پر قومی سطح پر کافی لے دے ہوئی۔ نمعلوم ان معلومات کی بنیاد پر جو انہیں حاصل ہوئیں یا خود ہی پُر کر دی گئیں ◆ سے کیا نتائج اخذ کیے گئے اور انہیں اب ملت اسلامیہ کی جڑوں کو کس طرح خراب کرنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ تاہم خاندانی نظام کی تباہی کے لئے جنسی طوفان کے جس طوفانِ بے مہابا نے وطن عزیز کو اپنے پنجوں میں جکڑا ہوا ہے اس میں ملک کی اشرافیہ، گزشتہ سیاست دان اور بیوروکریسی کا ہاتھ واضح طور پر نظر آ رہا ہے!

گزشتہ صفحات میں مذکورہ وائٹ پیپر کے بارے میں سلیم منصور خالد نے کہا:

ابتدائی تعلیم تک رسائی کے عنوان کے تحت ایک سفارش یہ کی گئی ہے کہ: ''پرائمری کی

◆ ایسا بھی ہوتا ہے تحقیق کے کاموں میں جسے معروضی مطالعہ (Objective Study) کی خوبصورت اصطلاح سے لوگوں کو مرعوب کیا جاتا ہے!

تعلیم خصوصاً دیہی علاقوں میں مخلوط پرائمری اسکولوں میں دی جائے، جنہیں آہستہ آہستہ مڈل اسکولوں میں اَپ گریڈ کر دیا جائے۔'' یہ اقدام ملفوف انداز میں مڈل تک مخلوط تعلیم رواج دینے کی تدبیر ہے (دوسری طرف نجی شعبے میں عملاً انٹر اور ڈگری کلاسوں میں مخلوط تعلیم تیزی سے رواج پکڑ رہی ہے اور بعض جگہ تو میٹرک کی سطح پر بھی ایسا ہے)۔ پاکستان کے دینی اور ثقافتی ماحول کو سامنے رکھتے ہوئے، نیز تعلیمی نفسیات کے تقاضوں کے پیش نظر یہ سفارش نہ صرف نا قابل قبول، بلکہ تباہ کن ہے۔ اس کے مجوزین کے پیش نظر یہ تعلیمی ترقی سے زیادہ نام نہاد روشن خیالی کا اظہار ہے۔ ''فعال انتظام اور اخراجات کی بچت'' کے نام پر لڑکے لڑکیوں کے اسکولوں کا پہلے انضمام ہوگا، پھر وہاں پر موجود خواتین اور مرد اساتذہ کے لیے بھی اسی ادارے میں گنجائش پیدا کی جائے گی۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو اس مخلوط تعلیم کو کہاں رائج کیا جائے گا؟ تعلیم کے نام پر جہالت پھیلانے والے صلاح کاروں (Consultants) کے اس ہدایت نامے کے اخلاقی نتائج تو ایک طرف رہے، یہ اقدام خود دیہی علاقوں میں بہت سے بچے بچیوں کے لیے تعلیم کے دروازے بند کرنے کا سبب بن جائے گا۔ ◆ حالانکہ دوسری جانب یورپ اور امریکہ تک میں جداگانہ تعلیمی اداروں کا مطالبہ اور تقاضا شدت پکڑتا جا رہا ہے، غالباً ہمارے مقتدر حضرات اس علمی مباحثے سے بے خبر ہیں۔

سلیم منصور خالد صاحب نے یورپ اور امریکہ میں جداگانہ تعلیمی اداروں کے مطالبے کے بارے میں لکھا کہ ''غالباً ہمارے مقتدر حضرات اس علمی مباحثے سے بے خبر ہیں۔ ایسا نہیں بلکہ یہاں دیوانہ بکارِ خود ہشیار والا معاملہ ہے۔ اس ضمن میں مصنف کی کتاب (2006) اور اس کا اردو ترجمہ (2010ء) سے درج ذیل چند اقتباسات شاید، صاحبان اقتدار کی معلومات میں اضافہ کر سکیں کیونکہ یہ آراء/ تجربات ان لوگوں کی ہیں جن پر صاحبانِ اقتدار ایمان بالغیب کی حد تک یقین رکھتے ہیں یعنی وہ حضرات اور خواتین جن کا تعلق ''چٹی چمڑی'' سے ہے!

◆ ظاہر ہے کہ دیہی علاقوں میں ابھی اتنے بڑے پیمانے پر بے غیرتی کا چلن نہیں جسے ہمارے تعلیمی ماہرین (اپنے اہل خانہ کو چھوڑ کر) ملک میں پھیلانا چاہتے ہیں!

☆......ایک ماہر تعلیم خاتون (Wendey Kaminer 1998) رقمطراز ہیں کہ ''امریکہ میں عورتوں کو تعلیم کے حصول کا حق انہیں ووٹ دینے کے حق سے ایک سو سال قبل مل گیا تھا۔ امریکہ میں عورتوں کی جس پہلی نسل نے تعلیم حاصل کی، وہ یک صنفی (Single Sex) سکینڈری اور انڈر گریجوایٹ تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل تھیں۔'' انہوں نے مزید لکھا کہ

''یک صنفی سکولوں میں تعلیم کا شعور ایک انتخاب نہ تھا بلکہ اس کا تعلق (یورپ میں) ایک ایسے وقت میں ان تہذیبی روایات سے تھا جبکہ مرد وعورت کے علیحدہ رہنے کا تصور (Seggregation) ایک فطری امر سمجھا جاتا تھا۔ تاہم 1910ء تک 58 فی صد مخلوط تعلیمی ادارے بن گئے تھے۔''(ص ۲۴۲)

☆......''عورتوں کے حقوق کی پاسدار خواتین (Feminists) کا عمومی تاثر یہ ہے کہ مخلوط تعلیمی ادارے لڑکیوں کی عزت نفس (Self Esteem) پامال کرنے والے ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کی بجائے سخت حوصلہ شکنی ہو رہی ہے۔ بالخصوص حساب اور سائنس جیسے مضامین کے لیے۔ بہت سے والدین اور طالبات اس خیال کے حامی ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی لڑکیوں کو لڑکوں کی چھیڑ چھاڑ اور خواہشات نفسانی جیسے امور سے حفاظت کی جائے۔(ص ۲۴۳)''

ایک دوسرے محقق نے کہا:

☆......''امریکہ کا تعلیمی نظام لڑکیوں کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔ سکولوں کی تمام سطحوں پر صنف پر مبنی تفاوت (Gender Bias) ایک بڑا مسئلہ ہے جس کی اہم وجہ یہ ہے کہ جنسی خوف وہراس نے ایک طاعون کی شکل اختیار کر لی ہے اور یہ جنسی خوف گریڈ لیول کے سکولوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یکساں تعلیمی معیار کے لڑکے اور لڑکیاں سکول میں داخل ہوتے ہیں لیکن ۱۲ سال بعد لڑکیاں اپنے کلاس فیلو لڑکوں سے بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔ خاص کر ہائی لیول کا حساب اور دیگر امور مثلاً احترامِ ذات (Self Esteem) کے حوالے سے (Anon, 1999)۔''

☆......''لڑکیاں تعلیمی میدان میں ہار جاتی ہیں چاہے وہ سکول کا کام کرنے میں کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں۔ لڑکوں کا بار بار تھوکنے کا عمل (Spit ball)، **باتونی پن اور لڑکیوں کی چوٹیوں کے پھندنے (Pony Tails) کو کھینچتے رہنے کی عادت کی** وجہ سے کلاس میں لڑکیوں کی توجہ بٹ جاتی ہے اور یوں ان کا تعلیمی معیار متاثر ہوتا ہے۔''

☆......ایک اور ماہر تعلیم (Gilder, GF, 1975) رقمطراز ہیں کہ ''یہ مفروضہ دنیا کے کسی بھی مہذب معاشرے میں نہیں پایا جاتا کہ **لڑکے اور لڑکیوں کو جب بھی ممکن ہو، ایک جگہ ٹھونس (Thrown Together) دیا جائے**۔'' یہی ماہر تعلیم رقمطراز ہیں کہ'' آیئے ہم اس پر چند سادہ لیکن اہم اور بظاہر نا قابل ذکر حقائق کی روشنی میں غور کریں کہ ایک ہائی سکول کے کلاس روم میں کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ ایک ایسے ماحول میں بہت سے لڑکے اور لڑکیوں کی ایک معتدبہ تعداد ہر وقت ایک دوسرے کے بارے میں سوچ رہی ہوتی ہے، اگر آپ اس بات پر یقین نہیں کرتے تو آپ کو اس کے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ آپ خواب دیکھ رہے ہیں یعنی (Dreamer) ہیں۔''

☆......اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک اور خاتون ماہر عمرانیات (Patricia Cayosexton 1969) کا تبصرہ بھی نقل کریں۔ وہ رقمطراز ہیں:'' کہ **مخلوط تعلیمی اداروں میں جسم اور دماغ ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل ایک ذہنی رابطے (Rub Together) میں رہتے ہیں** اور یہ سلسلہ کنڈر گارٹن سے بلکہ گریجوایشن کی تعلیم کے اختتام تک جاری رہتا ہے۔ یوں لڑکوں اور لڑکیوں میں جنسی افعال بہت کم عمر سے ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ کلاس رومز شدید قسم کے جنسی اکھاڑے (Sexual Arena) کا منظر پیش کرتے ہیں جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کو رجھانے کے لیے آرائش و زیبائش کرتے ہیں۔'' مزید برآں یہ ماہر خاتون لکھتی ہیں کہ: ''سکولوں میں ایسے لڑکے بھی ہوتے ہیں جو بہت حد تک لڑکیوں سے مماثلت (Feminine Boy) رکھتے ہیں۔ ہر پہلو سے سکول میں فوقیت حاصل کرنے کی دھن میں سرگرداں رہتے ہیں۔ کلاس روم میں بہت تابعدار اور معصوم تاہم ان کی جارحیت/

شرارتیں دیگر امور میں بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ وہ کالج کیمپس میں ایک طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ نیز وہ مشت زنی (Masterbation) کی عادت میں بری طرح سے مبتلا ہوتے ہیں اور اس کے بارے میں ہر وقت سوچتے رہتے ہیں حتیٰ کہ انہیں سکول میں اپنے گریڈ/ پوزیشن کی بھی پرواہ نہیں ہوتی اور عام طور پر اپنی صلاحیتوں کو انفرادی اور اندرونی خرابیوں میں ڈھال کر چال چلن کی بہت سی خرابیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ ہم جنسیت (Homosexuality) اور تشدد (Violence) ان کا خاص شغل ہوتا ہے اور منشیات (Drugs) کا استعمال ان کے لیے تسکین کا ذریعہ''۔۔۔ امریکہ میں مخلوط تعلیم کے بارے میں درج بالا ان اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ صورت ہوگی، وہاں نتائج بھی اسی طرح کے حاصل ہوں گے۔۔۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے سیاست دان/ بیوروکریسی اور دیگر لوگ اپنے بچوں/ بچیوں کے ساتھ اس سلوک کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہیں؟۔۔۔ ہمیں یقین ہے کہ بیس کروڑ کی آبادی والے اس ملک میں شاید ہی کوئی ایک فرد اس صورت حال پر برملا صاد کرنے والا ہو؟

□ ضمیمہ ر:

بچوں کی اخلاقی تربیت

کلامِ اقبال کی روشنی میں

یہ ضمیمہ دراصل ایک مقالے کا حصہ ہے جو مجلہ دعوۃ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ''بچوں کی اخلاقی تربیت، کلام اقبال کی روشنی میں ۲۰۱۸ء میں دو اقساط میں شائع ہوا تھا___ اس کے مندرجات نہ صرف اس کتاب میں جستہ جستہ استعمال کیے گئے ہیں بلکہ بقایا حصہ جو بڑے بچوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق ہے، وہ بھی موضوع کی اہمیت اور تعلق کی بناء پر شامل کتاب کر دیا گیا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں تعلیمی نظام میں ابتری کی سب سے بڑی وجہ قرآن وحدیث نیز سیرتِ طیبہ ﷺ سے دوری اور بیگانگی کی ہے۔ جس کی بناء پر یہ نظام اُن تمام تر اخلاقی صفات اور زندگی کے مقصد اور نصب العین سے اپنے زیر تعلیم بچوں کو روشناس نہ کرا سکا جو رسولِ ہاشمی ﷺ کی امت کا ہونا چاہیے تھا۔ مزید برآں، ماضی قریب میں وطن عزیز میں کرپشن، رشوت، ناانصافی اور معاشی بدحالی کے جس دور سے ملت اسلامیہ کو نبرد آزما ہونا پڑا، اس کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ قوم بحیثیتِ مجموعی اور معلم یعنی معمارِ قوم بھی اس اخلاقی انحطاط سے اپنا دامن نہ بچا سکا اور یوں وہ اس اخلاقی کردار اور نمونے کا ماڈل اپنے زیر تعلیم وتربیت طلبہ تک منتقل نہ کر سکا۔ منبر ومحراب سے بھی اسلامی تعلیمات کا وہ پیغام ازلی وابدی سبق نہ دیا جا سکا۔ یوں امت گمراہی اور پسماندگی کے گہرے گڑھوں میں بتدریج غرق ہوتی چلی گئی اور نوبت بہ اینجا رسید کہ ڈاکٹر محمود غازی نے اپنے ایک لیکچر (۱۹۹۹) میں فرمایا کہ:

''آج کے بیش تر تعلیم یافتہ حضرات فکری لحاظ سے سیکولر اور طرزِ عمل کے اعتبار سے

غیر شعوری طور پر مادہ پرست بن چکے ہیں۔ زبانی اعلانات اور جذباتی اظہار کی حد تک اسلام سے وابستگی بھی وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی چلی جا رہی ہے۔''____اسی لیکچر میں ڈاکٹر محمود غازی مرحوم نے مزید فرمایا کہ:

''حال ہی میں ایک سروے کے مطابق مغربی ماحول میں تعلیم پانے والی'' مسلمان ''نوجوان نسل کی ایک خاصی تعداد اپنے آپ کو لا مذہب اور ملحد قرار دیتی ہے۔ چند ماہ قبل ایسا ایک سروے امریکا میں کیا گیا، جہاں اسّی نوے لاکھ مسلمان بستے ہیں۔ اس سروے کی رو سے کم وبیش ایک تہائی ''مسلم'' نوجوانوں نے اپنے آپ کو لا مذہب اور ملحد ٹھہرایا۔''

ہمارا خیال ہے کہ اب وہ مرحلہ آ گیا ہے جب ہم کلامِ اقبال میں بچوں کے لیے بیان کردہ تربیتی افکار کا جائزہ لیں۔ اس سے من جملہ ان کی دور اندیشی اور دقت نظر اور اس محبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو انہیں نئی نسل کے ساتھ تھی جنہوں نے کل جوان ہو کر اس امت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ یاد رہے کہ ہم نے یہ تمام نظمیں ان کی اردو شاعری کے مجموعہ (کلیاتِ اقبال، ۱۹۹۵ء، سروسز بک کلب) سے لی ہیں۔ تاہم موجودہ دور میں مختلف اداروں کی جانب سے پیامِ اقبال کو عوام الناس بالخصوص نوجوان نسل میں مقبول کرنے کے لیے چند کتب نہایت خوبصورت انداز میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان کتب میں اردو ورثہ کے تحت ''انتخاب کلام'' علامہ اقبال (ترتیب وتعارف محمد رضا کاظمی)، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس (۲۰۰۹ء) نے شائع کی جو کچھ سکولوں میں بطور نصابی کتاب شامل ہے۔ نیز ایجوکیشنل ریسورس ڈیویلپمنٹ سنٹر کراچی نے ''میرا اقبال'' کے نام سے پانچ کتابوں کا ایک نہایت ہی جاذب نظر اور خوبصورت سیٹ شائع کیا ہے جو چوتھی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت کے بچوں کے لیے علامہ اقبال کی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان تمام کتابوں کا مقصد بچوں میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور انہیں اقبال کے افکار سے روشناس کرانا ہے۔ نیز اس ضمن میں ایک مسلمان خاتون نے ان کتب کا ایک نہایت ہی امتیازی وصف یہ ہے کہ بچوں کی عمر اور ذہنی نشوونما کا خیال کرتے ہوئے نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے اور کلام کے بنیادی تصورات نیز مشمولات، سوالات اور عملی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فرہنگ میں نئے

الفاظ، ان کے تلفظ اور معانی بھی کتاب کے آخر میں درج کیے گئے ہیں۔ بقدرِ ضرورت ان تمام اہم ترین معلومات کو ہم نے اپنے اس مقالے میں شامل کیا ہے جس کے لیے ہم ادارے کے ممنون ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر ہارون الرشید تبسم (۲۰۱۸) کی کتاب بھی ایک عمدہ کوشش ہے!___ گزشتہ صفحات میں ہم نے آفاق نامی ایک ادارے کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے بچوں کو اقبال سے متعارف کرانے کے لئے متعدد عمدہ کتب شائع کی ہیں۔

ذیل میں ہم علامہ اقبال کی چند نظموں (بانگ درا) کے بارے میں گفتگو کریں گے جو بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اس ضمن میں بچوں سے مراد چوتھی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک کے بچے ہیں۔ جب کہ اس سے بڑی عمر کے بچوں (نویں تا دسویں بلکہ انٹرمیڈیٹ تک) کے لیے چند دیگر نظموں کی نشان دہی بھی علیحدہ سے کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ یہ عمومی تقسیم زمانۂ حال میں اپنے بچوں اور نوجوان نسل کی اردو زبان سے بیگانگی اور کم فہمی کی بناء پر کی گئی جو گزشتہ ۴، ۵ دہائیوں میں سکولوں میں اردو زبان سے بطور تدریسی زبان بے اعتنائی اور انگریزی پر تمام تر زور صرف کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ یہاں شاید اس امر کی صراحت بھی ضروری ہے کہ انگریزی زبان کو انگریز کے دور سے لے کر زمانۂ حال (قریباً تین سو سال) تک جو اہمیت دی گئی ہے، اس کے نتیجے میں آج تک کوئی ایسی قابل ذکر شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو شیکسپیئر/ملٹن کے ہم پلہ ہوتی، البتہ یہ ضرور ہوا کہ بچے اپنی مادری زبان اردو بھول گئے اور گزشتہ صدیوں میں جو سرمایۂ علم نہ صرف دینی علوم (قرآن و حدیث سیرت) بلکہ تاریخ، ادب، سوانح، شاعری اور دیگر علوم میں تخلیق ہوا تھا، اسے بھی سمجھنے سے قاصر ہیں اور یوں ان کا رشتہ اپنے ماضی، مشاہیر اور ان کے کارناموں سے کٹ کر رہ گیا۔

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے!

الف۔ چھوٹی عمر کے بچوں کی نظمیں

۱۔ ایک مکڑا اور مکھی، بانگ درا (۱۹۰۱ء) میں کہی گئی ماخوذ نظم
۲۔ ایک پہاڑ اور گلہری، بانگ درا (۱۹۰۱ء) میں کہی گئی ماخوذ نظم

۳۔ایک گائے اور بکری
۴۔ ہمدردی، بانگ درا (۱۹۰۱ء) میں کہی گئی ماخوذ نظم
۵۔ بچے کی دعا، بانگ درا (۱۹۰۱ء) میں کہی گئی ماخوذ نظم
۶۔ پرندے کی فریاد، ۱۹۰۳ء میں کہی گئی تھی جو سب سے پہلے اردو رسالہ ''مخزن'' میں شائع ہوئی۔
۷۔ ماں کا خواب بانگ درا (۱۹۰۱ء) میں سکولوں کی تدریسی کتب کے لیے کہی گئی۔
۸۔ ترانۂ ہندی، بانگ درا (۱۹۰۴ء) ہندوستان کے شہری کی حیثیت سے محبت وطن میں لکھی گئی نظم
۹۔ترانۂ ملی، بانگ درا (۱۹۱۲ء) اس نظم میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تمام جہان کو اپنا وطن قرار دیا۔
۱۰۔ایک آرزو، بانگ درا، ۱۹۰۲ء میں رسالہ مخزن میں شائع شدہ۔
۱۱۔ چانداور تارے، بانگ درا، ۱۹۰۵ء میں یورپ کے قیام کے دوران کہی گئی نظم
۱۲۔جگنو، بانگ درا ۱۹۰۴ء میں اردو رسالہ مخزن میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔
۱۳۔ درج بالا نظموں کے علاوہ بھی علامہ کے کلام میں جابجا تعلیمی افکار کے بارے میں راہ نمائی ملتی ہے جس کا ایک اجمالی جائزہ مصنّفین نے اپنے مقالے (۲۰۱۷) میں لیا ہے۔

ب۔نوجوانوں کے لیے کہی گئی نظمیں

جیسا کہ ہم نے گزشتہ سطور میں واضح کیا کہ درج بالا نظمیں بچوں (آٹھویں جماعت بعمر ۱۳، ۱۴ سال) کے لیے ہیں جب کہ ان سے بڑی عمر کے بچے (میٹرک/ انٹرمیڈیٹ کے لیے)، ان کی ذہنی نشوونما کے لحاظ سے علامہ کی نظمیں، غزلیں اور رباعیات بھی ہیں (یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اقبال کی چند نظمیں ایسی بھی ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئیں لیکن ان کے اردو کلام کے پانچ مجموعوں میں جگہ نہ پا سکیں) جن میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:
۱۔ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، بانگ درا (ص ۸۷)

۲۔طفل شیر خوار، بانگ درا (ص ۴۴)

۳۔خطاب بہ جواناں، بانگ درا (۱۸۰)

۴۔شہد کی مکھی،مختلف رسالوں میں چھپنے والی نظم جو شاعری کے کسی مجموعے میں نہیں

۵۔ جہاں تک ہو سکے نیکی کرو، یہ بھی اس نوعیت کی نظم ہے جو اقبال کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں، تاہم رسائل میں شائع ہوئی۔

۶۔ بلالؓ

۷۔شکوہ

۸۔دعا

۹۔طارق کی دعا

ان چند بنیادی گزارشات کے بعد اب ہم اپنی گفتگو کے پہلے حصے کی ان چند نظموں میں پائے جانے والے اخلاقی تربیت کے اجمالاً ذکر پر مرکوز کریں گے جس کی بنا پر ان نظموں کو شامل نصاب کرنا بہت ضروری ہے۔ یاد رہے کہ پاکستان کی تاریخ میں ۱۹۸۰ء کے بعد زیور تعلیم سے بہرہ مند ہونے والی نوجوان نسل جس قدر اخلاقی زوال اور بے راہ روی کا شکار ہوئی ہے، اس قدر تنزل انگریزی دور میں واقع نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ تین چار دہائیوں میں اپنوں کی کج فہمی اور امریکی غلامی کے نتیجے میں یہ بے راہ روی ایک ایسے اژدہے کی شکل اختیار کر چلی ہے جس کی زہرناکی کا شکار مسلم بچے اور نوجوان نسل ہو رہی ہے۔ ان بتان عصر حاضر کے بارے میں جو لبرل تعلیمی نظام کے متعدد سکولوں/ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں یا فارغ ہو چکے ہیں، علامہ نے کیا خوب تبصرہ کیا تھا:

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آزرانہ!

یہاں ہم تھوی دیر کے لیے موضوع زیر بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے بانگ درا میں شامل ''فردوس میں ایک مکالمہ'' کی جانب اپنے قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہیں گے جو گزشتہ صفحات میں درج کی گئی ہے۔

اب ہم چھوٹے بچوں کے لیے چند نظموں کی ان اخلاقی خوبیوں کومختصراً بیان کریں گے جومعصوم بچے اپنی جسمانی، ذہنی نشوونما اور استعداد کے مطابق ان کے پڑھنے سے اخذ کرتے ہیں اور چونکہ اس عمر میں ان کا ذہن ایک ایسی صاف شفاف تختی/سلیٹ کی مانند ہوتا ہے جس پر لکھی گئی تحریری انمٹ ہوتی ہے جوعمر بھر ان کی راہ نمائی کرتی رہتی ہے۔

۱۔ بچے کی دعا: اس تحریر کے آغاز میں ہم نے علامہ اقبال کی اس نظم کا ذکر کیا تھا جو عرصہ دراز تک سکولوں میں صباحی خطاب میں کورس کی شکل میں دہرائی جاتی رہی اور اس کے اخلاقی مضمرات کا ہی نتیجہ تھا کہ وطن عزیز (اپنی عمر کے ابتدائی دنوں سے لے کر تین چار دہائیوں تک) ہر قسم کے باہمی جنگ وجدل، قتل وغارت، تشدد اور بہت سے رذائل سے جو آج کل عام ہو گئے ہیں، محفوظ و مامون رہا۔ اس نظم میں مخفی اخلاقی تعلیمات کا تعلق بنیادی طور پر اسکے عنوان یعنی ''بچے کی دعا'' سے ہی ہوتا ہے۔ بچے اپنے معصوم ذہن اور والہانہ انداز میں اس غیبی طاقت (اللہ تبارک وتعالیٰ) سے دعا کرتے ہیں جن سے ان کے ذہن میں عقیدۂ توحید کا بیج، ابتدائی زندگی ہی میں پڑ جاتا ہے۔ عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ، وہ اس عقیدۂ توحید کے مضمرات سے آگاہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور یوں اللہ کی ذات پر ان کا یقین اور ایمان پختہ سے پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ عقیدۂ توحید وہ بنیاد ہے جس پر اسلام کی تمام تر تعلیمات کا دار و مدار ہے۔ اسی عقیدے کی بناء پر وہ رسول ﷺ کی بعثت اور آخری نبی ہونے پر ایمان لاتے ہیں۔ غرضیکہ دیگر تمام بنیادی عقائد (فرشتے اور آخرت، انبیائے کرام، کتب سماوی) پر ایمان لانے کا انحصار بھی اسی عقیدۂ توحید پر مبنی ہے۔ یہی عقیدۂ توحید میں اصل اور بنیاد ہے جس نے عرب کے جاہل اور مختلف برائیوں میں مبتلا بدوؤں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ آج بھی اس میں یہ طاقت موجود ہے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے؟

اس نظم میں، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بھی بتایا گیا، ایک بچہ اللہ سے اپنے علم میں

اضافے، نیکی کرنے اور برائی سے بچنے، نیز غریبوں، کمزوروں، بوڑھوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی مدد کرنے کی دعا کرتا ہے۔ اس دعا سے اسے وطن کی محبت اور قدر و قیمت اور شمع کی طرح اسلام کی دعوت سے کل عالم کو روشنی سے منور کرنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ غرضیکہ وہ سکول کی زندگی میں جب آٹھ دس سال تک روزانہ ان امور کو دہراتا رہتا ہے تو پھر یہ صفات اس کی زندگی میں رچ بس جاتی ہیں۔

۲۔ ایک مکڑا اور مکھی: بانگ درا میں شامل اس نظم کے ضمن میں سب سے پہلے تو یہ امر غور طلب ہے کہ بچہ جب عہد طفولیت سے نکل کر کسی قدر ہوش سنبھالتا ہے تو اسے ہوا میں اڑتی مکھیوں (جو اسے بھی کافی حد تک زچ کرتی ہیں) اور گھر کی چھت پر جالا بنانے والی مکڑی/مکڑا نظر آتے ہیں، سکول میں چوتھی، پانچویں جماعت تک وہ ان دونوں سے نہ صرف آگاہ ہو جاتا ہے بلکہ ان سے اسے گھن بھی آنے لگتی ہے۔ یہاں علامہ اقبال کی نکتہ دانی کی داد دیجیے کہ انہوں نے اس نظم کے ذریعے سے بچوں کی توجہ ایسے پہلوؤں کی جانب مبذول کرائی جس میں رذائل اخلاق میں سب سے بڑی برائی خوشامد ہے۔

علامہ نے اس نظم کے ذریعے سے بچوں کو بذریعہ خوشامد نہ صرف کام نکالنے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کی برائی سے آگاہ کیا ہے بلکہ اس امر کی وضاحت بھی کر دی کہ ایک انسان کو خوشامد کے جال میں پھنسنے کی ہر ترکیب کو سمجھنا چاہیے اور اس کے جال میں نہیں آنا چاہیے، وگرنہ اس جال میں پھنس جانے کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہی نہیں، بلکہ اپنی جان سے ہاتھ دھونا بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ بالآخر مکھی، مکڑے کی خوشامدانہ تعریف کے جال میں پھنس کر اپنی جان گنوا بیٹھی۔

یاد رہے کہ خوشامد کو سرسید احمد خان نے دل کے امراض میں سب سے مہلک مرض قرار دیا ہے۔ اپنے اس مضمون میں جو میٹرک کی نصابی کتاب میں شامل ہوتا تھا، انہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کرنے کی بہت عمدہ کوشش کی۔ تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس امت کے دو عظیم اہل علم نے کیوں اس موضوع کو اس قابل سمجھا کہ ایک نے اپنے مضمون اور دوسرے نے نظم کے ذریعے سے امت کے نونہالوں/ جوانوں کو بالخصوص

آ گاہ کرنا ضروری سمجھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خوشامد ایک ایسی رذیل صفت ہے کہ اس کا کرنے والا اپنی عزت نفس کو ہاتھ سے کھو دیتا ہے اور جب ایک دفعہ وہ اس ''ہتھیار'' سے لیس ہو کر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر وہ تمام عمر اس ہتھکنڈے کو استعمال کرنے کا عادی بن جاتا ہے۔ دوسری جانب وہ شخص جو خوشامد سے متاثر ہو کر، اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہو کر، خوشامد کرنے والے کی بات مان لیتا ہے تو وہ اس امر کا برملا اعلان کرتا ہے کہ: ''وہ ایک بیوقوف اور چھچھورا شخص'' ہے۔ چونکہ اس قسم کے لوگ اکثر و بیشتر امیر کبیر بھی ہوتے ہیں جو کسی کو اپنے بارے میں تعریف کرتے دیکھ کر اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ واقعی وہ ان ''صفاتِ عالیہ'' سے بہرہ مند بھی ہیں اور یوں وہ خوشامد کرنے والے کی باتوں میں بآسانی آجاتے ہیں۔ اس نظم کا مرکزی خیال خوشامد کرنے اور اس کے برے اثرات سے بچنے پر مبنی ہے۔ موجودہ زمانے میں سرکاری اور سیاسی مناصب پر براجمان لوگوں کی زندگی میں اس امر کا مشاہدہ بآسانی کیا جا سکتا ہے جو اپنے آپ کو ظل اللہ کہنے والے لوگوں کو مختلف انداز میں نوازتے ہیں۔ یا بزعم خود ''خادم اعلیٰ'' کا لقب اپنے ساتھ لگا لینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں!

۳۔ ایک پہاڑ اور گلہری: بانگ درا کی بچوں کی نظموں میں اس نظم کو بھی یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نظم کے ذریعے سے علامہ اقبال نے بچوں کو جس اخلاقی تعلیم سے روشناس کرایا ہے وہ غرور اور تکبر، نیز شیخی خوری اور بڑائی کے بول بولنے سے پرہیز ہے۔ سب سے پہلے تو اس نظم کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ مقابلہ دو ایسی چیزوں کے درمیان کیا ہے جسے ایک بچہ بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ گلہری بمقابلہ پہاڑ ـــــ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں پہاڑ کی بلندی اور اس کا حجم، نیز زمین میں نہایت مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا ازخود ایسی صفات ہیں کہ ایک انسان (بلا لحاظ عمر، عقل) اس سے ہیبت زدہ ہو جاتا ہے۔ دوسری جانب ایک ایسی مخلوق جو اپنے وجود کے چھوٹے پن اور معصومیت کے لحاظ سے دل کو بھانے والی ہے۔ ان دونوں کے درمیان مکالمے کا آغاز پہلے پانچ اشعار میں پہاڑ کی تعلی اور غرور کی ایک انتہائی مثال ہے۔ اگرچہ پہاڑ نے اپنی جن صفات کا ذکر کیا ہے، وہ ازخود غلط نہیں، تاہم اس نے

اپنے مخاطب (گلہری) کے وجود اور کمزوری کی بناء پر جب اپنی ان صفات کا ذکر کیا تو یہ غرور اور تعلی کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان الفاظ سے گلہری کے بارے میں اس کی نفرت اور کمزوری کا کس قدر بھر پور اظہار ہوتا ہے، وہ اس شعر سے واضح ہے:

جو بات مجھ میں ہے، تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں! جانور غریب کہاں

اس کے برعکس گلہری جیسی چھوٹی اور نرم و نازک مخلوق کے، جسے اللہ تعالیٰ نے صحیح فہم و ادراک سے نوازا تھا، جوابات پڑھنے ہی سے ایک انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ گلہری نے اپنی ایک دلیل سے پہاڑ کی شیخی اور تعلی کے غبارے سے ہوا نکال دی کہ

کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے

پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی صناعی کے اس پہلو کی جانب توجہ دلاتے ہوئے پہاڑ کے غرور کو مٹی میں ملا دیا کہ:

قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں

اس شعر میں پہاڑ کی اس بڑائی کو ایک کمزور ثابت کر کے گلہری نے ایک اور سبق دیا کہ:

جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیہ ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

یہ ایک ایسا بدیہی چیلنج تھا جس کا جواب کسی بھی مغرور انسان کو کبھی بھی نہیں سوجھ سکتا۔ اس طریق پر پہاڑ کے اس بڑائی کے زعم کو باطل ثابت کرنے کے بعد شاعر نے گلہری کی زبان سے وہ سبق ادا کر دیا جو قیامت تک انسانوں کے لیے راہ نما اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور یوں یہ امر اوائل عمر ہی سے بچوں کے ذہن میں راسخ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کوئی چیز بیکار پیدا نہیں کی:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں!

گزشتہ صفحات میں نوجوان نسل میں پائے جانے والی بے شمار اخلاقی کمزوریوں اور سوسائٹی میں بہت بڑے پیمانے پر موجودہ کمزوریوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے وطن عزیز کے باسیوں میں اس قدر عظیم تفاوت اور خلیج پیدا کر دی ہے کہ ایک طرف طبقۂ امرا کے کتوں کو ملنے والا پروٹوکول (دیکھ بھال، نگہداشت اور خوراک و رہائش) دیکھیے جب کہ دوسری جانب تاریک محلوں کی گنجان آبادیوں کو جہاں نہ پینے کے لیے صاف پانی ملتا ہے اور نہ ان کے بچوں کو خوراک جیسی بنیادی اشیاء دستیاب ہیں!

امیر اور غریب طبقوں کے درمیان اس تفاوت میں گزشتہ ۴۰،۵۰ سالوں میں اس قدر تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے کہ جسے کسی بھی ذریعے (رشوت، بلیک مارکیٹنگ، ذخیرہ اندوزی، منشیات کی فروخت وغیرہ سے) دولت ہاتھ آ گئی وہ پہاڑ کی طرح اپنی بڑائی کے غرور میں مبتلا ہو گیا۔ آج ضرورت ہے سکولوں میں دوبارہ اس طرح کے تعلیمی اور تربیتی خیالات و افکار کی بہت بڑے پیمانے پر تشریح و اشاعت کی جائے اور صباحی خطاب، (اسکول اسمبلی) نیز اس قسم کی دیگر غیر نصابی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے تا کہ نوجوان نسل بڑے ہو کر کسی قسم کے بے جا غرور میں مبتلا نہ ہو۔

۴۔ **ہمدردی:** بانگ درا میں بچوں کی نظم ''ہمدردی''، ولیم کوپر نامی ایک شاعر کے کلام سے ماخوذ ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال کا مقصد بچوں کو اوائل عمر ہی سے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی، محبت اور دکھ درد بٹانے کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور اسی لیے اس کا عنوان بھی انہوں نے ''ہمدردی'' تجویز کیا ہے۔ معصوم بچوں کے دل میں پرندوں کے لیے (بالخصوص بلبل میں جو اپنی جسمانی نزاکت، رنگین پروں اور سریلی آواز کی وجہ سے) ہمیشہ ہی سے ایک جذبۂ محبت پایا جاتا ہے، شاعر نے اس کی حالت زار کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ وہ تمام دن دانہ چگنے میں اس قدر مصروف رہی کہ رات کا اندھیرا ہو گیا اور وہ تھک کر ایک درخت کی ٹہنی پر اداس و غمگین بیٹھ جاتی ہے اور اپنی درد بھری آواز میں کہتی ہے کہ:

پہنچوں کس طرح آشیاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

بلبل کی اس درد بھری پکار کو سن کر پاس سے ایک جگنو نے (جو ہمیشہ معصوم بچوں کی توجہ اس وقت اپنی جانب مبذول کرا لیتا ہے جب رات کے اندھیرے میں وہ باغ / کھیتوں میں چمکتا ہے) بلبل کی ڈھارس بندھائی کہ اگرچہ میں ایک ذرا سا کیڑا ہوں لیکن تمہاری مدد کو حاضر ہوں، اور کہا:

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہمدردی کے ان بولوں میں ایک سبق پنہاں ہے، جس سے معصوم بچے اپنی زندگی میں جو پیغام اور جذبۂ تحریک (Inspiration) حاصل کرتے ہیں، اس کا اظہار علامہ نے نظم کے آخری شعر میں جس طریق پر ادا کیا وہ نہ صرف اسلامی اخلاقی تعلیمات کا ایک ایسا بیش بہا خزانہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے نہ صرف قرآن کریم میں حکم دیا ہے بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کی تمام تر زندگی عملی طور پر اس کا ایک ایسا نمونہ تھی جس کی پیروی کرنے سے دنیا کے تمام انسانوں میں بھلائی، محبت اور ہمدردی کے جذبات فراواں پیدا ہو سکتے ہیں اور دنیا میں جنگ وجدل اور دوسرے لوگوں کی حقوق تلفی کا جو طوفان عظیم برپا ہے وہ یکسر ناپید ہو سکتا ہے۔ دیکھئے وہ کیسے میٹھے مگر سبق آموز بول ہیں!

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے!

یہاں اس جانب اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں اکثر رات کے اندھیرے کو جہالت اور جگنو کی روشنی کو تعلیم سے تشبیہ دی ہے اور یوں بچوں کو بڑے ہو کر اس داعیانہ کردار کو ادا کرنے کی جانب توجہ دلائی ہے جو اسلام نے امت مسلمہ پر عائد کیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ

الْمُنْكَرِ (آل عمران:۱۱۰)

''تم وہ امت خیر ہو جسے دنیا میں اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی تاکید کی گئی ہے۔''

۶۔ایک پرندہ اور جگنو: بانگ درا ہی میں بچوں کے لیے ایک اور نظم ''ایک پرندہ اور جگنو'' کے عنوان سے ہے۔اس میں بھی اقبال نے ہمدردی اور محبت کے حوالے سے بچوں کو یہ امر ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات میں طرح طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں۔ان ذی حیات زمینی مخلوقات میں ہاتھی اور جگنو میں جسمانی لحاظ سے اس قدر عظیم فرق ہے کہ دونوں کا مقابلہ کرنا ہی ایک مضحکہ خیز امر ہے۔اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کے لیے رحیم اور کریم ہیں اور نہیں چاہتے کہ کسی پر بھی کوئی ظلم/ زیادتی روا رکھی جائے۔اس نظم میں جگنو کو دیکھ کر پرندے نے چاہا کہ اسے کھالے،لیکن اس سے پہلے کہ وہ پرندہ جگنو کو اپنی چونچ سے پکڑتا،جگنو نے پرندے کو یاد دلایا کہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے تو اپنی چونچ مت کھول، کیونکہ ہم دونوں ایک ہی خالق کی بنائی ہوئی مخلوق ہیں۔جگنو نے نہایت ہی عقل مندی کے ساتھ پرندے پر واضح کیا کہ جس اللہ نے تجھے چہکنے کی صدائے دلربا دی، تجھے گانا سکھایا، اسی اللہ نے میرے پروں میں چمک رکھ دی اور مجھے باغ میں ایک مشعل کے طور پر پیدا کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کی صناعی کے ان دونوں پہلوؤں کی وضاحت کے بعد، جو ان دونوں مخلوقات میں پائی جاتی ہیں،علامہ نے جگنو کی زبان سے بچوں کو یہ سبق ذہن نشین کرایا کہ چمک اور آواز کی چہک کی حیثیت،سوز اور ساز کی سی ہے،اور دنیا میں ساز کے ساتھ سوز کا ہونا بہت ضروری ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔اور یہ کہ دنیا میں انسانی زندگی کا قیام اور وجود، پستی اور بزرگی/ بڑائی، دونوں صفات کے باہم رشتہ استوار رکھنے سے ہے،اوراس ساری گفتگو کا حاصل یوں بیان کیا کہ:

ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستان کی!

اب دیکھئے اس نظم میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا تصور بطور خالق، مالک اور آقا کے دیا گیا۔ تمام مخلوقات ارضی وسماوی کو مخلوق خدا بتایا گیا، مخلوق ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے لیے ہر دو کی ہستی کو ایک دوسرے کے لیے ناگزیر بتایا گیا اور یوں ایک دوسرے پر ظلم و ستم روا رکھنا، زیادتی کرنے، حقوق تلفی اور اسی قسم کے رذائل سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے محبت وآشتی کا جو سبق آخری شعر میں دیا گیا، اس قسم کی تعلیمات کو اگر بچوں کو ابتدائی دنوں میں ذہن نشین کرا دیا جائے تو کیا پشاور میں دسمبر ۲۰۱۴ء میں ایک اسکول میں واقع ہونے والا سانحۂ عظیم وقوع پذیر ہوسکتا تھا؟ اور مزید یہ کہ مدرسوں اور مسجدوں، نیز انسانوں کی آبادیوں پر حملہ کرنے والے ڈرون حملوں کے ذمہ دار، اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیماتِ محبت اور بھائی چارہ سے آگاہ ہوتے یا ان کے ماننے والے ہوتے اور اگر ان لوگوں کو بھی بچپن میں اسکولوں/ کالجوں میں تعلیماتِ عیسوی علیہ السلام سے آگاہ کیا ہوتا تو پھر کیا وہ اس قسم کی ظالمانہ حرکتوں کا ارتکاب کرتے؟ ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ دیکھئے علامہ نے کس بات کی ہمیں دعوت دی ہے:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیان ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہاں پھر جگنو سے مراد تعلیم اور پرندے سے مراد انسان کا وہ جذبۂ ہوس اور لالچ ہے جو چاہتا ہے کہ دنیا کی ہر شے کو نیست و نابود کر دے اور اسے اپنا تابع بنا لے۔ یہاں ہم علامہ اقبال کا ایک فارسی شعر نقل کریں گے جس کے یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کا یہ اصل الاصول ہے کہ دنیا میں کوئی بھی کسی دوسرے شخص (قوم/ ملک وغیرہ) کا محتاج نہ رہے۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس
نکتۂ شرعِ مبیں ایں است و بس!

انسانی معاشروں میں امن و امان، سکون، آشتی اور محبت کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کو (قطع نظر اس سے کہ انکا تعلق کسی بھی خطۂ زمین سے ہو) بچپن ہی سے دینی تعلیمات کے تحت یہ بتایا جائے کہ اس سرزمین پر رہنے کا حق ہر فرد انسانی اور دیگر

مخلوقات کو حاصل ہے۔ کسی کا بھی کسی دوسرے پر ظلم وستم روا رکھنا دینی، اخلاقی اور قانونی طور پر جائز نہیں۔

یاد رہے کہ بچوں کی اخلاقی تربیت کے بارے میں اس نظم اور دیگر اسی قسم کی دوسری نظموں کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے تاہم یہاں مختصراً اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔

۷۔ ترانۂ ملی: اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس قسم کا بنایا ہے کہ عمر کے ساتھ اس میں ذہنی ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ تعلیم وتجربہ اور مشاہدے کی بنیاد پر اس کی سوچ میں نکھار آتا جاتا ہے۔ ایک زمانے (۱۹۰۴) میں علامہ نے ایک نظم ترانہ ہندی لکھی جس میں ہندوستان کا باشندہ ہونے کی بنا پر وطن کی تعریف کی، تاہم (۱۹۱۳)، میں حالات کے بدلنے اور ہندوستان میں آزادی کی تحریک کے جڑ پکڑنے اور اس کے نتیجے میں ایک علیحدہ وطن کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہونے پر انہوں نے اسلام کے آفاقی نقطۂ نظر کی وضاحت ایک دوسری نظم ترانۂ ملی میں کی۔ یہ نظم بھی ان چند نظموں سے ہے جو مختلف اسکولوں میں صباحی خطاب کے دوران میں پڑھی جاتی تھیں۔ اس نظم میں جن اخلاقی تعلیمات کا سبق دیا گیا ہے وہ اگر ایک دفعہ بچوں کے ذہن نشین ہو جائیں تو پھر ان کے مضمرات سے وہ عمر بھر بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں، جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

☆ ......بحیثیت مسلمان، تمام جہاں ہمارا وطن ہے۔

☆ ......اللہ کی توحید پر ایمان رکھنے والی قوم/ امت تا قیامت زندہ وتابندہ قائم رہے گی۔

☆ ......کعبہ جو کسی زمانے میں ایک بت کدہ بنا دیا گیا تھا، اللہ کے رسول ﷺ نے اسے ان بتوں سے پاک کر کے امت مسلمہ کو اس کی پاسبانی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

☆ ......امت کے شاندار ماضی کی یاد دلاتے ہوئے بچوں کو بتایا گیا ہے کہ ایک زمانے میں توحید کا جھنڈا لے کر مسلمانوں نے کل عالم پر حکومت کی ہے۔

☆ ......اس ضمن میں اندلس، سپین پر مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کا حوالہ دیا گیا ہے۔

☆ ......بغداد کا شہر جو دریائے دجلہ کے کنارے تھا، وہاں پر بھی مسلمانوں نے حکومت کی تھی۔

☆ ......آخری دو اشعار میں وطن کی حرمت وعظمت کی خاطر جان کی بازی لگا دینے کے عزم

ویقین کا اعادہ ہے۔

☆......آخری شعر تو اس نظم کا کلائمکس ہے جس میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ اپنی محبت اور عقیدت کے ساتھ ساتھ انہیں اپنی زندگی میں بطور اسوۂ حسنہ اپنانے کا سبق ہے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ گزشتہ ۴، ۵ دہائیوں میں ہم نے اپنی نسل نو کے ساتھ کس قدر ظلم وزیادتی روا رکھی کہ درج بالا اخلاقی تعلیمات سے جو اسلام نے ہمیں سکھائی تھیں، انہیں تعلیم کے ذریعے بہرہ مند نہیں ہونے دیا گیا۔ ایسے عالم میں اگر ان کے اخلاق و کردار میں جو بھی جھول اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں، ان سب کے ذمہ دار وہ صاحبان اقتدار ٹھہرائے جائیں گے جن کے ہاتھوں میں اس ملک کا اقتدار تھا۔ چونکہ یہ وہ نسل تھی جس نے از خود تعلیم تربیت لارڈ میکالے کے بنائے ہوئے نظامِ تعلیم کے تحت حاصل کی تھی اس لیے ان کے بارے میں گزشتہ صفحات میں مشاہیر اہل علم نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ نہایت مناسب اور بجا ہے!

نوجوانوں کے لیے کہی گئی نظمیں

اگرچہ علامہ اقبال کے کلام میں نوجوان نسل کی تعلیم نیز اخلاقی تربیت کے بارے میں بہت ہی تفصیل کے ساتھ راہنمائی ملتی ہے، جس کا احاطہ کرنا ایک مقالے میں ممکن نہیں، تاہم اب ہم ان کی چند ایسی نظموں کے بارے میں اظہار خیال کریں گے جو ہماری اپنی ایک سرسری تقسیم کے لحاظ سے کسی قدر بڑی عمر کے بچوں (نویں، دسویں یا انٹرمیڈیٹ) کی ذہنی نشوونما اور فہم و فراست کا خیال کرتے ہوئے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ گزشتہ صفحات میں درج ان نظموں میں سے، ہم نے درج ذیل چند نظموں کو منتخب کیا ہے:

ا۔ بلالؓ: ہائی سکول اور کالج کے ابتدائی درجے (انٹرمیڈیٹ) کے بچوں کے لیے مختلف نظموں میں سے ہم نے بلالؓ نامی نظم کا انتخاب اس بنا پر کیا ہے کہ بلالؓ نے جب اسلام قبول کیا تو وہ جوان تھے۔ اسلام کی حقانیت پر ایمان لانے کے بعد وہ اپنے ایمان پر قائم رہے باوجود اس حقیقت کے کہ ان پر جو ظلم وستم روا رکھا گیا وہ اگر ہاتھی پر بھی کیا جاتا تو وہ جنگلوں میں بھاگ جاتا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں غلامی سے آزاد کرایا اور پھر وہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے منظورِ نظر ہوئے کہ نہ صرف مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مؤذن مقرر ہوئے اور یہ فریضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک نبھاتے رہے بلکہ فتح مکہ پر کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دینے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ قبولیت اسلام اور ان مناقب کی بناء پر عمر فاروقؓ (خلیفۂ دوم) انہیں ''سیدنا بلال'' ہمارے سردار بلالؓ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

یہاں ہم اس امر کی جانب بھی اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ عرب جیسے ملک میں کسی غلام اور وہ بھی ایک حبشی کے لیے جذباتِ حقارت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ غلاموں کو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ ہر قسم کا ظلم وستم روا رکھنا گویا اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کو اسلام قبول کرنے پر جو مقام ملا اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز دیگر صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک جو عزت ووقار حاصل ہے، وہ اسلام کی تعلیمات کا ایک ایسا سنہرا باب ہے جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ اس طریق پر اقبال نے بچپن ہی سے اس امر کا سبق دیا کہ رنگ ونسل، ذات پات، وطن اور زبانوں کے اختلافات کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایک حبشی غلام، اسلام قبول کرنے کے بعد اگر محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محبوب بن سکتا ہے تو پھر فی زمانہ پایا جانا والا مسلم سوسائٹی میں ذات پات کا تصور، کسی صورت بھی اسلام کی آفاقی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا، بلکہ یہ تو وہ ہندوانہ تصور ہے جس کی چھوت مسلمانوں کو بھی لگ گئی کہ وہ ایک ہزار سال تک ہندوؤں پر اگرچہ حکمرانی تو کرتے رہے لیکن نہ صرف یہ کہ وہ ہندوؤں کو متاثر نہ کر سکے، بلکہ الٹا ان سے ذات پات کا خالص کافرانہ سبق سیکھ لیا۔ یہاں ہم ''بلال'' نامی ایک کتاب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو سیدنا بلالؓ کی سیرت پر ریڈیو پاکستان کے ایک سابق ڈائریکٹر جنرل (سلیم گیلانی) نے ایمان وایقان اور ایسے محبت بھرے جذبات والفاظ کے ساتھ لکھی ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔

علامہ اقبال نے نظم کا آغاز ہی جذبات کو ابھارنے والے اس شعر سے کیا ہے کہ:

چمک اٹھا جو ستارہ تیرے مقدر کا
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا

اور پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لانے کی سعادت سے اس طرح بہرہ مند ہوا

کہ تو نے اس ظلم وستم کی پر کاہ بھی پروانہ کی جو تجھ پر ڈھایا گیا۔توحید پر ایمان اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت وعقیدت کا یہ وہ سبق ہے جونوجوان نسل کواقبال دینا چاہتے ہیں۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کا مسکن حیات حتیٰ کہ ابدالآباد تک جائے آرام کا شرف مدینہ کوحاصل ہوا۔ بلالؓ کی نظر میں مدینہ کی یہ کیفیت تھی گویا وہ ان کی آنکھوں کا نور تھا اوران کے لیے اس کی حیثیت کوہ طورجیسی تھی جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کوکتاب الٰہی (تورات) عطا ہوئی تھی۔ مدینۃ الرسول ﷺ اوراللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ غایت محبت کا یہ حال تھا کہ حضور ﷺ کو دیکھ دیکھ کر وہ جیتے تھے اور جب بھی پانچ اوقات میں اذان دیتے جس وقت اشہدان محمد رسول اللہ زبان حال سے پکارتے تو رسول اللہ کی جانب اشارہ کرتے۔ حضور ﷺ کی رحلت کے جب وہ محبوب ﷺ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو پھرا داس رہنے لگے اوراذان نہ دینے کا عہد کرلیا کہ اب وہ ہستی نظر سے اوجھل ہوگئی تھی جس کو دیکھ کر اس کی جانب اشارہ فرماتے تھے۔ دیکھئے اقبال نے اس کی منظر کشی کس خوبصورت اوراچھوتے انداز میں کی:

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا، نماز تھی تیری

اس شعر میں محبت رسول ﷺ کا جوسبق امت کےنوجوانوں کو دیا گیا ہے، دراصل یہ وہ پیغام ہے جسے حرزِجاں بنا لینا امت کے لیے دین ودنیا کی کامرانیوں کا سبب بن سکتا ہے۔

۲۔خطاب بہ جوانانِ اسلام: شیخ عبدالقادر نے، جوعلامہ اقبال کے بہت قریبی دوستوں میں تھےاور جنہوں نے کلیات اقبال کا دیباچہ بھی تحریر کیا، لکھا کہ

''فقط لاہور کی انجمن حمایت اسلام کوبعض وجوہ کے سبب یہ موقعہ ملا کہ اس کے سالانہ جلسوں میں کئی سال متواتر اقبال نے اپنی نظم سنائی جوخاص اسی جلسہ کے لیے لکھی جاتی تھی

اور جس کی فکر وہ پہلے سے کرتے تھے۔'' مزید لکھا کہ:

''لاہور میں جلسۂ حمایت اسلام میں جب نظم پڑھی جاتی ہے تو دس دس ہزار آدمی ایک وقت میں جمع ہوتے ہیں اور جب تک نظم پڑھی جائے، لوگ دم بخود بیٹھے رہتے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں وہ بھی محو اور جو نہیں سمجھتے وہ بھی محو ہوتے ہیں۔''اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۱ء میں کہی لیکن سب سے پہلے ۱۹۱۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی۔(میرا اقبال، ۲۰۰۸)

یہ نظم جب کہی گئی اس وقت جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کو نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ برطانوی راج کے تحت مسلمانانِ ہندوستان ایک ایسی کسمپرسی کی حالت سے گزر رہے تھے جس کا کسی قدر تفصیلاً ذکر ہم نے اپنی کتاب ''اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے فکر اقبال کی روشنی میں'' (۲۰۱۷ء) میں کیا ہے۔مسلمان نوجوان نسل کو ذہنی طور پر برطانوی راج کا حامی اور مددگار بنانے کے لیے ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' نامی کتاب میں لکھا:

''مسلمان لڑکوں کو ہمیں اپنے طریقے پر تعلیم دینی چاہیے۔ ان کے مذہب میں عدم مداخلت کے ساتھ بلکہ مذہبی فرائض کی پوری ادائیگی کے ساتھ، ہم ان کے مذہبی اخلاص اور دینی احکام کی پابندی میں ضعف اور کمزوری پیدا کریں۔۔۔ غلط مذہب کے نام پر جو بے رحمی وہ کرتے ہیں، جن جرائم کا ارتکاب وہ کرتے ہیں، یہ رواداری ان کو ان تمام باتوں سے رہائی دلا دے گی۔''

ان حالات میں علامہ اقبال نے مسلمان نوجوان کو یاد دلایا کہ تم اپنے ماضی کی تاریخ پر نظر ڈالو کہ تمہارے آباء کیا تھے۔ اقبال نے ان کی صفاتِ عالیہ (جہاں بانی، جہانگیری اور جہاں آرائی) کا ذکر کرتے ہوئے انہیں یاد دلایا کہ انہوں نے یہ صفات اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لانے کے بعد مسلسل محنت اور جفا کشی سے علم حاصل کر کے اپنے اندر پیدا کی تھیں، وگرنہ اس سے پہلے تو وہ شتر بانوں کا ایک گروہ تھے۔تم نے اس میراث کو گنوا دیا جو ان سے تمہیں حاصل ہوئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آسمان نے

تمہیں اوج ثریا سے زمین پر پٹخ کر دے مارا۔آخری شعر میں نوجوان نسل کو حصول علم کی دعوت اسی انداز میں دی کہ یورپ کی لائبریریوں میں تمہارے آباء واجداد کی کتب کو دیکھ کر ایک انسان حیران رہ جاتا ہے!

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!

۳۔ دعا: بانگ درا میں شامل یہ نظم بھی اقبال نے ۱۹۱۱ء میں کہی، درج بالا صفحات میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ برصغیر میں امت مسلمہ ان دنوں ایک بہت ہی پریشان کن صورت حال سے گزر رہی تھی، یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال جیسے حساس دل رکھنے والے اور امت مسلمہ کی حالت زار پر دن رات غور وفکر کرنے والے کے قلم سے متعدد ایسی نظمیں حیطۂ تحریر میں آئیں جن میں امت کی نوجوان نسل کو ماضی اور حال پر غور وفکر کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ نظم بھی درج بالا نظم کی پیروی میں ''دعا'' کے عنوان سے کہی گئی۔

اس نظم کا بنیادی تصور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مسلمانوں کے دل محبت سے بھر دے اور انہیں اسی مقصد کی بحالی کے لیے کام کرنے کی توفیق دے جسے لے کر دنیا میں اللہ کا آخری رسول ﷺ مبعوث ہوا تھا اور جس کی خاطر انہوں نے مکی زندگی کے ۱۳ سالوں میں کون سی اذیت تھی جو برداشت نہ کی۔فضول اعتراضات، طعن وتشنیع کا تو ذکر ہی کیا، شعب ابی طالب میں اپنے تمام خاندان کے ہمراہ بھوک وتنگی کی اس حالت سے بھی دوچار ہوئے کہ چمڑہ تک کھانے کی نوبت آئی اور بالآخر ہجرت کرنا پڑی۔آپ ﷺ نے یہ تمام تر تکالیف اور دکھ صرف اور صرف اس مقصد کے لیے برداشت کیے تھے کہ اللہ کا حکم اس دنیا میں سربلند ہو۔شاعر نے اس نظم میں امت کی نوجوان نسل کو زندہ تمنا، قلب کو گرمانے، روح کو تڑپانے اور دیدۂ بینا مانگنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ان تمام مقاصد کی روح اس شعر سے واضح ہوتی ہے کہ:

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے!

اور آخری بند میں اللہ تعالیٰ سے بے لوث محبت، صداقت اس انداز میں مانگنے کو کہا کہ:

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

یاد رہے کہ اس دعا کو مانگنے کے نصف صدی سے کم مدت میں داتا یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے امت کو ایک علیحدہ وطن عطا فرمایا لیکن حالات کا تقاضا ہے کہ ابھی بھی اس دعا کو مانگتے رہنا چاہیے کہ یہ بھٹکا ہوا آہو، سوئے حرم چل پڑے۔

۴۔ طارق کی دعا: علامہ اقبال نے اپنی زندگی میں متعدد سفر کیے۔ انگلستان اور جرمنی حصول تعلیم کے لیے، افغانستان، ایک تعلیمی دورے پر اور ۱۹۳۳ء میں ہسپانیہ (اسپین) کا دورہ کیا۔ انہوں نے اپنے ان مختلف سفروں کے دوران میں اپنے اوپر وارد ہونے والی کیفیات کا ذکر اشعار کی صورت میں کیا۔

طارق کی دعا بھی ایک ایسی نظم ہے جو اسپین کے دورے کے دوران میں کہی گئی۔ یاد رہے کہ طارق بن زیاد نے ۷۱۱ء میں اسپین پر حملہ کیا تھا اور جبرالٹر کے مقام پر اپنے بادبانی بیڑے سے ساحل سمندر پر اترتے ہی تمام کشتیوں کو جلانے کا حکم دیا تھا۔ دیگر مسلمان افسروں نے اس کی وجہ پوچھی تو طارق نے اپنی تلوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ یہ اس لیے تاکہ واپس جانے کا کوئی امکان نہ رہے، اور اسلامی فوج فتح کو اپنا مقصود سمجھ کر بے جگری سے لڑے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ مسلمانوں نے رفتہ رفتہ تمام اسپین (ہسپانیہ) فتح کر لیا اور وہاں آٹھ سو سال تک حکومت کی۔ تاریخ انسانیت میں یہ دور سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے کیونکہ اس وقت تمام یورپ جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مسلم اہل علم نے انہیں علم و ہنر سے آشنا کیا جو بعد میں یورپ (انگلستان) میں تحریک احیائے علوم (Renaissance) کی بنیاد بنی۔

علامہ اقبال نے طارق بن زیاد کے درج بالا (کشتیوں کو جلانے) کے واقعے کو فارسی نظم میں یوں کہا:

طارق چوں بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہے خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید، دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر مُلک مِلک ماست، کہ مِلک خدائے ماست!

''طارق بن زیاد نے جب ساحل اندلس پر اپنی کشتیوں کو جلانے کا حکم دیا اس پر اس کے ساتھی لوگوں نے کہا اہل علم کی نظر میں یہ امر غلط ہے۔ ہم اپنے وطن سے بہت دور ہیں، ایسے عالم میں از روئے شریعت ترکِ اسباب مناسب نہیں۔ یہ سن کر وہ ہنس پڑا اور اپنے ہاتھ میں تلوار لے کر کہا کہ ''اللہ تعالیٰ کی ملک (ملکیت) ہماری ملکیت ہے کیونکہ امت مسلمہ ہی کے لئے خدا کی ملکیت بنائی گئی ہے!''

اس نظم میں مسلمان نوجوان نسل کو اس فتح عظیم کے بارے میں آگاہ کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ تمہارے آباء اس قدر بہادر اور جری تھے کہ ان کے سامنے پہاڑ، رائی کے دانے کے برابر ہو جاتے تھے۔ یہ جرأت ان میں اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد، اللہ کے دین کی سربلندی اور مظلوموں کی مدد بنا لیا تھا اور جب ایک مسلمان، خوشنودی رب کے لیے جان کی بازی لگانے کو تیار ہو جاتا ہے تو پھر اس کے سامنے صحرا اور دریا وسمندر اور دشمن کی فوجوں کی تعداد کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ جب مسلمان اس حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے تو پھر اس پیغام کو جسے اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی تئیس سالہ نبوی زندگی میں عام کیا تھا، دنیا میں نافذ اور جاری وساری کرنے کے لیے نہ صرف مال کی قربانی دیتا ہے بلکہ اس راہ میں شہید بھی ہو جاتا ہے اور اس شہادت حق کی ادائیگی میں اس کا مطمح نظر اور مقصود مالِ غنیمت، کشور کشائی یا کسی دنیاوی مفاد کا حصول نہیں ہوتا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اس نظم کا اختتام جس شعر پر ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے اس امر کی طلب ہے کہ مسلم نوجوان کے دلوں میں ترویج واشاعت اسلام کا مقصد وحید پیدا کر دے اور مسلمان کو ایک ایسے اخلاقِ حسنہ سے منور کر دے کہ لوگ اس کے حسن اخلاق سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔

حوالہ جات

(الف) اردو:

ابوالحسن (سید)	2021	سقوط ڈھاکہ کی حقیقت اسلامک پبلی کیشنز، لاہور
ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید	1982	تعلیمات، اسلامک پبلی کیشنز لاہور
ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید	1982	پردہ، اسلامک پبلی کیشنز لاہور
ابوالاعلیٰ مودودیؒ سید	1982	تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور
اشتیاق احمد	2017	مقالہ شائع شدہ The Educationist November 2017. ww.Educationist.com.pk
اشتیاق احمد		''تعلیم''، تہذیب اور قومی زبان کا قتل عام۔ وزیر اعلیٰ کا پروگرام برائے تعلیمی اصلاحات یا نصابی دہشت گردی ادارہ تحقیق و تخلیق خانیوال پاکستان
انصار عباسی	2012	مقالہ ''ہماری غلامانہ ذہنیت اور بے حیائی'' عالمی ترجمان القرآن جلد ۲ عدد ۷
انیس احمد (پروفیسر/ڈاکٹر)	2012ء	مقالہ ''جنسی موضوعات پر قرآن وسنت کا اسلوب'' ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن جلد 2: ستمبر
انیس احمد (پروفیسر/ڈاکٹر)	2017ء	انتہا پسندی، تعلیم یافتہ نوجوان اور ہمارا مستقبل ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن جلد۔ ۴ جون
پطرس بخاری		مضامین پطرس۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد

تہمینہ درانی		مینڈ اسائیں۔کلاسیک لاہور
حق حقی (ڈاکٹر)		کوڑھ کی کاشت۔شفیق پبلی کیشنز لاہور
حافظ حسن مدنی (ڈاکٹر)	2019	دینی مدارس: حکومتی پالیسی اور مطالبے ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن۔ستمبر
خالد سیف اللہ	2012	برصغیر پاک و ہند میں یکساں نظامِ تعلیم کی ترویج کی کاوشیں، ایک تنقیدی جائزہ مجلہ تعلیم و تحقیق جلد ۱ شمارہ ۲ (جولائی/اگست) اسلام آباد
خورشید احمد (پروفیسر)	1944	برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم مجلہ تعلیم کا مسئلہ۔کراچی
خالد رحمٰن، اے ڈی میکن	2009	پاکستان میں دینی تعلیم، منظر، پس منظر، پیش منظر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز۔اسلام آباد
ریاض احمد سعید	2013	مقالہ ’’سکولوں میں زبوں حالی‘‘ مجلہ سہ ماہی تعلیمی زاویے شمارہ ۳ جلد ۲۴ پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد
زبیر حسین شیخ (مولف)	2008ء	’’میرا اقبال، پانچ کتابوں کا سیٹ ایجوکیشنل ریسورس ڈیویلپمنٹ سنٹر کراچی
سلیم منصور خالد (مرتب)	2005ء	دینی مدارس میں تعلیم: کیفیت، مسائل امکانات انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز۔اسلام آباد
سلیم منصور خالد	2007ء	’’ہماری تعلیمی پالیسی‘‘ روزنامہ نوائے وقت سنڈے میگزین 11 مارچ 2007ء
سلیم منصور خالد مرتبین اور مسلم سجاد	1995ء	پاکستان میں یکساں نظامِ تعلیم خصوصی اشاعت شمارہ ۴، لاہور

سعید احمد ملک (ڈاکٹر)	2008ء	مقالہ نصاب تعلیم (قسط ۲) روزنامہ نوائے وقت نومبر 2008ء
شیخ عبدالقادر (بیرسٹریٹ لاء)	1995ء	دیباچہ ''کلیاتِ اقبال'' (اردو) غلام علی اینڈ سنز لاہور
شیخ محمد اکرم	1958ء	موجِ کوثر، فیروز سنز، لاہور
شاہ نواز فاروقی	2020ء	قرآن کی تعلیم اور سیکولر عناصر ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن۔ جلد ۱۰ عدد ۸
عبدالناصح الوان	1981ء	تربیت الاطفال فی الاسلام (عربی ایڈیشن) دارالسلام پبلشرز شام
عبدالقیوم (لیفٹیننٹ جنرل (ر)	2012ء	مقالہ ''مومن کا زیور حیا'' روزنامہ نوائے وقت 11 مئی راولپنڈی
عطاء الرحمن (ڈاکٹر)	2015ء	سہ ماہی رسالہ ''تعلیمی زاویے'' پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد
غلام اکبر خان	2011ء	مقالہ ''حملہ ہو چکا ہے'' روزنامہ نوائے وقت ۳ جنوری راولپنڈی
محمد سعید (حکیم)	2015ء	مقالہ ''تربیت و تعلیم'' مجلہ سہ ماہی ''تعلیمی زاویے'' شمارہ ۳ جلد ۲۶ پاکستان ایجوکیشنل فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد
محمد ابراہیم خالد (ڈاکٹر پروفیسر)	2013ء	مقالہ ''مارننگ اسمبلی'' مجلہ سہ ماہی ''تعلیمی زاویے'' شمارہ ۳۰ جلد ۲۴ پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد
محمد صلاح الدین	2012ء	نظامِ تعلیم۔ دورنگی کے اثرات مجلہ تعلیم و تحقیق، مرکز تعلیم و تحقیق، اسلام آباد
محمد امین (ڈاکٹر)	2012ء	تعلیمی ثنویت اور اس کے خاتمے کے طریق کار سہ ماہی مجلہ تعلیم و تحقیق جلد ۱ شمارہ ۲۔ مرکز تعلیم و تحقیق اسلام آباد

ملک محمد حسین (پروفیسر)	2020ء	یکساں نظامِ تعلیم اور حکومتی مضحکہ خیزی ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن۔جلد ۱۰، عدد ۷
محمد اقبال (علامہ/ڈاکٹر)	1995ء	نظم ”فروس میں ایک مکالمہ، بانگ درا۔کلیات اقبال سروسز کلب
محمد اظہار الحق	2008ء	کالم ”احمق“ روزنامہ نوائے وقت 13 نومبر 2008
محمد آفتاب خان (ڈاکٹر) اسماء آفتاب (ڈاکٹر)	2017ء	”اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے، فکر اقبال کی روشنی میں“ چھبیسویں بین الاقوامی ہسٹاریکل کانفرنس، یونیورسٹی آف پشاور۔اکتوبر۔ الفتح پبلی کیشنز راولپنڈی
محمد آفتاب خان (ڈاکٹر) اسماء آفتاب (ڈاکٹر)	2018ء	بچوں کی اخلاقی تربیت، کلام اقبال کی روشنی میں بشکریہ ماہنامہ ”دعوۃ“ جولائی تا دسمبر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد
محمد آفتاب خان (ڈاکٹر)	2013ء	مغربی تہذیب اور اخلاقی انحطاط ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن۔دسمبر
محمد آفتاب خان (ڈاکٹر)	2016ء	جنسی تعلیم: مسلم والدین کو درپیش مسائل اور انکا حل۔ ادبیات، اردو بازار، لاہور
محمد آفتاب خان (ڈاکٹر) اور امّ انس	2020ء	یہودیوں کے تاریخی جرائم (قرآن کے بیانیئے میں) فروغ فکر اقبال اردو بازار، لاہور
محمد آفتاب خان (ڈاکٹر) اور محمد احسن (ڈاکٹر)		جنسی تعلیم: قرآنی تعلیمات کے تناظر میں ادبیات، لاہور
مرزا محمد الیاس ۲۰۱۲ء		پاکستان کا تعلیمی منظر نامہ، ہفت روزہ ایشیا جلد ۶۱، شمارہ ۳، لاہور۔
محمد رضا کاظمی	2009	ترتیب وتعارف انتخاب کلام اردو ورثہ علامہ اقبال، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

محمود غازی ڈاکٹر (پروفیسر)	1990	محاضرات تعلیم۔دار العلوم والتحقیق۔ زوار اکیڈمی کراچی
محمود غازی (ڈاکٹر/ پروفیسر)	2006	''پاکستان میں دینی تعلیم۔پس منظر، پیش منظر، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد
مسعود عالم ندوی	1975ء	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک
منیب الرحمٰن (مفتی)	2020ء	اسلام پر براہ راست حملے، دستور اور معاشرہ ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن اگست
نعیم صدیقی	2021ء	تعلیم کا تہذیبی نظریہ اور ہم ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن جلد ۱۱ فروری
نامعلوم	1947ء	پاکستان تعلیمی کانفرنس کی کارروائی حکومت پاکستان کراچی (بحوالہ مقالہ سیف اللہ خالد 2012)
فرزانہ چیمہ	2009ء	ہمارے علامہ اقبالؒ، ادبیات، لاہور
ہارون الرشید تبسم (پروفیسر)	2018ء	اقبالیات بچوں کے لیے، مثال پبلشرز، فیصل آباد

B) English References:

Anon, 1999 A study commtssioned by the American Association of University Women; Wellesly colege center for Res.; how schools shortcoming girls.

Asma Aftab (Dr) 2018

Gilder, G.F. 1975 Sexual Suicide. Banton Books New York.

Khan, M.A. 2012 Sex & Sexuality in Islam. 2nd ed. Idara Matbuat-i-sulemani, Lahore.

Kumar, Deepak 2003 "India" TheCambridge History of Sceince (4) 18th ceabury sceince. edited by Roy Porter (cambridg Press, U.K. (Vide Urdu article of Dr. Ikram-ul-Haq)

Patrica Cayosexton 1969. The Feminized Male. White color & the Declne of Manliness. 125-72. Random House, New York.

Saad Ullah Khan (Brigadier R) 2021 From Easb Pakistan to Bangla Desh.

Wendy Kammier 1990 The Trbouble wih single sex school. The Atlantic monthly vol 81(4)22-36